بدن بازار
(طوائفیت کے موضوع پر منتخب افسانے)
قیصرہ قریشی
کتابی دنیا دہلی

بدن بازار

بدن بازار

قیصرہ قریشی

Badan Bazar

(Red Light Area)

(Short Stories)

by

Qaisara Qureshi

Year of Edition - 2004

ISBN:81-87666-78

Price Rs. 150/=

نام کتاب ---------------------- بدن بازار (افسانے)

مرتب ---------------------- قیصرہ قریشی

سال اشاعت ---------------------- 2004

قیمت ---------------------- ۱۵۰ روپے

طباعت ---------------------- کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی

Published

by:

KITABI DUNIYA

1955, Gali Nawab Mirza Mohalla Qabristan,

Turkman Gate, Delhi-6 (India)

Phone:23288452 Reliance Mob: 011- 35972589

E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com

"۔۔۔۔ پہلے فارغ البالی تھی' لوگ آرام پسند اور عیش پرست تھے۔ اُس زمانے کے ادب میں آپ کو بہت سی دماغی عیاشیاں نظر آ سکتی ہیں۔۔۔۔ اُس عہد کا قصہ نویس جنوں اور پریوں کی داستانیں لکھ کر نام پیدا کرتا تھا۔ آج کا افسانہ نویس ان مردوں اور عورتوں کی کہانیاں لکھتا ہے جو جنوں اور پریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔۔۔۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اِن ادیبوں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہبوطِ آدم سے لے کر اب تک ہر مرد کے اعصاب پر عورت سوار رہی ہے اور کیوں نہ رہے' مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیے۔ جب کبوتر' کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد' عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ عورتیں کبوتریوں سے کہیں زیادہ دلچسپ' خوبصورت اور فکر انگیز ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔ وہ لوگ جو جدید ادب کا' ترقی پسند ادب کا یا جو کچھ بھی یہ ہے' خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ یہ ہے کہ ان حالات کا خاتمہ کر دیا جائے جو اس ادب کے محرک ہیں۔۔۔۔"

(لذتِ سنگ)

اپنی بات

نام	:	قیصرہ قریشی
ولدیت	:	ضیاء اللہ قریشی
تاریخ پیدائش	:	۷ جولائی ۱۹۷۷ء
جائے پیدائش	:	لاہور
ابتدائی تعلیم	:	کیتھڈرل ہائی سکول' لاہور
گریجویشن	:	کنیئرڈ کالج' لاہور
ایم۔بی۔اے	:	کیمبرج' برطانیہ
مشاغل	:	سیر و سیاحت' فوٹوگرافی' مطالعہ
ملازمت	:	مارکیٹنگ مینجر (ملٹی نیشنل کمپنی)
تصنیف و تالیف	:	بدن بازار (منتخب افسانے)
	:	فرشتے کہاں گئے (ناول۔زیرِ طبع)

فہرست

آغا بابر

گلاب دین چٹھی رساں

پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ آج چٹھی رسانوں کے علاقے بدلے گئے تھے۔ چٹھی رساں گلاب دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

کرم الٰہی نے اکرام سے پوچھا "گلاب دین کی ماں کیوں مری ہوئی ہے۔؟"

"بھئی اس کی بدلی ہیرا منڈی ہوگئی ہے۔"

کرم الٰہی نے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا "سوں رب دی؟۔"

اکرام بولا "سوں رب دی" اور اس نے بھانڈ کی چپڑاس کی طرح اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر دے مارا۔ دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"اس کا کیا مطلب ہوا جی؟ رزق دینے والا تو خدا ہوتا ہے۔ مجھے خواہ نوکری کیوں نہ چھوڑنی پڑے میں تو بڑے صاحب کے پاس اپیل کروں گا۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ افسروں کو کچھ تو خیال کرنا چاہیے کہ کون سا علاقہ کس کو دینا چاہیے۔" گلاب دین اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

وہ پانچ وقت کا نمازی تھا۔ اپنے محلے میں تراویح کی نمازوں میں قرآن خوانی کا انتظام کرنا ہمیشہ اس کے ذمے ہوتا تھا۔ بازار میں معراج شریف کا چندہ اسی کے ایماء سے اکٹھا ہوتا اور اسی کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ میلادالنبی کے موقعے پر محلے کے لڑکے بالے اس کی ہدایت کے مطابق خوبصورت محراب نما دروازے بناتے اور جھنڈیاں لگاتے تھے۔ مسجد کے باقاعدہ نمازیوں میں اس کا شمار تھا۔ دین دار لوگوں کی صحبت سے مسئلے مسائل سے بھی خاصی آگاہی ہو چکی تھی۔ فرض شناسی اور ایمان داری کی بنا پر اپنے پرائے بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آج اس کی عزت کا دم گھٹ رہا تھا۔ ہیرا منڈی میں خط بانٹنے جائے گا' طوائفوں کے کوٹھوں پر چڑھ کر آواز دے گا' بی بی جی خط آیا۔ غلیظ گلیوں میں جا کر پیشہ وروں کو ان کے یاروں کے خط دے گا' جو ہوس سے شروع ہو کر ہوس پر ختم ہوں گے' جن کا مضمون صرف بدکاری ہوگا۔ کسی خط میں ماں کی مامتا نہ ہوگی۔ کسی خط میں باپ کا پیار نہ ہوگا' ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی جگہ سنکھیا ہوگا اور باپ کی

نگاہوں میں بے غیرتی' بے شرمی' بے حیائی۔۔۔۔وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اگلے دن پوسٹ ماسٹر کہہ رہا تھا" گلاب دین کیوں پیش ہونا چاہتا ہے؟"

سپر وائزر بولا" آپ سے کوئی درخواست کرنا چاہتا ہے۔صرف دومنٹ کے لیے پیش ہونے کو کہہ رہا ہے۔"

"بلاؤ"

گلاب دین کا چہرہ بڑے صاحب کی پیشی میں زرد پڑ رہا تھا' دل بیٹھا جا رہا تھا' کترے ہوئے لب زیادہ موٹے دکھائی دے رہے تھے' داڑھی کے بال زیادہ گھنے نظر آ رہے تھے۔وہ شاید تازہ تازہ وضو کر کے دعا مانگ کر آیا تھا۔

"کیا بات ہے' گلاب دین؟"

"جی' میں صرف یہ عرض کرنے کو پیش ہوا ہوں کہ میری تبدیلی ہیرا منڈی کر دی گئی ہے۔۔۔۔"

"تو پھر"

"جی ذرا خیال فرمائیے' میں پانچ وقت کا نمازی پرہیز گار آدمی ہوں۔میری بڑی بے عزتی ہوگی۔"

اس نے درخواست نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے خاکی کوٹ کی جیب سے کالے دانوں کی تسبیح نکال کر بولا" حضور' جس ہاتھ سے یہ تسبیح پھیری جاتی ہے وہ بدکاری کے اڈوں میں جا کر پیشہ ور عورتوں کو خط تقسیم کرے گا؟ استغفر اللہ! مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ جناب! میری گزارش ہے کہ مجھے فیض باغ کا علاقہ دے دیا جائے یا مصری شاہ میں رہنے دیا جائے۔"

پوسٹ ماسٹر نے پیپر ویٹ کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا" تو تمہاری تبدیلی منسوخ کر دی جائے؟"

"آپ کے بچے جیتے رہیں۔یہی کمترین کا مطلب تھا۔"

"سردست یہ مشکل ہے۔غور کرنے کے لیے تمہاری عرضی رکھے لیتے ہیں مگر اس وقت تبدیلی منسوخ نہیں ہو سکتی۔"

گلاب دین کے سینے میں ایک تیر سا لگا۔

سراج اور گلاب دین' دونوں چٹھی رساں' پانی والے تالاب سے ہوتے ہوئے جب نوگزے کی قبر پر پہنچے تو سراج رک گیا۔اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ڈاک کو چھانٹا اور بولا" مولوی گلاب دین آ۔ادھر سے شروع کریں' وہ دائیں ہاتھ کو گھوم گیا۔" یہ پہلا چوبارہ فیروزاں کا ہے۔ادھر سب گانے والیاں رہتی ہیں۔"

پھاٹک کے سامنے چارپائی بچھائے تین چار آدمی بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔مکان کے پختہ تجاوز پر ایک عورت کندھے پر تولیہ ڈالے گیلے بالوں کو انگلیوں سے جھٹکے دے دے کر سکھا رہی تھی۔دوپٹہ نہ ہونے کی

وجہ سے گلاب دین کو وہ بہت بے شرم دکھائی دی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کا سینہ۔۔۔اس کا جی چاہا وہ آنکھیں بند کر لے۔اس نے اپنی پگڑی کا شملہ پکڑ کر ناک اور منہ چھپالیا۔

''کل سے میری جگہ یہ چٹھیاں تقسیم کیا کریں گے۔''

''ہیں!نیا چٹھی رساں لگ گیا؟''۔۔۔۔۔۔''جی ہاں''

لمبی لمبی مونچھوں والے نے تاش کے پتوں کو پٹاخ سے بند کرتے ہوئے پہلے سراج کو دیکھا' پھر گلاب دین کی طرف نگاہ پھرائی۔دیکھنے والے کی آنکھیں سرخ تھیں اور چارپائی کا کافی حصہ اس کے بھاری جثے نے گھیرا ہوا تھا۔اس نے گھٹنا اٹھا کر لٹھے کی چادر کو چڈوں میں دے لیا اور پھر آسودگی سے بیٹھ گیا۔اس کی پنڈلیوں پر منڈے ہوئے بالوں کا کھردرا غبار پھیلا ہوا تھا۔

''منشی ہوراں کا نام کیا ہے؟''نوجوان چھوکرے نے پوچھا۔

سراج نے جواب دیا''گلاب دین۔''

نوجوان چھوکرے نے ہنس کر کہا''رانجھا پھل گلاب دا میری جھولی ٹٹ پیا۔''

''وے شرم نہیں آتی تجھے؟ سلام دعا لینے کی بجائے مسخریاں کرنے لگا۔''تجاوز پر کھڑی ہوئی طوائف نے جھڑکا۔اس نے اپنا ایک پاؤں کٹھرے پر اٹھا کر رکھا تھا' جس سے اس کی وزنی رانوں کا اندازہ لگانے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔

''اوبی بی' اپنی شلوار جا کے سیو پہلے۔''

اس نے اپنا پاؤں کٹھرے سے نیچے رکھ لیا اور بولی''فٹے منہ' بے شرما''

مونچھوں والے نے ڈبیا اٹھا کر گلاب دین سے کہا''سگریٹ پیو' مولبی جی۔''

گلاب دین بولا''جی نہیں۔مہربانی۔''

سراج نے سگریٹ سلگا لیا اور سلام علیکم کر کے آگے چل دیا۔

''یہ مونچھوں والا کون ہے؟''

''اس گلی کا چودھری۔''

''اور لچر سا چھوکرا؟''

''یہ بلو کے چاچے کا لڑکا ہے۔یہ بلو ہی تو تھی۔ڈھولک کے گیت بہت اچھے گاتی ہے۔یہ نچلی بیٹھک بالاں کی ہے اور اوپر چوبارے میں گگ رہتی ہے''اس نے ہاتھ میں پکڑی ڈاک میں سے ایک لفافہ نکال کر گلاب دین کو دکھایا' جس پر سرنامہ لکھا تھا: مس سلطانہ عرف گگ۔وہ سیڑھیاں چڑھ کر گلیارے میں آ پہنچے۔

بیٹھک خالی پڑی تھی۔ دروازے پر موتیوں سے پروئی ہوئی لڑیاں آپ ہی آپ لرز رہی تھیں۔ سراج نے میلی میلی چاندنی پر خط پھینکتے ہوئے کہا " چٹھی لے لو جی۔" ایک ٹھگنی سی عورت نے آ کر خط اٹھا لیا۔

سراج بولا " بی بی جی، کل سے یہ چٹھی رساں چٹھیاں بانٹا کریں گے۔"

" اچھا منشی" اس نے بے دھیانی میں کہا اور اضطراب سے لفافے کو دیکھ کر یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی " گگ جی، چٹھی آئی ہے۔"

واپسی پر تاش کھیلنے والوں کے پاس سے گزرتے وقت گلاب دین نے اپنی خالی کالی نگاہیں ہوا میں ڈال دیں تاکہ وہ لچر سالڑ کا پھر مذاق سے کچھ کہہ نہ دے۔ مگر ان لوگوں نے دیکھا بھی نہیں کہ کون گزر گیا۔

بازار میں پہنچ کر گلاب دین نے ایک لمبا سا سانس لیا اور شملے کے سرے سے ماتھا پونچھا۔ سراج کہہ رہا تھا " یہ نکا پان والا ہے۔ یہ شہابے کی دکان ہے، شہابے کے پان ساری ہیرا منڈی میں مشہور ہیں۔ یہ اس کا شاگرد ہے، دن کو یہ بیٹھتا ہے۔ شہابا اس وقت سویا ہوا ہو گا، شام کو بیٹھے گا۔ پان سگریٹ کی دکانیں دلالی کے اڈے ہیں، مولوی جی۔"

اس وقت گلاب دین کو چپ لگی ہوئی تھی۔ وہ سراج کے یوں براہ راست خطاب پر چونک پڑا۔ بولا " خدا غارت کرے ان لوگوں کو۔"

" بازار میں یہ لوگ جو ہم کو اس وقت دکانوں پر بیٹھے نظر آ رہے ہیں، یہ طوائفوں کے ملازم ہیں۔"

ایک گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر سراج چٹھی رساں نے خطوں کو پھر چھانٹا " اس گلی میں پیشہ کمانے والی بیٹھتی ہیں۔" سراج نے بغیر کسی جذبے کے کورے گائیڈ کی طرح کہا اور گلاب دین کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس گلی میں سے سڑے ہوئے خربوزوں کی بو آ رہی تھی۔ گلاب دین نے شملے سے پھر اپنا منہ ڈھک لیا اور عاجزی سے بولا " اس گلی میں جانا ضروری ہے؟"

" صرف ایک خط ہے" ---------- " کس کا؟"

" کنجروں کے چودھری حاقو کا۔ اس گلی کی بہت کم چٹھیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی ہوتی ہے تو وہ چودھری کی یا کسی دلال کی ہوتی ہے۔"

چودھری کی خضاب لگی داڑھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک شخص اس کی پنڈلیاں سونت رہا تھا قریب ہی ایک تیل مالشیا بیٹھا تھا۔

" کدھر ماشٹر؟" اس نے چٹھی رساں کی طرف دیکھ کر کہا۔

" چودھریو! آپ کی یہ چٹھی تھی۔"

کسبیاں اپنی اپنی دہلیزوں پر لوہے کی کرسیاں رکھے بیٹھی تھیں۔ چہروں پر پھٹکار برس رہی تھی۔ گلاب دین نظریں نیچی کیے سراج کے ساتھ ساتھ گزر رہا تھا۔ اتنے میں کسی عورت کی آواز آئی "میاں مٹھو چوری کھائی ہے؟"

گلاب دین نے چور آنکھ سے دیکھا۔ ایک کسبی نے اپنے دروازے پر طوطے کا پنجرا لٹکا رکھا تھا۔ چٹھی رساں کو دیکھ کر بولی "منشی جی ہماری کوئی چٹھی نہیں آئی؟"

سراج نے جب نفی میں سر ہلایا تو بولی "ہائے! ہمیں کوئی چٹھی نہیں لکھتا۔"

دروزے کی چوکھٹ کے ساتھ دوپٹہ اتارے سینہ اکڑائے ایک عورت کھڑی تھی۔ بولی "یاراں پٹنی اب تجھے کون چٹھی لکھے گا۔ مر گئے تیرے سب یار چٹھیاں لکھنے والے۔"

یہ دونوں آگے نکل گئے۔ سراج نے کہا "طوطے والی عورت کا نام گلابو ہے۔ اس گلی کی ساری رونق اس کے دم سے ہے۔ بہت سے تماش بین اس گلی میں اسی کی خاطر آتے ہیں۔"

گلی آگے سے تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تماش بین جو چھدرے چھدرے دکھائی دیتے تھے اب ان کی وجہ سے راستہ رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلاب دین کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے کھلی سڑک پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا، پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے وقت اسے یاد آیا کہ اس نے تماش بینوں کے ریلے میں ایک داڑھی والے کو بھی دیکھا تھا جس کے ماتھے پر ہار لپٹا ہوا تھا اور پھر کنجروں کے چودھری کی خضاب رنگی بھرویں داڑھی اسے یاد آئی۔ وہ تھک چکا تھا اور اپنے کام سے بے زاری محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش! اس کی نون تیل کی دکان ہوتی، آرام سے بیٹھا دکان کرتا۔ اسے معلوم نہیں تانگوں کے اڈے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔ سینما کے قریب کا ماحول اسے کچھ مختلف لگا۔ اس کا جی چاہا سیڑھیوں پر بیٹھ کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہے تاکہ اس کے اعصاب پر سے کھچاؤ دور ہو جائے۔

سراج نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کیوں منشی جی، تھک گئے؟"

"نہیں تو" ۔۔۔۔۔۔۔ "بس یہ دو چٹھیاں اور بانٹنی ہیں۔" یہ کہہ کر سراج نے چار پانچ خط گلاب دین کو تھما دیے۔ گلاب دین کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے غلیظ خون سے بھرے لتے، کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھا کر اس کے باوضو ہاتھوں میں تھما دیے ہوں۔

اتنے میں سراج ایک مکان میں داخل ہو گیا۔ جس کی ڈیوڑھی بہت بڑی تھی اور جو خالی پڑی تھی۔ وہ بے دھڑک آگے صحن تک بڑھ گیا۔ صحن میں ایک طرف نواڑی پلنگ پر دو نوجوان لڑکیاں لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ سامنے لہسن کے چھلکوں کا ڈھیر لگا تھا۔ زمین پر چوکی بچھائے ایک چھوٹی سی لڑکی الگ بیٹھی لہسن

چھیل رہی تھی۔ سراج نے گلاب دین کے کان میں کہا' یہ بدرو اور قدرو کا مکان ہے اور گلاب دین کے ہاتھ میں تھمی ڈاک میں سے ایک خط جس پر بدر النساء کا نام لکھا تھا نکال لیا۔ ان کی آواز سن کر دونوں لڑکیوں نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

سراج بولا' 'خط آیا جی۔''

دونوں لڑکیاں بے تابی سے آگے بڑھیں۔ سراج نے خط دینے کے لیے گلاب دین کو آگے دھکیلا۔ یہ پہلا خط تھا جو گلاب دین نے دیا۔

بدر النساء خط کھول کر پڑھ رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں سے دو بھاری بھر کم آدمی داخل ہوئے۔ سراج بولا' 'لو استاد ہوری بھی آ گئے۔ منشی جی' استاد نور الدین کی چٹھی دیکھنا۔''

گلاب دین خط چھانٹنے لگا کہ بدر النساء خوشی سے چلائی' 'آپا کے کاکی ہوئی۔'' دونوں لڑکیاں بدر النساء کے پیچھے بھاگ گئیں۔

استاد نور الدین صحن میں کھڑا کہہ رہا تھا۔' 'او حیوانو! شیطانو! ہمیں چٹھی تو دکھاؤ۔''

برآمدے میں لگی چق کے پیچھے سے کسی معمر عورت کی آواز آئی' 'استاد جی' قمر کے کاکی ہوئی ہے۔''

''نصیبوں والی ہو۔ مبارکاں ہوں' اماں جی۔''

''آپ کو بھی ہوں۔ اری لڑکیو چٹھی رساں کا منہ میٹھا کر دو۔''

استاد بولا' 'ایک چٹھی رساں نہیں دو ہیں۔''

سراج مسکرا کر بولا' 'استاد جی' آپ بڑے جگتی ہیں۔ اپنا خط بھی لیا کہ نہیں؟''

گلاب دین نے نور الدین کو اس کا خط دے دیا جو محض اشارہ پانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دوسرا بھاری بھر کم آدمی بولا ''آج آپ۔۔۔۔''

سراج نے کہا' 'آج میرا آخری دن ہے۔ کل سے منشی گلاب دین چٹھیاں بانٹا کریں گے۔''

سراج کے ہاتھ میں قدرو نے آ کر دو روپے دے دیئے۔ استاد نے گلاب دین کی طرف دیکھ کر جگت کی' 'بڑی قسمتوں والے ہو۔ کنجروں کے گھر سے پہلے دن ہی بوہنی کر چلے ہو۔''

بدرو بولی' 'مسخریاں چھوڑو۔ استاد جی۔ باہر جا کے اب ہوروں کو دیکھو اور کہو' گھر مٹھائی کی ٹوکری لے کر آئیں۔''

بازار میں پہنچ کر سراج نے لوہے کے جنگلے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا' 'یہاں بیگماں رہتی ہے۔ وہ ساتھ والا مکان بھکو کا ہے۔ اس کے پیچھے وہ جو بیٹھک نظر آتی ہے وہ استاد نور الدین کی ہے۔ اسے

بدرنگے کی بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ دیکھنا تو ایک چٹھی مشتری کی بھی تھی۔"

گلاب دین نے ڈاک دیکھ کر کہا "ہاں"

"یہ گھر زہرہ و مشتری کا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ سامنے برآمدے میں ایک عورت چارپائی پر کروٹ لیے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے موٹے موٹے کولہوں پر سے قمیض ہٹی ہوئی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر بھی اس نے اس طرف نہ دیکھا' جیسے کوئی نشہ پی کر بے سدھ پڑی ہو۔

سراج نے کھانس کر کہا "چٹھی رساں آیا۔"

ساتھ والے کمرے سے ایک نازک سی دبلی پتلی لڑکی خط لینے کے لیے نکل آئی۔ سامنے والے کمرے میں دو سازندے بیٹھے ایک چھوٹی سی لڑکی کو سبق دے رہے تھے۔ جس نے ناک میں نتھنی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ کان کے پاس رکھے لمبی آواز میں کہتی جارہی تھی "آ" ---- اسی طرح پھر کہے جارہی تھی ------ "جا" ----

نئے بازار میں آ کر سراج نے دوبارہ گلاب دین کو ایک روپیہ دینے کی کوشش کی۔ دونوں روپے خود رکھ لینا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ اس نے ایک روپیہ زبردستی اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا اور بولا "بزرگو' یہ کوئی حرام کا پیسہ نہیں ہے۔ سمجھنے کی بات ہے۔ کسی کی جیب سے روپیہ نکال لینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ روپیہ کا تو یہی حساب کتاب ہے۔ آج یہ ہماری جیب میں' کل دوسرے کی جیب میں' پرسوں وہاں سے تیسرے کے پاس۔ کسی کے پاس کب ٹھہرتا ہے۔"

گلاب دین کو وہ نتھنی والی لڑکی یاد آ گئی جسے پہلے سبق یہی دیا جارہا تھا۔۔ آ ----- جا ---- پھر' آ ------ پھر' جا -------- "یہ اب کدھر کو؟" گلاب دین نے سراج کو اب ایک تیسری گلی میں گھستے ہوئے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"ہمیں کس بھڑوے کا ڈر ہے۔ منشی جی؟ ہم اپنی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس طرح تو آپ بھر پائے۔؟"

اس گلی میں کچے گوشت کی بساندھ آرہی تھی' جیسی بیف مارکیٹ سے آتی ہے۔ دو رویہ کرسیوں پر پیشہ ور عورتیں مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی بے باکانہ بیٹھی تھیں۔ ان کی باتیں بے ہودہ اور حرکتیں بڑی لچر تھیں۔ کچھ اوپر چوباروں پر بیٹھی تاک جھانک کر رہی تھیں۔

سراج بولا "یہاں سب درڑ مال ہے۔" نصف گلی میں پہنچ کر اس نے کہا "منشی جی' فضل دین معرفت الٰہی جان کا خط نکالنا۔ اسے دے دو۔"

گلاب دین نے اس پتے کا خط الٰہی جان کو دے دیا۔ جس کے پاس سے اسے نسوار کی بو آئی۔ ایک دروازے کے سامنے سے تماش بین ایک مشکی رنگ کی عورت سے چہلیں کر رہے تھے۔ جس نے تہبند باندھ

رکھا تھا' کانوں میں موتیے کے پھول تھے اور بالوں میں سرخ گلاب اڑس رکھا تھا۔ سراج نے یہ کہہ کہ علاقے کے باخبر چٹھی رساں ہونے کا مظاہرہ کیا۔ "یہ خانگی ذات کی مسلن ہے۔"

اس وقت گلاب دین کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ باہر نکلتے ہی اس نے ہڑبڑا کر پوچھا "ان خانگیوں کی کتنی تعداد ہوگی؟"

"کوئی گنتی شمار نہیں۔ خانگیاں نہیں کہتے انھیں' مولوی جی۔ یہ کنجریاں ہیں۔ نئی پیشہ بیٹھنے والی کو خانگی کہتے ہیں۔؟"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"خوک" گلاب دین نے حلق کھرچ کر زور سے تھوکا۔

ڈاک تقسیم کرنے کے دو وقت تھے۔ ایک دوپہر' ایک سہ پہر۔ دونوں وقت گلاب دین کو علاقہ گھومنا پڑتا۔ چاروں طرف چٹھیاں بانٹنے جانا پڑتا۔ اس بات کا اسے بڑا افسوس تھا کہ وہ بدرو قدرو کے گھر سے لیا ہوا روپیہ واپس نہیں دے سکا۔ اس روز سراج نے روپیہ زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اسے اسی طرح رہنے دیا کہ اگلے روز جا کر واپس دے دے گا۔ مگر اسے ادھر جانے کا حوصلہ نہ پڑا۔ اس نے سوچا کسی روز ان کی چٹھی دینے جائے گا تو روپیہ بھی واپس کر دے گا۔ مگر چٹھی ہی نہ آئی۔ جس دن آئی اس سے دو روز پہلے اس کی جیب سے وہ روپیہ نکال کر اس کی بیوی نے مٹی کا تیل منگا لیا تھا۔

بدرو اور قدرو سفید چاندنی پر لیٹی تھیں۔ گاؤ تکیے پر ان کی چھوٹی بہن آلتی پالتی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور آج اپنی عمر سے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ پاس ان کے باپ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ جب گلاب دین صحن میں داخل ہوا تو بدرو اسے دیکھتے ہی بولی' "چٹھی رساں آیا۔"

گلاب دین نے ڈاک چھانٹ کر تین لفافے اسے پکڑا دیے۔ اس کا باپ بولا "آؤ منشی جی' جی آیاں نوں۔ لڑکیاں روز کہتی تھیں' چٹھی نہیں آئی۔ نئے منشی جی لگے ہیں کہیں ہماری چٹھیاں دوسری جگہ نہ دے دیں۔"

گلاب دین بولا "جی نہیں۔ آپ کی چٹھی نہیں آئی تھی۔"

"میری بات کا خیال نہ کریں۔ آدمی بشر ہے۔ غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ بازار میں میری لڑکیاں بدرو اور قدرو کے نام سے مشہور ہیں۔ اصل نام بدر النساء اور قدر النساء ہے۔ تیسری قمر النساء کراچی میں بیٹھک کرتی ہے۔"

قدر النساء چاندنی پر لیٹی لیٹی بولی "ابا یہی تو اس روز کاکی کے پیدا ہونے کی چٹھی لائے تھے"

"بڑے مبارک قدم ہیں آپ منشی جی۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔ یہ منی آرڈر تو لکھ دیں۔" اس نے گاؤ تکیے کے پیچھے سے ایک منی آرڈر فارم اٹھا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا' بیٹھنے کے لیے جگہ خالی کر دی اور حقہ کی طرف موڑ کر نوکر سے کہنا لگا "اوئے' منشی جی کے لیے لسی لا۔"

''جی نہیں تکلیف نہ کریں۔''

''تکلیف کس بات کی' بھئی۔گھر کی لسی ہے۔''

''کوئی لویرا ہے؟''

''بھینس ہے' منشی جی۔''

بدرالنساء بولی''ہمارا گھرانہ تو مغلوں کے وقت سے آباد ہے۔''

گلاب دین کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔بدرو کا باپ بولا''ہم کوئی ایسے ویسے نہیں۔بڑے خاندانی کنجر ہیں۔'' پھر اس نے قمرالنساء کے نام منی آرڈر لکھنا شروع کر دیا۔جب آخری خانہ آیا تو بولا''یہ دو سو روپیہ تمہیں کاکی کی چوسنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔تمہاری ماں کی طبیعت اچھی نہیں' جوں ہی اچھی ہوئی' تمہیں ملنے آ جائے گی۔''

لسی کے شکریہ کے طور پر گلاب دین نے پوچھ لیا''کیا تکلیف ہے گھر میں''؟''چکر آتے ہیں۔ہم لوگ پرہیز بھی تو نہیں کرتے نا' منشی جی۔''

گلاب دین چلنے لگا تو بدرو کا باپ بولا''منشی جی' جس روز گھر کی لسی پینے کو جی چاہا کرے' بلاتکلف چلے آیا کریں۔''

آہستہ آہستہ گلاب دین کو سب کے اندرون خانہ کا حال معلوم ہوتا چلا گیا۔مثلاً یہ گیروے رنگ کا کشادہ مکان' جس میں بدرو اور قدرو رہتی تھیں' ان کی پردادی کو ایک رئیس لالہ مکند لال نے بنوا کر دیا تھا اور یہ کہ اب وہ سب سے چھوٹی لڑکی مہرالنساء کے لیے کسی اچھے رئیس کی تاک میں تھے۔گزشتہ روز قدرو کو جب مجرے کے لیے گلبرگ جانا تھا تو بدرو نے مہرالنساء کو کس کس طرح سجایا تھا اور وہ بقول ان کے نتھنی پہنے ہوئے موی گڑیا دکھائی دیتی تھی۔بدرو اور قدرو کے باپ کا نام عبدالکریم تھا اور بھائی کا نام قیم تھا جو کانوں میں مندراں پہنے رہتا' اچھا کھاتا' اچھا پہنتا اور کوئی کام نہیں کرتا تھا۔بدرو اور قدرو کی ماں سخت پردہ کرتی تھی۔

زہرہ و مشتری کے گھر موٹے موٹے چوتڑوں والی عورت جو کروٹ بدلے لیٹی نظر آتی تھی وہ زہرہ و مشتری کی سوتیلی بہن ہے' جسے افیون کھانے کی علت ہے' اسی طرح گولی کھا کر لیٹ جاتی ہے۔زہرہ و مشتری کی ماں پردہ کرتی ہے اور پچھلے سال حج کرنے گئی تھی۔اس کی دیکھا دیکھی گھر والوں کے سامنے بدرو اور قدرو کی ماں بھی حج کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی رہتی ہے۔مگر عبدالکریم اور اس کی تینوں بیٹیاں اس لیے حامی نہیں بھرتیں کہ ماں کی صحت کمزور ہے۔

گلاب دین کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس گانے والی کی بیٹھک زیادہ چمکے' دوسرے کے گھر فوراً خبر پہنچ

جاتی ہے کہ فلاں کے ہاں آج کل زیادہ سوسائٹیاں آتی ہیں۔ یہ سب کام طوائفوں کے ملازم کرتے ہیں جو رات بھر ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ دن بھر دکانوں پر بیٹھے تاش کھیلتے ہیں اور ہارنے والوں سے پیڑے کی لسیاں پیتے ہیں۔

جن جن مکانوں کے دروازوں پر دن کو موٹی موٹی چقیں اور تہہ دار ٹاٹ لٹکے رہتے ہیں' رات کو انہیں مکانوں کے دروازے اس زور سے کھلتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے چق اور ٹاٹ کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ اسے یہ سب مکان پراسرار نظر آتے تھے۔

وہ ایک دم تھکا ہوا تھا' پیاس بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی عبدالکریم کے گھر کی لسی پینے کو چاہا۔ اس نے سوچا یہ چار چٹھیاں بانٹ کر چوک کی طرف مڑ جائے گا۔ جوں ہی وہ چٹھیاں بانٹنے گلی میں داخل ہوا وہاں شور مچا ہوا تھا۔ مسلن کی ایک رنڈی سے لڑائی ہو رہی تھی۔ چند رنڈیاں کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب گلاب دین وہاں سے گزرنے لگا تو مسلن اپنی مخالف رنڈی کی طرف لچر سا اشارہ کر کے بولی ''جانی تجھے چٹھی رساں۔۔۔۔۔''

''جانی کشتیئے' تجھے چٹھی رساں۔۔۔۔۔'' دوسری نے پلٹ کر جواب دیا۔

سب رنڈیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور گلاب دین بغیر چٹھیاں بانٹے گلی میں سے نکل آیا اور عبدالکریم کے پاس پہنچا جو اپنی ڈیوڑھی میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا ''خیر ہے؟ آپ کچھ گھبرائے ہوئے ہیں۔''

گلاب دین نے پگڑی کے شملے سے ماتھا پونچھا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔

عبدالکریم اگلے روز گلاب دین کو چودھری حاقو کے پاس لے گیا جس نے اللہ رکھی مسلن کو خوب پیٹا اور گلاب دین سے کہنے لگا ''دیکھو' منشی جی۔ آپ نے مجھے یہ تو نہیں بتایا نہ کہ گلابو کی گلی سے گزرتے وقت پھونداں کنجری آپ کو تنگ کیا کرتی تھی۔ جب آپ گزرتے وہ گلابو سے کہتی ''نی تیرا خصم غلاب دین آیا ای۔'' مجھ سے یہ شکایت دوسری رنڈیوں نے کی تھی اور میں نے ایک دن اس بات پر پھونداں کی پسلیاں بھی توڑی تھیں۔ ہمیں تو آپ کا پہلے ہی بڑا خیال ہے' منشی جی۔ مگر ایک بات آپ سے کہنی ہے مجھے' وہ یہ کہ گلیوں میں سے آپ مردوں کی طرح گزرا کریں' کھسروں کی طرح نہیں۔ اس علاقے میں تو آدمی کو بڑا اسٹرانگل ہو کر رہنا چاہیے۔''

جب گلاب دین عبدالکریم کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو ڈیوڑھی سے باہر ایک لمبی سی سبز کار کھڑی دیکھ کر عبدالکریم بولا ''میرا خیال ہے' رانا ہوری آئے ہیں۔''

بیٹھک میں خستہ صوفے پر' جس کا غلاف پرانی میل سے موم جامہ بن چکا تھا' رانا صاحب بیٹھے تھے۔

صوفے کے بازو پر بدرو بیٹھی تھی اور مہرو ایرانی سلک کے تھان کو اپنے بازوؤں سے ناپ رہی تھی۔ پھیلتے بازوؤں سے اس کے سینے کی گوری گولائیاں سامنے آ کر آنکھیں لڑا رہی تھیں۔

رانا سے ہاتھ ملا کر عبدالکریم گاؤ تکیے پر بیٹھ گیا اور مہرو سے بولا "گنجے سے کہو منشی کو لسی پلائے۔"

بدرو بولی "بازار گیا ہے۔ میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ صوفے کے بازو پر سے اٹھ بیٹھی اور اندر سے لسی کا ایک گلاس لا کر گلاب دین کے ہاتھ میں دے دیا' پھر پراسرار طریقے سے آہستہ سے بولی۔

"آپ ابھی جائیں مت۔"

"وہ وہاں سے اپنی ریشمی شلوار کو ہاتھوں میں سنبھالتی ٹاپ کر برآمدے میں پہنچی۔ وہاں سے بیٹھک میں آ کر رانا سے بولی "اماں ہوری اندر بیٹھے بھینس کا سودا کر رہے ہیں۔"

پھر باپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "منشی جی کہتے ہیں' بھینس کا مالک کہتا ہے' لینا ہے تو دو دن میں آ کر اپنا مال لے جائیں۔"

باپ نے مسکرا کر رانا کی طرف دیکھا اور بولا "یہ دونوں بہنیں باری باری لسی بلوتی ہیں۔ اصل میں رانا جی' اب ہماری بھینس سوکھ گئی ہے۔ روز کہتی تھیں ابا' نئی لے دو۔"

رانا مہین سی نگاہیں بدرو کے چہرے پر ڈال کر بولا "تو لے لو نا۔ کتنے میں دیتا ہے؟۔

"کیوں ابا جی' آٹھ سو مانگتا ہے؟"

"ہاں پتر"

"کل مجھ سے چیک لے لینا" رانا بڑی بے غرضی سے بولا۔

بدرو نے چونچلا پن سے وہیں کھڑے کھڑے کہا "اچھا منشی جی' آپ اب جائیں' ڈوگر سے کہہ دیں' ابا جی آ کر بھینس لے جائیں گے۔"

بھینس؟ کیسی بھینس؟ وہ سوچنے لگا۔

اس نے باہر نکلتے ہی پنواڑی سے پوچھا "یہ رانا ہوری کون ہیں۔"

"جس نے بدرو کو سرفراز کیا تھا' اس کا منشی ہے۔ کوئٹے سے آیا ہے۔۔ بھولے نہ بنو منشی جی' مال لایا ہوگا۔ اب چھوٹی بھی جوان ہوگئی ہے۔ بڑا اسمگل آدمی ہے۔"

اسمگل کیا ہوتا ہے؟ سوچتا ہوا نوگزے کی قبر کی طرف چل دیا۔

اگلے روز اسے رانا کو دیکھنے کا شوق پھر بدرو کے گھر لے گیا۔ بیٹھک میں ساتھ ساتھ دو پلنگ بچھے تھے۔ ایک پر رانا بیٹھا نائی سے شیو بنوا رہا تھا۔ دوسری پر چائے کی پیالیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ ان کا ملازم

گنجا برآمدے میں کونڈی میں بادام رگڑ رہا تھا اور بدرو کا بھائی قیم ریشمی تہمد کو سمیٹے منڈی ہوئی پنڈلیاں ننگی کیے اس کے پاس بیٹھا کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ قدرو اور مہرو گاؤ تکیوں پر بیٹھی مکھن چھیل رہی تھیں۔

''چودھری ہوری ہیں گھر؟''

''نہیں منشی جی۔ میری کوئی چٹھی نہیں آئی؟'' مہرو جلدی سے بن کر بولی جیسے دو دن میں اسے پر لگ گئے ہوں۔

''تیری چٹھی کہاں سے آئے گی کمینے'' قدرو نے جھٹ سے اس کا پتا کاٹ دیا۔ ساتھ کے کمرے سے بدرو نکل آئی۔ جس نے نہایت خوبصورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوشبو کی شیشی تھی جو وہ اپنے لباس پر چھڑک رہی تھی۔ کچھ خوشبو اس نے رانا پر چھڑکی اور بولی ''منشی جی' کوئٹے کی سوغات لیتے جایئے۔ یہ چار سیب زہرہ مشتری کے گھر دیتے جائیں اور یہ دو آپ کا حصہ۔''

بدرو نے ایک پٹھو میں سے چھ سرخ سرخ سیب نکال کر گلاب دین کو تھما دیئے' جو اس نے اپنے چمڑے کے تھیلے میں اڑس لیے اور لمبے لمبے سانسوں سے خوشبو کی لپٹیں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

زہرہ و مشتری اپنی بیٹھک میں دو اجنبیوں کے ساتھ بیٹھی رمی کھیل رہی تھیں کہ گلاب دین نے جا کر سیب ان کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں بہنوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا ''منشی جی' دیگ چڑھی ہے ان کے گھر؟'' زہرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں نے نہیں دیکھی'' گلاب دین نے جواب دیا۔

برآمدے میں ان کی سوتیلی بہن کے تو بڑے نے کروٹ بدل کر گلاب دین کی طرف دیکھا اور پھر پیٹھ موڑ لی۔

اگلے دن ڈاک چھانٹتے وقت اسے زہرہ کے نام کی چٹھی ملی۔ وہ چاہتا تھا کہ بدرو یا قدرو کی چٹھی ملے تاکہ آج پھر ادھر کا پھیرا رہے۔

سہ پہر کو جب وہ ہاتھ میں زہرہ کی چٹھی لیے مکان میں داخل ہوا تو زہرہ اور مشتری میٹنی شو دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ رانا برآمدے میں ان کی بہن سے چہلیں کر رہا تھا جو اسے اپنی جتنی موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔

ادھر بھینس خریدنے کو رقم دے آیا ہے' ادھر بھینس کے چٹکی لے رہا۔ رانا استرا گل آدمی ہے یا بھینسوں کا سوداگر! گلاب دین یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا۔

تین روز بعد اسے اڑتی اڑتی ایک خبر ملی۔ اس نے سوچا' پنواڑی کی دکان اس کے سامنے ہے' اسی سے

تصدیق کرنی چاہیے۔

پٹواری بولا" جو تم نے سنا ہے ٹھیک ہے۔ رانا تو مہرو کے لیے تیار تھا مگر بدرو کی ماں نہیں مانی۔"

گلاب دین نے پوچھا" عبدالکریم اور قیم راضی تھے؟"

"قیم تو سردائیاں گھوٹ گھوٹ کر پلاتا تھا" پٹواری مسکرا کر بولا" جس کا مال اس کا گال، منشی جی۔"

خوبصورتی کس طرح بیچی جاسکتی ہے۔ جسم کس طرح فروخت ہوسکتا ہے۔ وہ اس طرح کی باتیں سوچتا بھی جاتا، بازار میں چلتی پھرتی طوائفوں کو خالی ذہن سے دیکھتا بھی جاتا اور چٹھیاں بھی بانٹتا جاتا۔ اس نے اپنے کام سے کام رکھا اور کتنے ہی دن بدرو اور قدرو کے گھر نہ گیا۔ ایک روز اسے موتی بازار میں عبدالکریم ملا جس کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے اب نئی بھینس خرید لی ہے۔ عبدالکریم نے کہا" کسی روز آنا ہمارے گھر جلسہ ہونے والا ہے۔"

ایک روز بدرو کے نام پانچ سو روپے کا منی آرڈر آ گیا۔ گلاب دین نے پڑھا۔ رانا حیات بخش نے کوئٹے سے بھیجا تھا۔ آخر میں لکھا تھا جلسے کے لیے روپیہ بھیج رہا ہوں۔ مجھے بھی اس دن یاد کر لینا۔

وہ چق اٹھا کر اندر گیا تو بدرو چارپائی پر لیٹی سگریٹ پی رہی تھی۔ آہٹ سن کر اٹھ بیٹھی" شکر ہے آپ بھی آئے، منشی جی۔"

"کوئی خط ہی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔"

"خط نہ ہو تو کیا آنا چھوڑ دینا تھا۔ اتے ہوری اتنا یاد کرتے تھے آپ کو۔"

کمروں میں سے عبدالکریم بھی نکل آیا۔ منی آرڈر کا سن کا سب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہرو بھی چنگیر اٹھائے بھاگی بھاگی باہر چلی آئی۔

"اب منشی جی آپ ذرا کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جائیں۔ کاکی اندر سے حقہ اٹھالا۔"

مہرو نے حقہ لا کر باپ کے پاس رکھ دیا جس نے منہ میں نے لے کر گلاب دین کو دیگوں کا سالا لکھوانا شروع کر دیا۔ گلاب دین کی حیرت دور کرنے کو عبدالکریم نے کہا" ہم قمرو کی کاکی کی خوشی کرنا چاہتے ہیں۔ قیم تو ناکارہ آدمی ہے۔ کل میں اور آپ جا کر سودا لے آئیں گے۔ نائی کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔"

اس بات چیت میں قدرو اور بدرو بھی کبھی کبھی اپنی تجویز پیش کرتی تھیں۔ مہرو پکے فرش پر پالتی مارے لہسن چھیلتی رہی۔ گلاب دین نے اپنے کان پر اٹکی ہوئی پنسل کو اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے آج پوچھ ہی لیا۔

"اتنا لہسن کیا کرتے ہیں آپ؟"

قدرو نے کہا" ہمارے گھروں میں سالن اچھا پکتا ہے اور بہت آدمیوں کے لیے پکتا ہے۔ اس میں

ڈالا جاتا ہے۔"

بدرو بولی "ہم دن بھر کیا کام کریں۔ اسی طرح اماں کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔" مہرو اپنی اہمیت دکھانے کے لیے اور تیزی سے لہسن چھیلنے لگی۔

"اللہ خیر رکھے۔ اب اتوار کو دیکھ لینا نا" عبدالکریم گلاب دین کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

انہوں نے باسمتی چاول، خالص گھی اور مسالے کی پوٹلیاں تانگے سے اتار کر ڈیوڑھی میں رکھیں تو گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ عبدالکریم کے کہنے پر گنجا بازار سے چائے کا ایک سیٹ لے آیا۔ وہ چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ بدرو قدرو اور مہرو تینوں بہنیں بجی سجائی بیٹھک میں داخل ہوئیں۔ بدرو ہنس کر بولی "ابا جی ہم تو بلاوے دے آئے ہیں۔"

آج بدرو معمول سے زیادہ پتلی اور جاذب نظر دکھائی دے رہی تھی۔ قدرو کا بدن گدرایا ہوا تھا۔ اس کی ناک کی کیل بار بار چمک رہی تھی۔ اور مہرو پر بہار شباب کی رنگینیاں لیے اس کے ہمرکاب اس طرح تھی، جیسے دھلی نکھری بدلیوں کے ہمرکاب بجلی کی کڑک۔

پروگرام یہ تھا کہ اتوار کو دوپہر کا کھانا اور رات کو گانا۔ گلاب دین کی طرف سے جب ڈھل مل اظہار ہوا تو عبدالکریم نے کہا "منشی جی، آپ کوئی اوپرے تو نہیں۔ ہمارے گھر میں آپ کو کون نہیں جانتا۔ اول تو ہم نے زیادہ لوگوں کو بلایا نہیں۔ یہ اڑوس پڑوس کے چند گھروں کو بلایا ہے۔ باقی رہا گانا تو وہ آپ کی مرضی ہے۔"

"حافظ صاحب نے کیا فرمایا ہے، قدرو پتر؟"

قدرو نے کہا "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید۔ کیوں ابا جی"

"کچھ نہیں پتر، منشی جی کو سگریٹ دو۔"

قدرو نے سگریٹ کی ڈبیا منشی کے آگے کر دی جس میں گلاب دین نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔

"بس آپ ڈاک بانٹ کر سیدھے ادھر ہی آجائیں۔"

ہفتے کی شام کو نائی نے چولہا گاڑھ دیا اور اتوار کی صبح کو اس کے دو ساتھیوں نے آ کام سنبھال لیا۔ جاوتری، لونگ، دارچینی اور زعفران کی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی اور دیگوں میں بڑا کفگیر گڑگڑ بجنے لگا۔

گلاب دین پیدائشی منتظم تھا۔ عبدالکریم نے استاد نورالدین اور منشی گلاب دین کو دیگوں کی نگرانی پر بٹھا دیا۔

بدرو کے سازندوں نے دالانوں میں کرائے کی چاندنیاں بچھا دیں۔ قیم اور اس کے دوستوں نے گاؤ

تکیے بچھا دیے۔ پھر آتشدان پر گلاب پاشیاں رکھ دیں اور پوچھنے لگا ''آپا بدرو! ٹھیک ہے؟''

اس نے کہا ''ہاں جیتے رہو! ٹھیک ہے۔''

''آپا! سگریٹ کے لیے کچھ پیسے تو دے دو۔'' بدرو نے دس روپے کا نوٹ دے دیا۔ وہ ادھر غائب ہوئی' یہ قدرو کو لے آیا اور بولا ''بی بی! ہمارا انتظام ٹھیک ہے نا؟''

اس نے کمروں کا جائزہ لے کر کہا ''ٹھیک ہے۔''

دوپہر ہوئی تو طوائفوں کی ٹولیاں آنی شروع ہو گئیں۔ انگلیوں میں سگریٹ لیے ہوئے' چھالیہ چباتیں' سرگوشیاں کرتیں' رنگا رنگ آوازیں' رنگا رنگ لباس' گورے چہرے' سنولائے چہرے' بھرے سینے' پتلی کمریں' دلبری کی تمام ادائیں اور غمزے' ابریشم و کمخواب کے تھانوں میں لپٹے ہوئے کچھ جوان' کچھ سرشار' کچھ ادھیڑ' دالان جیسے قمریوں اور کبوتریوں کی غٹرغوں سے چہک اٹھا۔ نور پلاؤ' شیر مال اور قورمہ برتایا گیا۔ ایک آتا ایک جاتا رہا۔ زیادہ قریبوں کے گھر کھانا پہنچا دیا گیا۔ اس ہجوم دلبراں میں گھرے ہوئے گلاب دین کی نیچے کی سانس نیچے' اوپر کی اوپر۔

مہمانوں کا بھگتان ہو چکا تو برتانے والوں کی باری آئی۔ پھر یہ سب کھا پی کر دالان میں بچھی چاندنی پر لیٹ کر سگریٹ کا دھواں اڑانے لگے۔ نائی اپنی دیگیں اور مجولے سنبھالنے لگا ''پتا نہیں' اپنے چھٹی رساں کو کچھ دیا ہے یا نہیں؟''

استاد نورالدین بولا ''بی بی نے چاول دیے تھے۔''

برآمدے میں سے بدرو بولی ''میں نے دیے تھے ابا جی۔''

''ہمارے لیے ہمیشہ اچھی خبریں لاتا ہے۔''

رات کو جب گلاب دین پہنچا' مجلس سج چکی تھی۔ فیروزہ نے سلمے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول کلائیاں سونے کی چوڑیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ زہرہ نے ساڑھی کے ساتھ برائے نام سی چولی پہن رکھی تھی۔ جب ساڑھی کا پلو سرک جاتا تو سامنے سے اس کا کسا کسا پیٹ اور پیچھے سے چکنی چکنی کمر دکھائی دینے لگتی۔ گگ نے چوڑی دار پاجامے پر گھیر دار قمیض پہن رکھی تھی' جیسے اکبر کے زمانے کی مغنیہ۔ جب چلتی تو جوتی کے ستارے اور قمیض کی گوٹ کے بادلے جھلمل جھلمل کرتے۔ ریشمی غرارے میں مشتری کے سرین چکی کے دو پاٹوں کی طرح رگڑ کھا رہے تھے۔ غرارے کو انہوں نے اس طرح بھر دیا تھا جیسے اس میں انڈ ہیلے گئے ہیں۔ مشتری کی چھوٹی بہن جو چند مہینے ہوئے آج کا سبق لے رہی تھی' آج پہچانی نہیں جاتی تھی۔ اس نے ماتھے پر جھومر لٹکا رکھا تھا۔ پلکوں کے تناؤ میں کئی اشارے اور کئی لگاوٹیں پل رہی تھیں۔ شعلہ جوالہ بنی ادھر سے

ادھر اپنا آپ دکھاتی پھر رہی تھی۔ بلو پھلجھڑی بنی ہوئی تھی۔اس نے سینے پر دو پٹا نفے باندھ رکھے تھے۔اس کے کئی روپ تھے۔مہتابی‘انار‘پوپٹ‘گولہ۔لیکن بجلیاں نہیں تھیں۔تمام بجلیاں آج بدرو کے حصے میں آ گئی تھیں جس کی لم جھڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور نسوانیت کے ابریشمی پرتو سے چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ پان الائچی کی طشتری لیے چاروں طرف تواضع میں جتی ہوئی تھی۔قد رو ہونٹ میچ میچ کر باتیں کرتی تو اس کے ہونٹوں کی یاقوتی تراش اور بھی غضب ڈھاتی۔وہ اپنی انگلیوں کی خفیف سی حرکت سے اپنے کٹے ہوئے بالوں کو گردن سے ہٹاتی تو یوں لگتا جیسے انگلیوں کی پوروں سے بلوریں شبنم کی پھوار پڑ رہی ہے۔

مہرو‘ مہرو ہی نہیں لگتی تھی۔اس کی دنبالہ دار آنکھوں میں اتنی گھلاوٹ کہاں سے آ گئی تھی۔ چوکڑیاں بھرتی پھر رہی تھی۔تنگ لباس میں اس کا انگ انگ نظر آ رہا تھا۔چھوٹی سی ننھی اس کے بڑے بڑے ارمانوں اور ان کہے خیالوں کی چغلی کھا رہی تھی۔اتنے میں ایک جوڑا اندر آیا۔سرو قد لڑکی‘ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی‘ سمٹے ہوئے ریشم کی طرح محفل میں داخل ہوئی۔بڑی نزاکت سے ہاتھ کو قوس بنا کر سب کو آداب کیا۔

دالان کی دہلیز پر بیٹھے گلاب دین نے پوچھا ”قیم جی یہ لڑکی کون ہے؟“

وہ اینڈتے ہوئے بولا ”شمو‘ میری پھوپھی کی لڑکی۔خواجہ صاحب کے گھر میں ہے۔“

گلاب دین کے سینے میں جیسے بہت سی سانس رکی ہوئی تھی۔اس نے ایک لمبی سانس لی۔وہ خواجہ کی کوٹھی میں چٹھیاں بانٹ چکا تھا۔وہ انہیں جانتا تھا۔

سر راہ کھلے ہوئے سارے پھول سامنے کے رخ اکٹھے ہو گئے تھے۔رنگا رنگ ہنستے کھیلتے دمکتے چہرے پھولوں کا گلدستہ بنے دکھائی دے رہے تھے۔خار‘ گل کے ساتھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خواجہ صاحب ان صوفوں پر جا بیٹھے جدھر مرد مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ایک طرف کو بیٹھ کر حقے کا دھواں اڑانے والے سازندوں میں سے ایک آدھ نے انہیں سلام کیا اور اپنے ساز لے کر قالینوں پر آ بیٹھے۔سب سے پہلے آئے ہوئے رم خوردہ مشتری کی چھوٹی بہن الماس کو پکڑ کر بٹھایا گیا۔اس کے گانے کے بعد شور مچا ”بدرو‘ بدرو“

بدرو نے اپنی گھنی پلکوں کو اوپر اٹھایا‘ مردوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔پھر محفل کا ایک نظر سے جائزہ لیا اور اپنی ریشمی شلوار کی کریز کو چٹکیوں میں تھام کر پائنچے سنبھالتی بیچ میں آ بیٹھی۔گلاب دین دہلیز پر اور اونچا ہو گیا۔اس نے بدرو کو اس رنگ میں کب دیکھا تھا۔یا الٰہی! بدرو کی آواز کا لہرا تھا یا رم جھم۔ایک مہمان نے نوٹ نکالا۔

گلاب دین نے ساتھ والے سے پوچھا "کتنے کا ہے؟"

"دس کا"

گلاب دین کے سینے سے پھر ایک لمبی سانس نکلی جو دیر سے رکی پڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا بدرو کے اعضا میں یہ لچکیلا پن کہاں سے اترا آ رہا ہے۔ اس کی آواز نکھرتی جا رہی تھی۔ ایک نوٹ، دو نوٹ، تین، چار، پانچ۔۔۔۔۔۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟"

اب خواجہ صاحب نے نوٹ دیا، پھر شمو نے، پھر خواجہ صاحب نے، پھر شمو نے۔ سب ہنسنے لگے۔

بدرو دو غزلیں گا کر بڑی نزاکت کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اب گگ جی سے فرمائش ہوئی۔ گگ نے پکے راگ سے آغاز کیا۔ جب گلا کھنگالا گیا تو ساقی نامہ شروع کیا۔ آواز کا جادو ملاقاتیوں کے سر چڑھ کر نوٹ پر نوٹ دلوانے لگا۔ گگ نے جوش میں آ کر گھنگرو باندھ لیے تو سارے لوگ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگے۔ اس نے بتاوے دے دے کر کس کس حسن ادائیگی سے زاہد و محتسب کے چٹکیاں لیں۔ کس کس شان دلربائی سے کمر کو لچکا دے دے کر میکدے کے دروازے پر دستک دی کہ محفل کی محفل تڑپ اٹھی۔ بدرو نے اٹھ کر سینے سے لگا لیا اور بولی "گگ جی زندہ باد!"

ایک کونے سے آواز آئی "ڈھولک" بلو نے چونکنے ہو کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ بلو کے ملاقاتی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بتایا' تیرا نیاز مند ادھر بیٹھا ہے۔ بلو مسکرا دی۔ مہر دنے ڈھولک لا کر بلو کے سامنے رکھ دی اور الماس کو لے کر خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈھولک کیا بجی' وضع داریوں کے بند ڈھیلے پڑ گئے۔ بعض مہمان صوفوں سے اتر کر قالینوں پر آ بیٹھے اور چٹکیاں بجانے لگے' تھاپ دینے لگے۔ رنگ محفل ہی بدل گیا۔ ایک صاحب پہلے نوٹ دیتے رہے' پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ناچنے لگے۔ چک پھیریاں لیتے لیتے قدرو کے پاس جا پہنچے اور ہنستے ہنستے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لے آئے۔ شور مچا "شاباش! ٹھیک ہے۔" ان صاحب نے قدرو کے گھنگرو باندھ دیے اور استاد کو اشارہ کیا۔ طبلے پر ہاتھ پڑا' تھئی۔ قدرو نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کی پنکھڑیوں کو بھیچ کر کلائی پر کلائی سے گرہ باندھی۔ ایڑی ٹھمکی۔ آنکھوں میں رس اترا۔ پلکوں کا ریشمی تناؤ ستاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر چاندنی میں گھلنے لگا۔ کائنات گردش میں آ گئی اور قدرو رنگوں کا پیکر بن کر گھومنے لگی۔

گلاب دین کے سینے میں اب کوئی رکی پڑی سانس باقی نہ تھی۔ وہ مجسم حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ اللہ غنی! یہ قدرو تھی۔ اس کے پاؤں تھے یا خط چھانٹنے کی خودکار مشین۔ بھاپ نکل رہی تھی۔ اس نے غور سے

دیکھا' ملازم محفل میں گرم گرم کشمیری چائے کے پیالے سینیوں میں رکھے پھر رہے تھے۔ چاروں طرف سگریٹوں کا دھواں پھیل رہا تھا۔ وہ ان رنگا رنگ آوازوں میں ابھی کچھ فیصلہ کرنے نہ پایا تھا کہ عبدالکریم اس کے پاس سے گزرتے گزرتے کہہ گیا" ابھی جانا مت۔"

رات بہت بیت چکی تھی۔ اس نے دو چار جمائیاں بھی لی تھیں' مگر چائے کے گرم گرم پیالے نے بدن میں پھر چستی پیدا کر دی تھی۔ ابھی اس کا پیالہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ محفل میں سے کسی نے الاپ کیا۔ وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھا۔ شمو کی بلوری انگلیاں ہوا میں ایک دائرہ بنا رہی تھیں اور اس کے گلے میں سے نور کی آواز نکل رہی تھی۔ ایک مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لفظوں کو انتہا پر لے جا کر وہ اس سبکی اور آہستگی سے انہیں لوٹا دیتی تھی کہ سینوں میں دل ڈول جاتے اور محفل میں واہ واہ ہونے لگتی۔

اس کے بعد مشتری آئی۔ چہرے پر اک سلونا پن اور ان کہے خیالوں کی جھلملاہٹ۔ ناک میں فیروزے کی کیل' ہاتھ میں فیروزے کی انگوٹھی۔ اونچی کرتی کے نیچے گول گول رانوں کو غرارے میں سمیٹ کے بیٹھ گئی۔ ایک کونے سے آواز اٹھی۔" پنجابی"۔ اس نے ہولے سے استاد سے کچھ کہا اور ماہیا گانے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا پنجابی گیت کی فرمائشیں جب پوری ہو چکیں تو بدرو اور گگ نے کہا " آپا فیروزاں۔"

فیروزاں نے سگریٹ کا ایک کش لے کر اسے مسل ڈالا۔ پھر اپنے لب لعلیں پر زبان پھیر کر کنجر خونچکاں کو آب دی اور سڈول کلائیوں میں چوڑیوں کو سنوارتی اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے نگاہ پر ایک خاص تمکنت' وقار اور اعتماد تھا۔ معلوم ہوتا تھا کسی وقت میں بڑی بانکی عورت رہی ہوگی۔

کسی نے کہا" مرزا صاحباں" اس نے اس طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر کہا" اچھا"

رات کے سناٹے میں اس کی کھرج دار آواز بلندیوں کی خبر لانے لگی۔ جب مرزا کے بول دہرانے لگی تو جوش میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو دوپٹہ اتار کر پھینک دیا اور ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی تانیں اڑانے لگی جیسے راوی کی لہریں بپھر کر کناروں سے اچھل جائیں۔ صاحباں کے بول گاتے وقت آواز کو اس طرح سمیٹ لیتی جیسے لہروں پر چاندنی رات میں چھوٹے چھوٹے پھول پڑنے لگیں۔ وہ نوٹ سمیٹتی جاتی اور محفل پر اپنی لوچدار آواز کا سحر پھونکتی جاتی تھی۔

ایک نکہت بہار تھی جو ستاروں کی جھلملاتی روشنیوں کے ہمرکاب گزر گئی۔ مولوی گلاب دین اذان ہوتے ہی شاہی مسجد کے ایک دالان میں سے اٹھا اور حوض کے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا۔ آج نماز پڑھنے میں اسے بڑا لطف آیا۔ خدا کے ہر سے ع ریض گھر میں اور گلاب دین کی کشادگی دل میں بڑی مماثلت تھی۔ اس

نے لمبے لمبے سجدے کیے اور روانہ ہو گیا۔

اس نے آس پاس کے علاقے کی ڈاک تو دو پہر کو بانٹ دی' دو چٹھیاں جو اسطرف کی تھیں ان کو رکھ لیا کہ سہ پہر کو سہی۔ جب سہ پہر کو اس نے عبدالکریم کے گھر جھانکا تو سب سوئے پڑے تھے۔ اگلے روز جب گلاب دین نے چق اٹھا کر دیکھا تو سب لوگ بیٹھک میں لیٹے ہوئے تھے۔

''آؤ منشی جی' کیا حال ہے؟''

''میں کل آیا تھا۔ آپ سب سوئے پڑے تھے۔''

''برا حال تھا ہمارا۔ لڑکیاں تھک گئی تھیں۔ کیوں' اچھی رونق رہی' منشی جی؟'' عبدالکریم نے کہا۔

''او جی رونق! کمال ہو گیا۔ گگ جی نے تو حد کر دی۔''

''ابھی تمہارے آنے سے دو منٹ پہلے گئی ہے۔ چار سو ہو گیا ہے اسے۔ لڑکیوں کو اپنے ہاتھ ساتھ بری امام لے جانے کو کہہ رہی تھی۔ پچھلے سال گئی تھی۔ بہت کچھ لے کر آئی تھی۔

''پھر؟''

''پھر یہ بھی تیار ہو گئی ہیں۔''

بدرو تاش پھینٹتے پھینٹتے بولی ''جو اللہ کو منظور۔''

پندرہ روز تک تینوں کی ہمہ وقت توجہ کپڑے سلوانے پر رہی۔ درزی آتا تھا' جاتا تھا۔ گنجے کو ڈانٹ پر ڈانٹ پڑ رہی تھی۔ آخر استادوں نے بقچے باندھے اور تینوں بہنوں کو لے کر دس دن کے لیے بری امام کے میلے پر چلے گئے۔

عبدالکریم کو ان کے خط کا بڑا انتظار رہا۔ گلاب دین خط لایا تو عبدالکریم حقے کی نے منہ میں سے نکال کر بولا ''تم سے کون سا پردہ ہے۔ پڑھ کر بھی سنا دو۔''

بدرو نے خط میں لکھا تھا کہ پنڈی پہنچ کر خیریت کے ساتھ نور پور پہنچ گئے ہیں۔ جہاں دو کمروں کا اچھا ڈیرہ مل گیا ہے۔ رات کو چوکی دیں گے تو اندازہ لگ سکے گا کہ میلہ کیسا جائے گا۔ ویسے میلہ بہت بھر رہا ہے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کی گانے والیاں آئی ہیں۔ کچھ ابھی آ رہی ہیں۔ سنا ہے یہ میلہ اگلے سال نہیں لگے گا۔ فقط آپ کی بیٹی بدر۔

دوسرا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ خدا کے فضل و کرم سے میلے کے ساتھ ہم بھی بہت اچھے جا رہے ہیں۔ پانچ دن کی آمدنی چار ہزار ہوئی ہے جو استاد جی آج پنڈی جا کر روانہ کر رہے ہیں۔ ہم اٹھارہ انیس کو لاہور پہنچ جائیں گے۔ ہمارے آنے سے پہلے صوفوں کا کپڑا بدلوا لیں۔ صوفوں کے سپرنگ بھی ڈھیلے ہو چکے

ہیں، وہ بھی ٹھیک کرا لیں بلکہ صوفے ہی نئے خرید لیں۔ پردے بھی نئے ڈلوا لیں۔ سستی نہ کریں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مہرو پر ایک گڑ پٹھان عاشق ہو گیا ہے۔ آپ نتھ اتروائی اس سے جو مانگیں گے دے گا۔ میں نے اور قدرو نے کہا یہ پردیس ہے" آپ لاہور آ کر ہمارے مہمان ہوں۔ وہاں ہم آپ کی خدمت کریں گے۔ کہتا ہے ہم کو کیا کھلائے پلائے گا۔ قدرو نے کہا جو آپ کہیں۔ بولا' استاد جی ہم کو بس شربت وصال پلا دو۔ ہم بہت پیاسا ہے۔ استاد جی نے کہا' خان صاحب آپ آئیں تو ہم آپ کو شربت وصال کے کنویں میں ڈبکیاں دیں گے' غوطے کھلائیں گے۔ مہرو کے سر پر ہمیشہ سو سو روپے کے نوٹ رکھتا ہے۔ صدقے اور قربان ہو ہو جاتا ہے۔ مہرو بھی اس سے بڑے نخرے کروا رہی ہے۔ گگ کے نوکر کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اس نے چاقو مار کر کسی کی انتڑیاں نکال دی تھیں۔

عبدالکریم نے چار ہزار کے بنک ڈرافٹ کا رجسٹری لفافہ گلاب دین کے ہاتھ سے وصول پایا تو اگلے دن ہی قیم جا کر نئے ڈیزائن کے صوفے اور پردوں کا کپڑا لے آیا۔ بیٹھک میں سفیدی ہو گئی۔ شیشے والی دیوار گیریوں پر پالش پھر گیا۔ نئے شیشے لگ گئے۔ ڈبی بازار سے کاریگر بلوا کر نیم چھتی سے لٹکے ہوئے پرانے جھاڑ فانوس کی صفائی کرا دی گئی۔ سارا گھر اجلا ہو گیا۔

لڑکیاں انیس کی صبح کو آ رہی تھیں اور انیس کو ہی پوسٹ آفس کے پچھواڑے والی عمارت کے لمبے کمرے میں چہل پہل دکھائی دے رہی تھیں۔

سپروائزر نے پوسٹ ماسٹر سے کہا" گلاب دین کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا عرض کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہر سال؟۔۔۔۔۔۔ بلا" پوسٹ ماسٹر نے چڑ کر سپروائزر سے کہا۔

دوسرے لمحے گلاب دین پوسٹ ماسٹر کے سامنے کھڑا تھا جو فائل پر نظریں جھکائے کہہ رہا تھا "یہ تمہاری پچھلے سال والی عرضی میرے سامنے پڑی ہے۔ تمہاری منشا کے مطابق تمہاری تبدیلی اب ہیرا منڈی سے واپس مصری شاہ کر دی گئی ہے۔ اب تم کیا عرض لے کر آئے ہو"

"حضور، میری صرف اتنی عرض ہے کہ مجھے یہیں رہنے دیا جائے۔۔۔۔۔۔"

پوسٹ ماسٹر نے فائل پر سے نظر اٹھا کر گلاب دین کو حیرت سے دیکھا اور بولا" کیا کہا؟"

گلاب دین کی ڈاڑھی غائب تھی' لمبی سی ٹھوڑی نکلی ہوئی تھی اور موٹے موٹے ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کا ہلکا ہلکا غبار تھا

احمد ندیم قاسمی

کنجری

سرور گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی' گلے کی رگیں پھول رہی تھیں' جیسے باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے کیونکہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کا وقفہ خبر کے بھاری بھرکم پن میں حارج ہو سکتا تھا۔ ''اماں'' وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا ''وہ برساتی نالے سے پرے محلے میں جو لڑکی رہتی تھی نا؟ بیگماں؟ جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھاٹ کی کنجری بن سکتی ہے''۔ ''ہاں ہاں' ہاں ہاں'' بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر ایک قدم آگے آ گئی اور سرور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔ ''وہ جو تمہارے خیال میں بیٹی کمال خاتون سے ہو بہو ملتی ہے''۔ اس نے کنکھیوں سے کمالاں کی طرف دیکھا جو چولھے کے پاس اپلوں کے دھوئیں میں لپٹی بالکل ایک پرچھائیں سی معلوم ہو رہی تھی اور بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پر کیا۔ ---- ''ہو بہو کہاں کہا تھا میں نے؟ ہماری کمال خاتون جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں! یہ آنکھیں تو سمندر ہیں۔ شمشاد اور نو بہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں' پر ہماری بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں اور پھر ہماری کمالاں کے اوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کئی بار جی چاہا کہ ہندو عورتوں کی طرح اپنی کمالاں کی ہر صبح آرتی اتارنے لگوں۔ بیگماں اچھی ہے۔ بات چیت' چال ڈھال میں قدرت نے بڑا نفیس اور بہت اونچے درجے کا رنڈی پنا بھر دیا ہے' پر ہماری کمالاں جیسا سجاؤ کہاں اس میں'' ---- بڑھیا کی باتوں کے دوران میں سرور اسی طرح کنکھیوں سے کمالاں کو دیکھتا رہا اور کمالاں جلتے ہوئے اپلوں میں دھیپنا ٹھونس کر ہر طرف پھوہڑ پن سے آگ بکھیرتی رہی۔ اور جب بڑھیا ڈلی پھانکنے کے لیے رکی تو ٹوٹے تار کو سرور نے بڑی پھرتی سے جوڑا۔ ''تو اماں وہی بیگماں رات کو اس مشہور نیزہ باز زمیندار کے ساتھ بھاگ گئی؟ جس کے ----'' بڑھیا پیڑھی سمیت اچھل کر سرور کے گھٹنے سے آ ٹکرائی۔ ''بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے

دادے پردادے کو اور لعنت اس کے باپ پر جو سکول کے سوکھے سڑے ٹوٹے' جڑے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔ واہ! کس کے ساتھ بھاگی؟۔۔۔۔۔" بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے چولھے میں برابر پھونکیں مارے جا رہی تھی اور کڑوا رلا دینے والا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا سرور بولا" اس زمیندار کے ساتھ جس کے بارے میں اماں تم نے ہی تو کہا تھا کہ تصویر اتارنے والی مشین کے سامنے بیٹھ کر آنکھ بھر کر دیکھے تو مشین کا شیشہ تڑ سے ہو جائے" اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی" معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا ہے بیگماں نے بھئی سرو بیٹے ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قائم ہے' ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دنوں میں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں۔۔۔ ہاہا۔ لگتا ہے میں دس برس اور جیوں گی۔ رگوں میں خون ناچنے لگا ہے۔ جیو میرے سرو' کیسی گھی میں تر تراتی خبر لائے ہو تم۔۔۔۔ کیوں کمالاں بیٹی؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولھے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کر اٹھایا کہ چلو بھر پتلی دال اچھل کر اپلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کو دیکھا اور سرور نے مسکرا کر کہا" کچی ہے ابھی"۔۔۔ کمالاں کو دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی" دال نا؟"۔ اور جب کمالاں ہنڈیا لیے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے گنگنے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک بڑی گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا" ہاں" وہ بولی" آج ہی تو سانولی رانی کو چکھنے کا مزہ آئے گا"

یہ تر تراتی ہوئی خبر کمالاں کے لیے نئی نہیں تھی' اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اسی قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ لاتے تھے اور انہیں کمالاں کے سامنے کچھ یوں مزے لے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی" پھر کیا ہوا بابا؟" اور سرور جواب میں کہتا" پھر کمال خاتون بیٹا! لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں توڑے گی' بھائیوں کا حلقہ توڑ کے بھاگی اور اپنے یار سے چمٹ کر رہ گئی۔ ہیر کو تو وارث شاہ نے خواہ مخواہ اچھال دیا ہے میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا۔ اماں کی قسم"۔۔۔۔ کمالاں یہ باتیں سن کر جھینپ جاتی' پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پر چھاج بھر ستارے برس پڑتے کبھی چولھا بھر انگارے۔

کمالاں کا دادا سہراب خاں گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا دکاندار تھا کہتے ہیں پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خاں نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کنویں میں کھانڈ کی اکٹھی بیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خاں صاحب کا خطاب پایا۔ مگر جنے اس پر کیا افتاد پڑی کہ یہ خاں صاحبی اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں

کہ خاں صاحب سہراب خاں پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی لیے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی مگر سارے گاؤں کی ایک ٹھاٹ دار دعوت شکوک و شبہات کو بہا لے گئی۔ البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوائی اڑا دی۔ یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی۔ اس نے شوشہ چھوڑا کہ سہراب خاں کی نئی بیوی تو ملتان کی مشہور طوائف زرتاج ہے جو وہاں تاجی کے نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے کئی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی۔ ''میں نے تاجی کو نواب رن مست خاں کی حویلی میں ناچتے دیکھا ہے لوگو!'' دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔ ''اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خاں صاحبنی وہی تاجی ہے کنجری''۔

اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا۔ ''کنجری۔ کنجری'' سہراب خاں کی دکان اجڑ گئی وہ دکان کا سامان اٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا۔ پانی تک کا محتاج ہو گیا تو رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا منشی ہو گیا۔ سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خاں صاحب سہراب خاں اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا۔ تاجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی کہتے ہیں کہ اس نے رو رو کر گاؤں کے سامنے تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی مگر اب برسوں سے توبہ کر چکی ہے' اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے کیا یہ گاؤں جس پر اس لڑکے کے ابا کے بے شمار احسان ہیں' انھیں اپنے گھر میں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا؟ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص ہرج نہیں ہے' گاؤں میں تاجی نے کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پر امن طریقے سے نوجوانوں اور نوعمر لڑکیوں کے درمیان یاریوں اور دوستیوں کے تانے بانے بنتی رہی اور اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی۔ پھر جب سرور جوان ہو گیا تو اس کے لیے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی بھی چن لی' بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خاتون پیدا ہوئی مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مر گئی۔ وہ لٹا لٹا سا رہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لیے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلا دیں اور اس کی دعائیں لیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ میں اسے معلوم ہو گیا کہ وہ تو اب تک کنجری ہے' ایک رات کمال خاتون کو ایک کپڑے میں لپیٹا' گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی۔ پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے۔ چنڈو خانے بھی کھول لیے اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے چرس لا لا کر بھی بیچتے رہے مگر سرور

ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لیے جیل چلا گیا۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے۔ ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر تک خرید لو۔ ایک سال تک سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے پھرے مگر کوئی بھی اس کے ہتھے نہ چڑھی' آخر ایک روز جلال پور جٹاں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رک گیا اور وہ بولی ''سرو بیٹے! وہ ہماری کمال خاتون زندہ ہوئی تو اب کے برس کی ہوگی؟'' سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا۔ چونک کر بولا' ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہو گی۔ پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو۔۔۔'' اور اس نے زور سے چٹکی بجائی' تاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمالاں کی یاد میں رونے لگی۔ ماں بیٹا افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تولہ تولہ کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں میں آئے تو مولوی صاحب نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مصلے بچھا کر نماز پڑھنے لگی تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک کھکھلتے رہے اور کہتے رہے ''پیڑ کا رخ غلط ہے تنے میں رسہ ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا!''

تنے میں بار بار رسہ ڈالا گیا مگر کچھ دیر بعد پیڑ جھک جاتا اور رسہ تڑ سے ٹوٹ جاتا پیڑ کا رخ معین ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے ملتان جا بسنے کا فیصلہ کر لیتے مگر پھر کمالاں سر پر گھڑا رکھے آنگن میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی ''دیکھ دیکھ سرو بیٹے! ذرا دیکھ تو اس بڑھتی ہوئی قیامت کو قد کیسا سرو سا ہو رہا ہے اور چال میں کتنی مستی ہے' ہونٹ دیکھو لگتا ہے اللہ نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں اور آنکھیں یہ تو سمندر ہیں۔ ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا اس میں اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی اور تمہارے سر کی قسم میں کبھی کلکتے والی گوہر جان پھر زندہ ہوگئی ہے۔ آواز میں وہ قدرتی مرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ میں کہتی ہوں ہز ماسٹر وائس چالیس پچاس پچاس ہزار میں ایک ایک ریکارڈ بھروائے گا اس سے اور وہ بھی ناک سے لکیریں کھود کر۔ میں تو نہیں جاؤں گی ملتان میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں۔''

کمالاں کا بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا' اگرچہ مصلے پھٹ جانے کے بعد دوسرا مصلے مہیا نہ ہو سکا مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی کسی دھلی ہوئی چادر یا چولے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ دادی اور ابا کی باتیں سن سن کر یوں چلا اٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہے۔ کئی بار

اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی بھی دھمکی دی مگر دادی نے اسے سمجھایا ''تم نہیں جانتیں بیٹا۔ جب تم خود بھی بڑی ہو جاؤں گی نا تو ایسی ہی باتیں کرو گی۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے۔ بچپن میں تم گڑیا سے کھیلی ہو گی پر اب تو نہیں کھیلتی نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنویں سے ایک ذرا سی گگریا بھر کر لا سکتی تھی۔ آج دو گھڑے سر پر رکھے ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہوئی لاتی ہو؟ تو یہ دنوں کا پھیر ہے میری جان۔ پھر اب بس چند مہینوں ہی میں تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی' جاگنے میں تمہیں مزا آئے گا اور اندھیرے میں تم کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی' سمجھ گئیں میری رانی؟ بس اب چند مہینوں کی بات ہے۔''

''بس اب چند مہینوں کی بات ہے!'' بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی۔

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا ''یہاں ایک ایک دن مہینہ ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ بس چند ہی مہینوں کی بات ہے تم بھی کمال کرتی ہو اماں ذرا سا افیم کا کاروبار چل رہا تھا پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دور دور کی بو سونگھنے لگے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں افیم بیچتا ہوں وہ پولیس کا مخبر لگتا ہے۔ مہینے میں کل پندرہ بیس کی بکری ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پورا کریں یا کھائیں پئیں اور اوڑھیں پہنیں۔ ویسے بھی دل کچھ ہولا یا سا رہتا ہے' سوچتا ہوں کمالو چکلے کے لائق نہیں' اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے نا اماں وہ نہ میں نے تمہاری شمشاد میں دیکھی نہ نو بہار میں۔''

بڑھیا بیٹے کی باتیں سن کر ہنس دیتی ''ارے پگلے کہیں تو بھی تو مولوی نہیں بنا جا رہا؟ یہ سادگی کی چمک کس کی آنکھوں میں نہیں ہوتی' ہوتی تو ہے پر غائب ہو جاتی ہے بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ بھی تو سوچا کہ یہ بھی کبھی جلا اور چمکا ہو گا۔ پگلا' آج کی افیم لا۔''

دونوں کمالاں کی جوانی کی یوں راہ تک رہے تھے جیسے چائے کی کیتلی کو چولہے پر رکھ کر پانی کے ابلنے کا انتظار کیا جاتا ہے اور یہ پانی اس روز ابلا جب کنویں پر جاتی ہوئی کمالاں کو ایک کسان قادر نے چھیڑ دیا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے میں یا کسی کنکر پر پڑتا تو وہ کہتا ''حسبی اللہ حسبی اللہ'' کمالاں بہت دیر کے بعد اس دعائیہ کلمے کی تکرار سے چونکی۔ پلٹ کر بولی ''اپنی بہنوں کو جا کر چھیڑ'' نوجوان مسکرا کر بولا ''میرے تو سب بھائی ہی بھائی ہیں مہربان'' کمالاں نے کڑک کر کہا ''تو پھر اپنی ماں سے عشق لڑا'' نوجوان ہنس کر بولا ''وہ تو مر چکی ہے پیارو'' کمالاں آپے سے باہر ہو گئی۔ قادرے کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ آن کی آن میں کنویں کی جگت خالی ہو گئی۔ لڑکیاں کمک کو بھاگی آئیں۔ قادرا لپک کر دور نکل گیا اور وہاں سے پکارا ''آخر کنجری ہو نا کنجری''۔۔۔۔ وہ لڑکیاں جو مارے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہو گئی

تھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، گنگنیں اور پھر زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آ گئی۔ پہلے تو دیر تک بلک بلک کر روتی رہی۔ پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسہ پانے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھلکھلا کر ہنس پڑی، حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سا غصہ تھا جو آنکھیں ملتے ہی کافور ہو گیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا ''چراغ بہت بری طرح بھڑک اٹھا ہے سرو بیٹے'' تو دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

اس روز سے کمالاں ایک دم سے بدل گئی، کنویں پر جا کر گھر میں سنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نو عمر لڑکیاں سنتیں لیکن جھینپ جھینپ جاتیں اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں ''آخر کنجری ہے نا کنجری'' یہ سب کچھ سن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے اور وہ اغوا اور آشنائیوں کی کہانیاں بڑے ٹھسے سے سناتی چلی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبر سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بڑی بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی، بڑھیا تاجی اور سرور یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے'' ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری شاندار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے، دیکھ لینا بیٹا'' بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی ان قلعوں کے دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی مسکراتی اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی اور پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھتی ''اے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بٹیا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے'' وہ سوئی ہوئی کمالاں کے پاس آ کر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی۔ پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر بیٹے کو پکارتی ''ذرا ادھر تو آنا سرو بیٹے' دیکھنا تو اپنے بیٹی کو' تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی مینڈھی کھلواتی'' پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹروں، گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی۔ کسی نے اسے بتایا کہ جس قادر نے اسے چھیڑا تھا وہ ایک نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے۔ کمالاں پر اس خبر نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا مگر جب کہنے والی نے کہا کہ ''تیرے نام پر لڑائی ہوگئی۔ قادر تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کر رہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دھنک کر ڈال دیا۔ ابراہیم کو تم جانتی ہو نا؟ اری یہی ابرو نوجی۔ تو کمالاں کو گھمری سی آ گئی اور اس کے بعد وہ احساس جمال اور احساس محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کی اس دھوپ

چھاؤں سے گھبرا سے گئے لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی' افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہو گئی اور جمائیوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا مگر کمالاں کی جوانی پر تکیہ لگائے رکھا۔ کمالاں اگر اب منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی اور ان سے لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے کی صورت شکل کے بارے میں کرید کرید کر نہیں پوچھتی تھی تو گھی میں تر تراتی خبریں سن سن کر روتی اور جھلاتی بھی نہیں تھی۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی میں جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی۔ جواب میں ابراہیم بھی مسکرا دیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گھر آ گئی۔ رات کو حالات کا جائزہ لینے کے بعد بڑھیا اور سرور سونے لگے تو انہوں نے مدتوں کے بعد کمالاں کو ''رگی'' میں گاتے سنا۔ دونوں ایک ساتھ بستروں پر اٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سنتے رہے اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا ''چوٹ لگی ہے' صاف چوٹ لگی ہے' تمہاری ہی قسم بیٹا' چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سا یہ اتار چڑھاؤ مشکل ہی سے آ پاتا ہے' آہا' لطف آ گیا!'' امیدوں کے پھول جنہوں نے اب تک سر بھوڑا لیا تھا تر و تازہ ہو کر سر بلند ہو گئے اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے۔

ہولے ہولے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہو گئی۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی تھی' دادی سارا دن پیڑھی پر بیٹھی افیم کی پینگ میں گم رہتی تھی یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی اور چباتی رہتی اور سرور موچیوں اور جلاہوں کی دکانوں پر بیٹھا افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سن کر اور اکثر گھڑ کر گھر لاتا۔ ماں بیٹا صرف اس وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے جب کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی۔ پھر بڑے جہاندیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات گئے تک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معانی اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کے اسرار و غوامض پر مغز زنی کرتے سو جاتے۔ لیکن اب تک ان میں سے کسی کو یہ جرات نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہ راست اور دوٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لیے کہتے' بس جال بچھاتے رہے دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی' بعض وقت سرور تنگ آ کر کہتا ''اماں اس حرامزادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں' ایک بار شمشاد اور نو بہار اور امیر وغیرہ کے حلقے میں بیٹھی تو سارے نشے ہرن ہو جائیں گے؟'' مگر بڑھیا تاجی دوراندیشی سے کہتی ''نہیں بیٹا! وہاں جا کر خود ہرن ہو گئی تو کیا کریں گے؟ ابھی کچی ہے نا' پک جانے دو' آپ ٹپکنے دو اور پھر تم پولیس کو نہیں جانتے تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ انہیں اگر پتہ چل گیا کہ کمالاں پورے چودے کی بھی نہیں تو میری تمہاری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے ہیں وہاں چند مہینے اور سہی' آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو ہے نہیں کہ کان سے پکڑ کر لے

جائیں۔ بیٹھے بیٹھے نہ بیٹھے' یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔ نسلوں کا نصیبہ کھل جائے گا میرے لال' ذرا سا اور دیکھ لو۔"

ایک روز سرور گھر میں آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا
"کچھ نہیں اماں' لطف نہیں آیا۔"

بڑھیا بولی "میں پہلے سے سمجھ گئی تھی کہ سرو بیٹا خالی خالی سا آ رہا ہے۔"

سرور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا "گلابی اور نواز میں بڑی مدت سے یارانہ چل رہا تھا' میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کہ کلیجے میں کتنا گہرا گھاؤ ہے۔ لوگ یقین نہیں کرتے تھے' کہتے تھے نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کر چلتا ہے۔ میں کہتا تھا بھئی جو لوگ نظریں اٹھا کر چلتے ہیں ان پر تم شبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آنکھیں جھکا کر چلو' پر جو آنکھیں جھکا کے چلتا ہے اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی یہ نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے' نظریں اٹھا کر چلا کرو' سو آج میں کلے جولاہے کے ہاں افیم بیچ کر آ رہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابی نظر آئی۔ چھپنے کی کوشش میں تھی پر میں نے دیکھ لیا اور جو کھنڈر کی دیوار سے جھانکتا ہوں تو اندر یہ نمازی نواز دبکا بیٹھا ہے اور پھر پلٹ کے دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا "کیوں پیارے نماز پڑھ رہے ہو؟"۔ مجھے من بھر کی گالی دے کر چاقو نکال لیا اور بولا "یہ کوئی تیرے باپ سہرابے کا کھنڈر ہے؟" پر اماں! جھینپ چھپائے سے چھپتی تو نہ ہیر بدنام ہوتی نہ سوہنی۔ خیر' میں نے واپس آ کر موچی کی دکان پر ذکر کیا تو سب نے مجھے جھوٹا قرار دیا میں نے پیر دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے بس ابھی ابھی دونوں کو اکٹھے دیکھا ہے کہ ایک دم جیسے دکان پر الو بول گیا۔ سامنے یہی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے "اسے کل تک مرمت کر دو بھائی" اس نے موچی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی۔ ایسی بھد ہوئی ہے اماں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں' بڑے آئے بچی یاری لگانے والے چھپ چھپ کر ملتے ہیں اور۔۔۔۔۔۔ حرامزادے!"

اور کمالاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چھپ چھپ کے ملنے سے کیا تکلیف ہوئی' وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے؟ یہ تو نہیں کرتے نا کہ کمر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی اور عشق کا نام بدنام کیا۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں گلابی کے روپ میں سلطانے کے کھنڈر میں جا پہنچی جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا اور پھر۔۔۔۔۔۔

بڑھیا کی آواز نے اسے چونکا دیا "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھر رہے ہیں۔ ماں کے لاڈلے' دھن ہو بیگماں جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے سینے پر سر رکھ دیا' دنیا بھر کے

سامنے، مزا آیا نا عشق کرنے کا۔"

"دادی" کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو میں حصہ لینے لگی تھی اس لیے دادی اور بابا دونوں "جی جی" کرتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی "آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟"

بڑھیا اسے راہ راست پر لانے کے لیے واعظانہ لہجے میں بولی "دیکھ بیٹی رانی۔۔بات یہ۔۔۔۔"

مگر سرور نے بات کاٹ دی "ٹھہرو اماں! بیٹی کمال خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال خاتون بیٹا کہ کیا تم چھپ چھپ کر ملنے کو برا نہیں سمجھتیں؟"

"کس سے؟" کمالاں نے پوچھا۔

"کسی سے۔ جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو ملو گی؟" سرور نے تن کر کہا۔

"خدا بھلا کرے!" بڑھیا نے سرور کو داد دی "کیا اسی سے بات پیدا کی ہے اور وہ بھی سو بات کی ایک بات ہاں تو بتاؤ بیٹی جواب دو ملو گی!"

کمالاں تو جیسے طوفان میں گھر گئی تھی چکرا گئی اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اسے کنارہ مل گیا۔ بولی "پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا!"

"ہاں ہاں جس سے تیرا اپنا جی چاہے گا" بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔

"بالکل۔۔۔۔۔اچھا تو کون ہے وہ؟" سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں بڑھیا اور سرور نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی جو دیکھی نہیں جا سکتی تھی صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ بولی "ایسا تو کوئی نہیں۔"

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں۔

سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرلے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی "حرامزادی۔"

اس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی۔ پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹتی رات تک دونوں میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی اور پھر ایک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیہ کی صورت میں استعمال ہونے والے میلے

چیتھڑوں میں یوں جما دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چاک کو رفو کرنے چلی ہے۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرز عمل بہت بدلا بدلا سا تھا۔ بڑھیا بے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھتی اور کھانستی کھنکارتی ادھر ادھر گھومنے لگتی۔ ٹوٹے ہوئے چھاج کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا "کیا بات ہے دادی؟"

"ارے بیٹا! کوئی خاص بات نہیں" بڑھیا بولی "جوانی کمبخت یاد آ رہی ہے۔ ایسی ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو سینے سے بھینچ کر انہیں سرمہ بنا کر رکھ دوں۔ انگلیوں کی پوروں تک سے کوئی چیز پھٹ کر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی، تمہیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آ گئیں اسی لیے ذرا اداس ہو رہی ہوں۔"

سرور بھی اس روز دن میں کتنی بار گھر کے چکر لگا گیا ایک مرتبہ کمالاں نے اس سے بھی پوچھا "کیا بات ہے بابا؟"۔

"آبکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بیٹا" وہ بولا "ذرا سی افیم تھی اسے ادھر ادھر کیا ہے۔ کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے، افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں فاقوں مر جائیں گے بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ پڑ تو نہیں گیا۔ لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بیٹی، نیچ سمجھتے ہیں ہمیں، اس لیے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر کے پاس شکایت جڑ دے خواہ مخواہ"۔

کمالاں کو رونا آ گیا۔ کتنا دکھی ہے بے چارا بابا۔ ابھی چالیس برس کا بھی نہیں ہوا پر کیسا نچڑا ہوا سا ہے۔ دھنسے ہوئے گلے، کہیں دور ہٹی ہوئی آنکھیں جیسے کنویں میں گر پڑی ہوں۔ ذرا سی آمدنی میں تین جانوں کو سہارے ہے۔ ننگی گندی باتیں کرتا ہے تو کیا ہوا۔ نماز بھی پڑھے گا تو بیچے گا تو افیم کی گولیاں ہی، عبادت سے نصیبے بدلتے تو کیا گاؤں کے مولوی صاحب جیسا پرہیز گار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتا۔ بے چارا میرا بابا!۔۔۔ وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے کو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے دیکھتی رہی۔

اور شام کو کھانا کھاتے اچانک بڑھیا کا ایک نوالہ منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا اور وہ پیڑھی پر سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آ گئے۔ پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور چلایا "اماں، اماں"

"دادی، دادی" کمالاں چلائی

"بیٹی، بیٹی" بڑھیا کراہی درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ کچھ کرو ورنہ میں گئی۔ اے بیٹا میں گئی۔ قلنج لگتی ہے اے کسی سیانے کو بلواؤ۔ بیٹا کسی سیانے کو بلاؤ۔"

سرور نے بڑھیا کو اٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا ''قلنج ہے تو جیون بوٹی سے یوں چٹکی بجاتے میں آرام آ جائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے۔۔۔ جانے کہاں دیکھی ہے۔ دیکھی ضرور ہے۔ یہیں اسی گاؤں میں دیکھی ہے پر جانے کہاں دیکھی ہے۔''

''قبرستان میں؟'' بڑھیا نے مارے درد کے سمٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں اماں''۔

''مسجد میں؟'' کمالاں نے پوچھا۔

''نہیں بیٹی۔ وہاں تو کنواں ہے' میں جیون بوٹی کی بات کر رہا ہوں''۔

''تو پھر کہاں دیکھی ہے؟'' بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کیے جیسے اپنے سینے میں سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے'' جلدی سے یاد کرو ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی۔''

اچانک بڑھیا بولی'' سلطانے کے کھنڈر میں''۔

اور سرور نے تالی بجا دی'' جیوا اماں' کیا وقت پر یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے جیون بوٹی۔ میں ابھی لایا'' اور باہر جانے کے لیے اس نے پگڑی سر پر لپیٹنا شروع کر دی۔

بڑھیا کراہی'' تم میرے پاس رکو بیٹا۔ جانے تمہارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمال خاتون چلی جائے گی'' '' میں چلوں جاؤں گی بابا'' گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔

اور سرور بولا'' دیکھ بیٹا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے ایک چھوٹی سی کوٹھری کا۔ چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں آک اگ رہے ہیں۔ ان کے نیچے مولی ایسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بوٹی اگ رہی ہے۔ ایک پتہ بھی مل جائے تو اماں کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔''

''اچھا بابا میں بس پلک جھپکنے میں آئی''۔ کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا۔

سلطانے کے کھنڈر کے پاس اندھیرے میں ایک کتا رو رہا تھا۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اس نے پیٹ سے لگی ہوئی دم کو اٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی مگر صرف ''ٹیاؤں'' کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تک کمالاں بہت جوش سے چلی آ رہی تھی۔ کتے کے رونے اور بھاگنے کی آواز سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے اچانک دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دور کے جھینگروں کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ خود کمالاں نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم سادھ لیا اور گھٹتے ہوئے تہبند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی۔ آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اٹھے' خاموشی میں ان کی آواز معمول

سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی۔ پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھنڈ نے ہی لگی تھی کہ یکا یک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑ کھڑانے کی آواز آئی اور آک کے پیچھے سے ایک سایہ جیسے کھنڈر کی دیوار سے بھی سر نکالتا ہوا اٹھا اور آواز آئی ''آ گئیں میری جان'' چیخ جیسے کمالاں کے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک کر رہ گئی۔ ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گی اور آخر آج۔۔۔'' کمالاں اتنی قوت سے جست سی لگا کر کوٹھری کے باہر آ رہی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے بوکھلا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی۔ اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے وہ جانتی تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے اور قدموں کی چاپ لحہ بہ لحہ اس کے قریب آ رہی ہے لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور دیوار سے لگ لگ کر چلنے لگی۔ تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آ جانے کے باعث کہیں رک گیا تھا۔ ہانپتی ہوئی کمالاں دیوار کو ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے۔ گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی اور کیسے کراہے؟ کمالاں نے سوچا۔ بابا! اس کی پائنتی سے لگا رو رہا ہوگا اور جیون بوٹی کا انتظار کر رہا ہوگا اور۔۔۔۔ کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی۔ پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی۔

دادی کہہ رہی تھی ''نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے، قادرے کے بس میں آ گئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان کر دیا اور جو وہاں سے بھی پھڑ پھڑا کر بھاگتی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چکی ہیں۔ اب بھی چاند نہ ابھرا تو سمجھو رات ختم ہونے کی نہیں۔''

کمالاں کو جھر جھری آ گئی جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کمالو نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگی تو حرامزادی خود بھی مزے میں رہے گی پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں! بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر جانے کمبخت نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ گرمی تو اسے چھو بھی نہیں گئی۔''

''پر بیٹا'' دادی نے کہا ''تم نے اسے کھنڈر میں بھیجنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے۔''

کواڑوں کو جیسے کسی نے چیخ دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر کے بعد انہوں نے دیے کی مدھم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے اور بل کھانے لگی لیکن سرور تو بت بن چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سی غیر قدرتی آواز میں پوچھا ''بوٹی لائیں بیٹا؟''۔۔۔ کمالاں یوں اندر آئی جیسے بڑھیا کو دبوچنے کے لیے بڑھی اور سرور تک لرز گیا۔ مگر وہ دادی اور بابا

کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور بستر پر گر کر بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بیوقوفوں کی طرح دیکھتے رہے اور جب ادھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رکی تو ادھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی تو باہر آنگن میں نکل جاتی وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگی آتی۔ سونے کی کوشش کرتی' پھڑک کر اٹھ بیٹھتی اور پھر ٹہلنے لگتی اور جب صبح سرور اٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا ''اماں سچ مچ کہ جھوٹ موٹ۔۔۔۔۔؟''

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی ''تم یوں نہ پوچھو گے تو اور کون پوچھے گا بیٹا؟''

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا ''نہیں ماں! معاف کر دو تو کیا سچ مچ بیمار ہو؟''

بڑھیا نے کہا ''پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا! چھریاں چل رہی ہیں۔''

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا ''میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا۔''

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی اور روتی رہی' کافی دیر کے بعد وہ پکاری ''بیٹا کمال خاتون۔''

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ بری طرح زرد ہو رہا تھا۔ بال اجڑے اجڑے سے تھے اور ہونٹوں پر سفیدی سی جھلک رہی تھی۔

''بیٹا'' بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

''ایک پیالی چائے مل جائے گی؟'' اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوا لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں ''اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی؟'' وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا ''یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا کہ یہ سفوف بھی اچھا ہے پر ایک انگریزی ٹیکہ نکلا ہے بڑے زور کا۔ پسلی کا درد آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے کہتا ہے دوا تم منگوا لو ٹیکہ میں لگا دوں گا تمیں

چالیس لگتے ہیں"۔

لیکن اس تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکہ لانے کی بجائے بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی۔ باقی افیم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کیے' مگر شام کو جب یہ ڈاکٹر جو کمپاؤنڈری سے استعفیٰ دے کر ڈاکٹر بن کر آیا تھا' مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت کے کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو پٹخ پٹخ دیتی تھی۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ "تم لوگ اسی وقت سیانے بلواتے ہو جب زندگی کی آخری رمق تک بجھنے والی ہو' اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا' خدا کا نام یاد ہو تو دعا کرو اور بس۔ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے۔ قرآن مجید کے ختم کے لیے کسی کو بلوا سکتے ہو تو بلواؤ ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے"۔

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ اماں کی کھاٹ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال اِدھر اُدھر لٹک گئے۔ کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا اور سر پر کس کر گرہ لگا دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو۔ میں کسی موچی دھوبی سے قبر کے لیے کہہ آؤں۔ جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے تو کہتے ہیں قبر حساب نہیں لیتی"۔۔۔ اس نے ایک بار پھر آنسو پونچھے' پگڑی بھدے پن سے لپیٹی اور باہر جاتے ہوئے دروازہ یوں کھولا اور بھیڑا جیسے اسے مردے کے جاگ اٹھنے کا اندیشہ تھا۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد اس نے مری ہوئی دادی کی سمت ڈرتے ڈرتے ایک نظر ڈالی۔ نیم وا آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میلی زرد رنگت کو چراغ کی میلی زرد روشنی نے نمایاں کر دیا تھا۔ پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی کے لبوں میں حرکت ہوئی اور پپوٹے ذرا سے اوپر اٹھے ہیں۔ گھبرا کر وہ زمین کو دیکھنے لگی۔ پھر اٹھ کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ دادی کے ماتھے کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی کتنا ٹھنڈا تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورہ اخلاص پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا کہ دادی کے ہاتھ چادر کے نیچے ہلے ہیں۔ "دادی" وہ چیخ کی حد تک چلائی "بابا" وہ دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری۔ باہر گلیوں میں کتے

بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی پیڑھی رکھی تھی۔ ایکا ایکی اس پر ایک سایہ سا آ کر بیٹھ گیا۔ یہ بوڑھی دادی تھی۔ کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کیے کہ جھریوں میں سے سوکھے گارے کی قلمیں سی نکل کر گر پڑیں۔ وہ پسینے میں یوں شرابور ہو رہی تھی جیسے پگھلی جا رہی ہے۔ لپک کر اس نے دادی کے چہرے پر سے چادر نوچ لی۔۔۔ نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے کچھ ایسا لگا کہ دادی نے آنکھیں جھپکی ہیں "دادی!" وہ ایک بار پھر اسی شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سرور اس پر جھکا ہوا تھا "اٹھو میری بیٹی جاگو آنکھیں کھولو اری پگلی تجھے کیا ہوا تھا؟"

"میں ڈر گئی تھی بابا" اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ سامنے دادی کے مردہ جسم کے پاس مولوی صاحب بیٹھے سورۂ یاسین پڑھ رہے تھے' کمالاں نے جھپٹ کر دوپٹہ اوڑھا اور مودبانہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے پڑھتے پڑھتے اس کی طرف دیکھا مسکرائے اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی کی کھاٹ کی پرلی طرف مولوی صاحب کے مقابل بیٹھ گئی۔ انہوں نے اپنے ہونٹوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اسے کچھ پڑھنے کے لیے کہا اور وہ ایک سعادت مند بچی کی طرح سورہ اخلاص کا ورد کرنے لگی۔ پھر مولوی صاحب نے سرور کو بے فکر رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور دروازے کو اسی احتیاط سے کھول کر باہر چلا گیا۔

سرور ساری رات قبر اور کفن وغیرہ کے سلسلے میں بھٹکتا پھرا۔ دوسرے دن بڑھیا کو دفن کر کے گھر میں آیا تو آنگن میں موچیوں' جلاہوں کی چند عورتیں کمالاں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں چپکے سے کوٹھے میں چلا گیا' خوب خوب رویا اور پھر سو گیا۔ عورتیں چلی گئیں تو کمالاں کوٹھے میں آئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "بابا"۔۔۔ اور پھر جواب نہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑی' لیکن کھاٹ کی پٹی کے پاس جا کر رک گئی اور چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اب بس چیخنے ہی والی ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سرور کے ماتھے کو چھوا اور مسکرانے لگی۔ "بابا" وہ مارے خوشی کے پکار اٹھی۔ سرور نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"میں تو ڈر گئی تھی بابا!" کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟" سرور بولا۔

کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی "بابا"!

سرور بے اختیار رونے لگا اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھار کی طرح بہہ نکلے اور پھر وہ بڑی ملائم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "بیٹی! دیکھو مجھے معاف کر دو۔

میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں میں!" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے اور سر پیٹ لیا۔ "میں بڑا ذلیل' کتا خبیث' کمینہ ہوں کمالو! میں نے اپنی بیٹی کو ۔۔۔ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو میری بیٹی! میرا گلا گھونٹ دو۔" پھر اس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انہیں اپنی گردن پر رکھ دیا۔ "میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی! مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں کتنا کمینہ؛ سچ مچ کا کنجر۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہ سوجھا۔ بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اسے بہلا بہلا کر تھپکتی تو کیا اب وہ یہ کہتی کہ نہیں بابا! تم نے بہت اچھا کیا تم نے کون سی بری بات کی۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دباتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے پر سے ہاتھ اٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیئے۔ تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈ نکالا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورنے لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے کہیں بہت دور سے بولی "تمہیں تو بخار ہے بابا!"

"ہاں بیٹی!" وہ بولا "ادھر دونوں پسلیوں میں چبھن سی بھی ہے۔"

کمالاں سناٹے میں آ گئی۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک دادی میں بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ چہرے پر میلی میلی زردی کھنڈ گئی اور اسے بابا کی ٹھوڑی تلے سے ایک پٹی بھی گزرتی دکھائی دے گئی! وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی "نہیں بابا تم نہیں مرو گے۔ تم نہیں مرو گے بابا۔ میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی۔ نہیں بابا ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ نہیں!" وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے کہتا رہا "نہیں نہیں بیٹی! میں مروں گا نہیں۔ تم مجھے بخش دو تو میں جیوں گا۔ پھر جینے پر حق ہو گا میرا۔"

کمالاں کے سوجے سوجے ہونٹوں اور سرخ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چمٹ گئے تھے۔ وہ انہیں بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔

"بخش دو بیٹا!" سرور نے چادر میں سے ہاتھ نکالے اور انھیں جوڑ لیا۔

اور آنسوؤں میں نہائی کمالاں مسکرا دی۔

سرور کھاٹ پر اٹھ بیٹھا' اب میں نہیں مر سکتا بیٹی! تم ڈاکٹر کے پاس جا کر ذرا سا وہ سفوف تو لیتی آؤ ۔۔۔ کہنا پسلی کا درد ہے' دونوں طرف' ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب آدمی ہیں۔ جاؤ میری بیٹی! ۔۔۔ پر

جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھو مسکرا کر۔"

کمالاں پھر مسکرائی "یوں" اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر اوپر چھت کی طرف دیکھ کر بولا "الٰہی تیرا شکر ہے۔"

کمالاں نے باہر جا کر منہ دھویا اور ڈاکٹر کے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سفوف تو دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں پر جو مریض ٹیکا لگواتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ باپ کی زندگی چاہیے تو کہیں سے ٹیکا پیدا کرو سمجھیں؟"

"کتنے میں آئے گا ٹیکا؟" کمالاں نے پوچھا۔

"بس یہی کوئی چالیس پچاس میں۔" ڈاکٹر بولا "پنسلین نام ہے۔ قصبے میں مل جائے گا"

واپس گھر آ کر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے آنچ آنے لگی۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی۔

رات بھر بابا کے پاس بیٹھی رہی، سوئی بھی تو کھاٹ کی پٹی کے سہارے، سرور منتیں کرتا رہا کہ جا کر چارپائی پر سوئے مگر وہ رو دیتی اور بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا ہلا کر انکار کر دیتی۔

صبح ہونے تک سرور بے حال ہو چکا تھا۔ کمالاں ڈاکٹر سے تیسری خوراک لینے نکلی تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک ٹھٹک گئے۔ سوجی سوجی، سرخ سرخ آنکھیں، اجڑے بال، خشک ہونٹ جیسے کہیں سے پٹ کر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ سرور کی نبضیں دیکھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمالاں کو دیکھنے لگا۔ "تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے" وہ بڑے غصے سے بولا "ٹیکا لاؤ ٹیکا سمجھیں؟ اب کے ٹیکا لائے بغیر میرے پاس نہ آنا" اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور ہنسنے لگا "ٹیکا!" وہ بولا اور پھر کراہتے ہوئے سٹ گیا۔

اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے کھاٹ کے پائے کا سہارا لیے باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

دن ڈھلے وہ اٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آ گئی جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی وہ پھر اسی طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ٹیکا!" سرور پھر سے ہنسا "کہتا ہے ٹیکا لاؤ، ڈاکٹر بنا پھرتا ہے، ٹیکے بغیر ٹھیک کر دے تو مانوں۔ اور بیٹی

دیکھو میری طرف دیکھو میں مروں وروں گا نہیں۔"

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی بابا" کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ اچانک باہر چلی گئی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا اور وہ یوں بولی جیسے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے برس پڑے۔ "تم تو ہم سے دور دور رہتے ہو' ملتے ہی نہیں!"

ابراہیم جیسے ہوا میں **معلق** ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا "تمہارے حکم کا انتظار تھا۔"

"تو پھر آج ملو" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کہاں؟"

"میرے گھر ہی میں" پھر ذرا سا رک کر بولی "دادی تو مر گئی ہے نا۔"

"کب آؤں؟"

"بس لوگ سوتے آ جاؤ۔ میں گھڑیاں گنوں گی تمہارے لیے بے دھڑک آنا' بابا بیمار ہے' بے ہوش پڑا ہے۔"

ابراہیم کے تو جیسے پر لگ گئے' ادھر کمالاں بھی اڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ چائے کی پیالی سرور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکی تھی اور وہ "پانی پانی" پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پی کر وہ بڑے دکھ سے بولا "اتنی دیر تک مجھے اکیلا نہ چھوڑ دیا کرو بیٹی' ڈر لگتا ہے۔"

کمالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دابنے لگی اور جب اس پر غنودگی سی چھا گئی تو پنجوں کے بل چلتی ہوئی دوسری کوٹھری میں آئی اور وہاں چیتھڑوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر تکیے کی شکل پیدا کر لی۔ گدے پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا اور آنگن میں کھلتا ہوا دروازہ کھول کر وہاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی اور لوگ سوتے تک بیٹھی رہی۔

ابراہیم دبے پاؤں آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ قریب آ کر اس نے آہستہ سے کہا "کمالی!" "ایں" وہ چونکی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی "ارے تم آ گئے" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی۔

اور پھر سرور "پانی پانی" کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا۔ پھر رونے تک لگا اور ادھر بہت دیر کے بعد جب ابراہیم اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر آئی اور دروازے سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"پانی"! سرور دوسرے کوٹھے میں رویا۔

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا "اب چلیں پیاری!"

لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"پانی" سرور ادھر سے چلایا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ "کل پھر ملیں گے میری جان!"

اور آخر کمالاں بولی "کل تو خیر ملیں گے پر آج کی اجرت کہاں ہے؟"

"اجرت؟" ابراہیم غصے میں بولا "اجرت مانگتی ہے؟ عاشقی کی اجرت مانگتی ہے شرم نہیں آتی؟ آخر کنجری ہے نا، کنجری!"

اس نے کمالاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

بانو قدسیہ

مجازی خدا

ننھی بسم اللہ رات بھر سے بھوکی تھی۔

تابی نے جو بچی کو گود میں لیا تو ایک بار ہمک کر اس نے ماں کی چھاتیوں پر ہاتھ مارا اور بیچ سا دودھ چھل چھل رسنے لگا۔ اس وقت ننھی کو دودھ پلاتی تابی عجیب سی لگ رہی تھی جیسے پانچ کیوبک فٹ کے فریج میں کسی نے دال کی لبالب بھری ہانڈی رکھ دی ہو۔ انگیا کے بنگلے بانکڑی سے بنے تھے اور پان پر کرن کی جھالر تھی۔ بروکیڈ کی کٹوری پر ساری سیون صراحی دار موتیوں سے جگمگا رہی تھی۔ ململ کے کرتے تلے ایسی جگر جگر کرتی انگیا بھی عجیب سی لگ رہی تھی۔ ایک تو ویسے ہی یوں پورے میک اپ کے ساتھ تابی کا دودھ پلانا اچنبھے کی بات تھی لیکن یہ کس کو گمان تھا کہ تابی دودھ پلانے سے پہلے وضو بھی کرے گی؟ آگے نہ پیچھے کبھی وضو کا پانی کہنیوں تک گیا ہی نہ تھا۔ یہ اچانک کایا پلٹ ہوئی تو کیسے؟

تالڑاں سے تابی لوٹی تو گلی میں پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کے کانوں میں بسو کی آواز آئی۔ خدا جانے یہ عرس کی کرامت تھی کہ بسو کی آواز کا جادو تابی کے بھانویں صور اسرافیل پھونکی گئی۔ اپنے اعمال نامے دکھانے کا وقت آ پہنچا۔ وہ تھر تھر کانپتی اوپر پہنچی۔ بچی نہایت ہی بے سرے پن سے پورا گلا پھاڑے چیخ رہی تھی۔ کپڑے تبدیل کرنے کا وقت نہ تھا۔ ساڑھی اتارتے ہی اس نے جلدی سے ململ کا کرتا پیٹی کوٹ پہ پہن لیا اور وضو کرنے بھاگ گئی۔

اس سے پہلے تو تابی نے کبھی وضو کر کے بچی کو دودھ نہ پلایا تھا۔ پھر یہ کایا پلٹ ہوئی تو کیسے؟

وہ جھلنگی چارپائی پر پیٹی کوٹ کرتے میں ملبوس بڑے پیار سے بچی کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر وہی ملکوتی معصومیت تھی جو مائیکل اینجلو کی میڈونا کے چہرے پر ہوا کرتی ہے۔ سامنے اچاری آموں سے لدا ٹرے اور بالٹی بھر پیوسی پڑی تھی۔ یہ وقت تخلیے کا تھا لیکن نادر بغیر کھانسے' بنا دستک دیئے مستول کی طرح آ کھڑا ہوا۔

دراصل رات کو تابی کا ارادہ تالڑاں جانے کا نہ تھا۔ ننھی بسم اللہ سے اسے واقعی بہت پیار تھا اور وہ

اسے ساری رات چھوڑنے کے لیے رضامند نہ تھی۔ کچھ اس کی اپنی طبیعت بھی اداس تھی۔ لیکن نادر شاہ کی لچھے دار باتوں کے دام میں وہ آ ہی گئی۔ کئی سالوں سے وہ شریف شاہ کے عرس پر مجرا کرنے جا رہی تھی۔ اور اسے ایسا لگتا تھا جیسے یہ گھر بار، بسم اللہ، عزت، دولت سب شاہ جی کی دعاؤں کے طفیل ہو۔

نادر نے ٹسر کا فیروزی تہمد باندھ رکھا تھا۔ گلے میں موتیے کا لمبا سا ہار تھا۔ وہ پردہ اٹھائے سیمرغ بنا کچھ دیر کھڑا رہا۔ کمرے میں رات بھر کی گرمی فل سپیڈ پنکھے کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ تابی کو نادر کی آمد کا احساس اس وقت ہوا جب وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ تابی کے پاس بیٹھ گیا۔ سارے کمرے میں نادر کی مردانہ خوشبو پھیل گئی تابی نے کرتے سے بچی کا منہ ڈھانپ لیا اور نادر کی جانب پیٹھ کر لی۔ نہ جانے آج اس سفلے پر تابی کو کیوں شدید غصہ آ گیا۔ تابی کو یوں بچی کا منہ ڈھانپتے دیکھ کر نادر بڑے کھردرے پن سے ہنسنے لگا۔

نہ جانے یہ شریف شاہ کے عرس کی برکت تھی؟

خدا جانے یہ نادر کے نا ملائم قہقہے کا اثر تھا؟

کون کہہ سکتا ہے کہ ننھی بسو کے دودھ میں بھیگے ہونٹ تھے جنہیں دیکھ کر تابی کو اپنے آپ سے شدید نفرت ہو گئی۔

نادر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تابی سیخ پر لگے کباب کی طرح بھن رہی ہے۔ کتھئی رنگ کے ہاتھ بڑھا کر انگیا کے پچھواڑ کساوٹ کھولی اور آہستہ آہستہ ڈوری یوں کھولنے لگا جیسے تلے دانی ڈھیلی کر رہا ہو۔

''دودھ پینے دو بچی کو۔۔ رات بھر سے بھوکی ہے۔''

''ہم بھی رات بھر کے بھوکے ہیں'' وہ بے شرمی سے ہنسنے لگا۔

اپنے خلاف، نادر کے خلاف اور نہ جانے کس کس کے خلاف لمحہ بھر میں دیوار چین تعمیر ہو گئی۔ نعل در آتش تابی نے کیوٹکس لگی انگلیوں کا بھرپور ہاتھ اس زناٹے سے نادر کے مارا کہ وہ اپنا ٹسر کا تہمد سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

بات کیا ہے؟'' اس نے خفت اور غصے کے ملے جلے جذبات سے پوچھا۔

''کوئی بات نہیں ہے۔ بس جاؤ اور پھر کبھی نہ آنا''

''نشہ تو نہیں ہو گیا تجھے؟

''ہو گیا ہے تو جا!''

''دیکھ لے پچھتائے گی۔ شہر کے سارے دل پھینک میری مٹھی میں ہیں۔'' نادر نے بالوں بھری مٹھی اسے دکھا کر کہا۔

''بھاڑ میں جائیں تیرے دل پھینک اور تو!''

نادر نفرین بھرے قہقہے لگا تا سیڑھیاں اتر گیا۔

اس وقت تک نہ تو تابی کو علم تھا اور نہ ہی نادر کو شبہ ہوا تھا کہ تابی اپنی پچھلی زندگی کو تیاگ رہی ہے لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے تابی کے کچے زخم پر کھرنڈ نہ بندھا بلکہ اور دن پر دن پیپ پڑنے لگی۔ جو بات یونہی دل کو ڈس گئی تھی اب پتہ خانگی بنا کر اس نے دل کے سیف میں رکھ لی۔

نادر کا خیال تھا کہ تابی گیلا بارود ہے چند دن فراق کی کڑی دھوپ میں سینکی گئی تو آپی سلگ اٹھے گی۔ کوئی کورا پنڈا تو تھا ہی نہیں کہ مرد کی شناسائی کے بغیر رہ سکتا۔ لیکن جب کافی دن گزر گئے اور تابی کا کوئی پیغام نہ ملا تو وہ خود ہی کچھ شرمندہ کچھ مجوب، کچھ مشتاق سا کوٹھے پر گیا۔

تابی کو دیکھ کر نادر کا دل تڑاق کھا گیا نہ بالوں میں فتح پیچ تھے نہ کپڑوں میں دھنک کی سی کیفیت تھی۔ نقلی اصلی سب لٹیں غائب۔ رانڈوں کی طرح بال کھینچ کر چونڈا کسا ہوا نہ وہ پھندنے دار سینڈلیں نہ ناخنوں پر رنگ برنگی کیونکس۔ نہ کانوں میں پتے بالیاں نہ ہاتھوں میں آرسی انگوٹھیاں نہ گلے میں رانی ہار ہاتھ کان سے ننگی بوچی۔۔۔ تابی کی جگہ وہ ایک خصی بکرا نظر آتی تھی۔

نادر نے بہت سر مارا۔ منتیں کیں، سمجھایا، واسطے دیئے، دھمکیاں داغیں۔ لیکن اس کی باتیں سن کر وہ اور بھی بپھر گئی۔ تابی کو ایسی ضد چڑھی تھی کہ قسم کھالی برتن مانجھنے منظور، روڑی کوٹنے کا پیشہ سر آنکھوں پر، جھاڑو بہارو پھیرنا قبول لیکن پھر حرامکاری کا دھندا نہ کرے گی۔ ادھر تابی نے سونا سوگند کھائی ادھر سارے ہیرا منڈی میں جیسے تھوتھی باتوں کے غبار سے اڑنے لگے۔ بنگلے کی خورشید جہاں نے چوری چوری دیگ چڑھائی اور در بار بھجوادی۔ عرصے سے اس کے سارے گاہک کسی چور راستے سے تابی کے کوٹھے ایسے چڑھتے کہ پھر وہیں کے ہو رہتے۔ چوکی والی نازو نے برقعہ اوڑھا اور محلے محلے وہ توپخے جوڑتی پھری کہ افواہ کو جیٹ طیارہ کی اڑان لگ گئی۔۔۔۔۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔ کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔۔۔۔!

پنکھے کی تیز ہوا میں جاپانی عورت والا کیلنڈر آنچل کی طرح لہرا رہا تھا۔

حمیدہ کے گریبان میں منہ دیئے ننھا سا جاوید چسر چسر دودھ پیے جا رہا تھا۔ حمیدہ کی گردن پر پسینے کے قطرے سونف کے گچھوں کی طرح ابھر آئے تھے۔ اس نے جاوید کی پیٹھ میں دھموکا مار کر اسے پرے کیا اور شیخ جی کے ہاتھ پر انگلی بجا کر بولی۔ ''سنئے ذرا۔۔۔۔! اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں۔ ڈاکٹر سے ضرور کوئی دوا لے کر آئیں کل۔۔''

''اتنے سے بچے کے پیٹ میں کیڑے! ناصر اور جمیلہ کے پیٹ میں ہوں تو ہوں۔''

''سارا دن میری جان نہیں چھوڑتا۔ نہ دن کو آرام ہے نہ رات کو اس کے پیٹ میں کیڑے ہیں ورنہ رات کو تو سو مر جاتا!''

جاوید بڑی ڈھٹائی سے اب حمیدہ کی پشت سے چمٹا ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کی چوٹی کو چوس ہو رہا تھا۔

''میں تو جب تک اس کے پاس لیٹی رہوں گی۔ یہ میری بوٹیاں نوچتا رہے گا۔''

''ادھر آ جاؤ میرے پلنگ پر۔۔۔۔'' شیخ جی نے لجاجت سے التجا کی۔

لیکن حمیدہ اٹھ کر ناصر کے ساتھ لیٹ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے شیخ جی کے تھل تھل وجود سے گھن آتی تھی۔ گہری نیند میں جب ان کا منہ کھل جاتا اور خراٹوں کی ڈاک بیٹھ جاتی تو حمیدہ کو ان سے بڑی نفرت پیدا ہو جاتی تو قدرت کی ستم ظریفی سے حمیدہ کے نان ونفقہ کے کفیل نہ تھے ورنہ حمیدہ کبھی اس پلنگ کا کنارہ بھی نہ چھوتی۔ اللہ ماں! باپ نے بھی کیا دیکھ کر بیاہ دیا تھا۔

جب حمیدہ ناصر کے پلنگ پر چلی گئی تو ننھے جاوید نے پہلے زقند بھری، پھر چیخ ماری اور تھوڑی دیر منہ کھول کر روتا رہا۔ شیخ جی نے اپنا بھاری ہاتھ اس کی پشت پر رکھ دیا اور بڑی دیر تک تھپکتے رہے۔ جب نیند کا پورا غلبہ ہو گیا تو جاوید لحاف کے کونے پوستا آہستہ آہستہ سو گیا۔

ناصر کے ساتھ سر جوڑ کر حمیدہ بولی۔۔۔۔''اس بار پھر آپ ہمیں شریف شاہ کے عرس پر نہیں لے گئے۔۔۔۔ ہاں!''

''جاوید چھوٹا ہے اگلے سال سہی۔''

''ہر سال آپ یہی کہتے ہیں۔''

''خدا قسم صرف جاوید کی وجہ سے نہ لے گیا ورنہ اس بار تو شاہ صاحب بھی تمہارا پوچھتے تھے۔''

عرس کی ایک ایک بات ایک ایک لمحہ شیخ جی کی نظروں میں گھومنے لگا۔ بازو اٹھا اٹھا کر گاتی اور گاتے ہوئے پلٹ پلٹ کر دیکھتی نیا ر تابی بے طور انہیں یاد آنے لگی۔ ایسی دبنگ منہ زور جوانی۔۔۔۔ اللہ اللہ اللہ!

تابی کو پیشہ کرتے صرف پانچ سال ہوئے تھے لیکن اس تھوڑے سے عرصے میں ایک لڑکیہ قیامت کی شہرت مہمیز کھائے ہوئے گھوڑے کی طرح بہت دور نکل چکی تھی۔ شہرت کو چھوڑیئے وہ تو ہوئی سو ہوئی لیکن

اتنی نامور طوائف نے جب پیشہ چھوڑنے کی ٹھانی تو کوئی بھی عاشق منصۂ شہود پر نہ ابھرا جو اس کے ماتھے کا سیس پھول بن کر باعزت زندگی گزارنے کے لیے ساتھ دیتا۔ ہولے ہولے جہاں پہلے مجرا بجتا تھا اب وہاں ہالا پڑ گیا۔ سارا دن ننھی بسو کو گود میں لیے پہاڑ سے دن کاٹنے لگی۔ کہاں تو شام کے وقت دیدار کے طالب پرے سے پرے ملائے بیٹھے ہوتے تھے کہاں اب بیٹھک میں سوائے گاؤ تکیوں کے اور کوئی بیٹھنے والا نہ رہا۔

اپنی بستی والیوں سے قطع تعلق کرنے کے بعد کچھ روز کو یہ سکون ملا کہ نت نئے قصوں اور بھانت بھانت کی نصیحتوں سے چھٹکارا ہو گیا لیکن جب تابی مکمل ٹاپو بن گئی تو دن کی بے مصرف طوالت سے اس کا جی گھبرانے لگا۔ جب سے تابی نے بیچ پڑھنا چھوڑ دیا تھا آپو نے چپ سادھ لی تھی۔ اب دونوں میں محض رسمی سی گفتگو ہوتی اور تابی کے دل پر ہر بار چوٹ سی پڑتی۔ اس کا جی کہتا کہ لو صاحب اچھی نیکی کی راہ پکڑی سب نے ٹکسال باہر کر دیا کہاں تو لوگ آنکھوں پر بٹھاتے تھے کہاں اب منہ پر مکھی تک نہیں جھولتی۔

جس دن خورشید علی پروانہ اس سے ملنے آیا وہ اداسی اور خاموشی کے دباؤ سے مجبور ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے اس فعل کی تعریف کرے کوئی تو کہے شاباش تابی چاہے بدیر یہ راہ اختیار کی لیکن جزاک اللہ بہت خوب کیا۔ پروانہ صاحب زندگی میں بڑی اونچی باتیں کرتے تھے۔ تابی ان سے داد تحسین وصول کرنے کے لیے نیچے اتری اور بیٹھک میں انہیں بلا لیا۔ پروانہ اس کے کوٹھے پر ہمیشہ مہمان خصوصی بن کر آتا تھا رخصتی کے وقت دامن چوم کر خدا حافظ کہتا۔ اس نے طوائف کے عنوان سے تابی پر ایک سہ غزلہ بھی لکھا تھا جس میں اس نے طوائف کو ہمالہ کی برف' سیپ کے موتی' اچھوتے خواب اور بہشت کی حور سے تشبیہہ دی تھی۔ اس سہ غزلہ کے چیدہ چیدہ اشعار وہ عموماً مجروں میں گاتی بھی رہی تھی اور پروانہ صاحب اسے اپنے لیے باعث عزت بھی سمجھتے رہے تھے۔ پروانہ صاحب کو دیکھ کر تابی کا دل رقت' انفعال اور دکھ سے بھر گیا۔ اسے اپنے آپ پر اس شدت سے ترس آیا کہ سلام کا جواب دیتے ہی اس نے پروانہ صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑا کر بولی۔ ''پروانہ صاحب مجھے بچا لیجیے۔۔۔ خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے۔۔۔۔''

پروانہ صاحب آدمی پلپلے تھے۔ تابی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے بولے ''صاحب ہم آپ کو کیا بچائیں گے۔ کیا پدی کیا پدی کا شوربا؟'' تابی پر نیک باعزت بیوی بننے کا بھوت سوار تھا۔ اپنے مدعا کو نلائی صورت میں پیش کرنے کا صبر کہاں' جھٹ کہہ بیٹھی۔ ''پروانہ صاحب آپ مجھ سے نکاح کر لیجیے۔ خدا قسم حج اکبر کا ثواب ہوگا۔''

پروانہ صاحب کنی کھا کر دور جا بیٹھے اور گاؤ تکیے کے پھندنے ادھیڑنے لگے جب بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھے کنیاتے رہے اور منہ سے کوئی بات نہ نکلی تو تابی ایک بار پھر ہمت کر کے ان کے پاس جا بیٹھی اور

بڑی چارگی سے بولی۔۔۔۔۔" کیوں پروانہ صاحب' میری بات کا کیا جواب ہے؟۔۔۔۔۔"

کہاں تو چپ چاپ بیٹھے پھند نے ادھیڑ رہے تھے اور کہاں یک دم کسی منبر سے پھٹ پڑے۔

" کاش تم نے صبر کیا ہوتا۔ یہی بات میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ لیکن تم نے سب کچھ چھوڑا' کسبیوں والی بے شرمی نہ چھوڑی' تف ہے ایسی عورت پر جو زیور حیا سے آراستہ نہ ہو۔۔۔۔"

تابی کو اپنی جلد بازی اور بے حیائی پر بہت غصہ آیا۔ تلملا کر بولی۔۔" کیوں پروانہ صاحب میں نے کونسی بے شرمی کی ہے بھلا؟ آپ سے نکاح کی درخواست کی ہے کوئی رات گزارنے کے پیسے تو طلب نہیں کیے۔"

" اور یوں نکاح کا خواستگار ہونا کیا یہ بے شرمی نہیں بے حیائی نہیں۔۔۔استغفر اللہ!۔۔۔۔۔"

پہلے ہی چوہے پر جو گال کاٹا گیا تو پھر تابی میں کسی سے عرض مدعا کی ہمت ہی باقی نہ رہی۔ آپو سے بول چال پہلے ہی بند تھی۔ محلے والیوں نے اسے اصل کی نہ پاکر ویسے ہی ترک کر رکھا تھا۔ نادر سے معاملہ یوں ہی چوپٹ ہو چکا تھا۔ زندگی گرمیوں کی دوپہر ہوگئی۔ اٹھتے بیٹھتے خیال آتا کہ یہ پارسائی کی چادر کب تک گرمی دے گی' اگر کسی کا ساتھ نہ ملا تو ٹھٹھر ٹھٹھر کر جوانی کی سرد رات کب تک کٹے گی؟ پھر بچی پر نگاہ پڑتی تو دل دھک سے رہ جاتا۔ اللہ میں تو پارسا بن گئی یہ بن باپ کی بچی کس کی کہلائے گی۔ جوان ہو کر کہاں جائے گی کہاں سے کھائے گی؟ خود میری زندگی کا کیا بنے گا؟ جس رفتار سے وہ بنک کے چک کاٹ کاٹ کر دے رہی تھی اس رفتار سے تو سارا اثاثہ دنوں کی کھیل تھا۔

اللہ آمدنی کی صورت نہیں اور اخراجات حمل کی صورت ہر دن چڑھے دونے ہوئے جاتے ہیں۔

ایسی ہی باتوں نے جب تابی کی زندگی کو کرکرا کر دیا تو ایک شام وہ اٹھی اپنا نیلا پیڈ نکالا' اس پر فرانسیسی خوشبو چھڑکی نادر کو پشیمانی بھرا محبت نامہ لکھا اور نیچے اتری۔ حویلی نما مکان کی نچلی منزل میں تین دکانیں تھیں' ایک کمرہ تابی نے طبلچی فتح دین کو دے رکھا تھا۔ فتح دین طبلہ بجانے کے علاوہ سودا سلف لانے اور گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے کام بھی آتا تھا۔ جب وہ فتح دین کو خط پکڑانے جا رہی تھی تو سامنے شیخ جی نظر آ گئے۔

تابی نے پچھلی مروت کے مارے سلام کو ہاتھ اٹھایا۔ شیخ جی مسکراتے مسکراتے آگے آ گئے۔ اخلاقی جرات کی تابی میں کمی تھی ورنہ انہیں ڈیوڑھی سے نکال دیتی۔ ہنس کر ایک طرف ہوگئی اور شیخ جی اندر آ گئے۔

اور۔۔۔تابی کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

حمیدہ نے دھمو کا مار کر جاوید کو یوں دھکا دیا کہ پھوہے برابر بچہ نالی میں گرتے گرتے بچا۔ خالہ اصغری نے ناک پر انگلی رکھ کر اسے فوراً ٹانسا۔۔۔۔"کیوں اپنا غصہ اس بے زبان پر نکالتی ہو۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس بدبخت تابی کی آنکھیں نوچ لیتی۔ پر تم کو تو تمہاری نیکی نے مارا۔۔۔ہاں"

حمیدہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تلیٹی میں بڑھنے والی چھاؤں کی طرح آ کر بیٹھ گئی۔ خالہ اصغری نے پیڑھی کو چوتڑوں سے گھسیٹ کر اس کے قریب کر لیا اور رازداری سے بولیں "بھئی تم نام خدا معصوم ہو دین دار ہو اچھے خاندان کی ہو تم کو مردہتھیا نے کہاں آ کیں۔ یہ طوائفیں تو سارے موئی تنتر جانتی ہیں۔ جانے کیا تعویذ گنڈا کر دیا ہے اس چلتر باز نے شیخ جی پر!"

تلیٹی کی چھاؤں ساون کے بادلوں میں بدل گئی اور بوندا باندی ہونے لگی۔

"یہ کام تو سفلی ہیں، سفلی کام انہی لوگوں کو آتے ہیں۔ گھر کی شریف بیبیاں ان باتوں کو کیا جانیں۔ لیکن بھئی میں ضرور کہوں گی خبردار رہو وہ نہ ہو شیخ جی نکاح ہی پڑھوا لیں اس کٹنی کے ساتھ!"

حمیدہ دانتوں میں تنکا لیے نکھری بیٹھی تھی۔ نکاح کے نام پر کسمسائی۔ ایک روز شیخ جی کا اس سے بھی نکاح ہوا تھا۔ آج بھی اس دن کے تصور سے اسے ابکائیاں سی آنے لگیں۔ اللہ اسے تو پہلے دن سے شیخ جی برے لگے تھے موٹے سے، بھدے سے، ازبک سے! کہیں جوان سے رزق کی ڈوری نہ بندھی ہوتی تو، لیکن اب تو بندھی تھی اسی لیے وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔"اللہ نہ کرے خالہ جو کہیں نکاح ہی پڑھوا لیا تو پھر میں یہاں کیوں رہوں گی؟"

خالہ اصغری سے عطر پھلیل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ کانوں میں موتیا کے پھول۔ ہونٹوں پر لاکھا رنگ دنداسے کی رنگت۔ بڑی طرحداری سے کلیوں کا ہلکا ریشمی برقعہ اٹھا کر بولیں۔"تمہاری رہتی ہے جوتی! ان کو کسی پیاری ہے تو پھر تم کیوں دین ہاتھ سے جانے دو۔ کل کو اس چنڈالنی کی اولاد تمہاری اولاد کی بہن بھائی ہی تو کہلائے گی۔"

برستے بادلوں میں سے بجلی کڑکی۔۔۔۔"ہائے اللہ نہ کرے، ہائے اللہ نہ کرے توبہ خالہ جان منہ سے کچھ تو بھلی بات نکالا کرو۔۔۔۔"

"بھئی میں تو کشمیری بازار جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ کلیجہ پھٹا جا رہا تھا تمہارے دکھ سے، دل میں سوچا حمیدہ کو ملتی جاؤں، کہو کچھ منگوانا تو نہیں کشمیری بازار سے؟"

خالہ اصغری گئیں تو پھوپھی جمال آرا آ گئیں۔

دو گھنٹے وہ بیٹھی باز پرس کرتی رہیں اور حمیدہ تل نظری بنی گم سم بیٹھی رہی۔ دراصل یوں تو شیخ جی

سے ہیرامنڈی کا تعلق پرانا تھا۔ لیکن اس رابطے کو سوائے حمیدہ کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ بلکہ حمیدہ کو تو الٹا سکھ تھا۔ گند سنبھالنے کو کوٹھے والیاں اور سکھ پانے کو حمیدہ۔۔۔۔ لیکن کچھ عرصے سے وہ تابی کے ہاں بڑے تواتر سے آنے جانے لگے تھے۔ جیسے تیز گام وقت مقررہ پر آتی ہے۔ ادھر دودھ والے کا ریڑھا گلی میں داخل ہوتا ادھر شیخ جی سیاہ اچکن، جناح کیپ، پشاوری چپل پہنے نکڑ پر پہنچتے۔ دودھ والا سلام کرتا۔ ادھر سے سر کے اشارے سے جواب ملتا علیک سلیک ہوتی۔ لیکن اتنی صبح وہ کدھر سے آتے ہیں اس بات کا بھید کچھ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ لوگوں نے بہت جلد خطوط وحدانی میں چھپے ہوئے راز کو پا لیا۔ بات کا نکلنا تھا کہ حمیدہ کے لیے ہمدردی کا ایک انوکھا باب کھل گیا۔ ہائے ہائے تف تف بیچاری ماری گئی، اوئی اللہ ہائے توبہ نوج۔۔۔۔ کی بوچھاڑ سے حمیدہ کے دل کا آنگن بالکل بھیگ گیا۔

سانپ تو نکل گیا مگر راستہ برا پڑ گیا۔ تابی نے بازارِ حسن بھی چھوڑا اور شیخ صاحب کی بیوی بھی نہ بن سکی۔ بیٹھے بیٹھے جی میں خیال آتا کہ وہ نہ ہو سو جوتیاں بھی کھانا پڑیں اور سو پیازیں بھی زہر مار کرنا ہوں۔

شیخ جی چالیس کے پیٹے میں تھے اور تابی کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ تھی ایک تو عمر میں بیس برس کا فرق تھا۔ دوسرے شیخ کی صحت بالو کا ڈھیر تھی۔ تو تھمبو کر کے گھر بناتے ادھر دو بوند پانی کے پڑتے اور ارارا ارادھم ساری عمارت زمین پر۔ چھینک کیا آتی سارا سینہ بلغمی ہو جاتا۔ ذرا سی سردی پڑتی اور جوڑ جوڑ میں ورم آ جاتا۔ بند بند دکھنے لگتا۔ کبھی سانس اکھڑا ہوا ہے کبھی نسیں کھینچی چلی جاتی ہیں کاٹھی اچھی تھی شکل وصورت بھی بھولی بھالی تھی پر ایسے تناور درخت کو اندر ہی اندر دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ تال مکھانے جیسی رنگت اور عناب کے ہونٹوں والی تابی ان کی پوتی لگتی۔

عجیب سی بات تھی کہ نہ تو شیخ جی کی صحت پر تابی کو کوئی اعتراض تھا نہ ان کی عمر پر۔۔۔۔ اسے تو الٹا یہی ان کی خوبیاں لگتی تھیں۔ ایسے بیمار شخص کو کسی ساتھی کی ضرورت تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ شیخ جی تابی کو ساتھی تو بنائے ہوئے تھے پر نکاح کی بات دو سال سے کھٹائی میں پڑی تھی۔ نکاح کا وعدہ تو شیخ صاحب نے بڑی فراخدلی سے کیا تھا لیکن آج کل کرتے دو سال بیت گئے۔ کبھی تابی کے منہ سے نکاح کا نام سن لیتے تو فوراً کھوں کھوں کرنے لگتے۔ فوراً یا تو سردی لگ جاتی یا جوڑوں کا درد ابھر آتا۔

شیخ جی کچھ ایسے بدنیت بھی نہ تھے پر فی الحال اپنے آپ کو پابند بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہر طرح سے تابی کا خیال رکھتے۔ ننھی بسو سے باپ کی سی محبت برتتے۔ خرچ اخراجات کے وہی کفیل تھے۔ پر جس کو مفت دودھ ملے وہ بھینس کا جھنجھٹ کیوں پالے؟ ادھر تابی کو کھونٹے سے بندھنے کا ایسا سودا ہوا تھا کہ دن

رات یہی دکھ کھائے جاتا کہ یہ زندگی پہلے سے بھی پلید ہے۔ رہ رہ کے سوچتی کہ شیخ جی کے ٹکڑوں پر پلنے سے تو بہتر تھا کہ اپنی جوانی پر اعتبار کیا ہوتا۔ وادی سم وادی سروں کی سمجھ تھی۔ گلے میں قدرتی سرتیاں بھری تھیں شکل وصورت بھی کشمیرنوں جیسی گوری چٹی۔۔۔۔ کچھ دیر اور لیلا وتی بنی رہتی تو کم از کم کچھ اثاثہ ہی جمع ہو جاتا۔ پھر یہ اطمینان ہوتا کہ جو ظاہر ہے وہی باطن۔۔۔ جیسی باتیں ہیں ویسے ہی اعمال۔

بیچاری تابی کی تو وہی حالت ہو چکی تھی کہ کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باؤلا کتا کھائے۔ ادھر شیخ جی سے اسے ستی ساوتری جیسی محبت ہو چکی تھی۔ شیخ جی کو دیکھ کر سارے پاپ کٹ جاتے' سارے گلے بھول جاتے لیکن جب اکیلی ہوتی تو ضمیر ڈستا یوں داشتہ بنی رہنا اس کے ضمیر کے منافی تھا ادھر آپو سارا دن اسے طعنوں سے گانستی رہتیں۔ اس رسہ کشی کو تابی اندر ہی اندر برداشت کرتی رہی۔ لیکن ایک روز اس کا کلیجہ شق ہو گیا۔

اس روز تابی کو ملہلا کر بخار چڑھا۔

بسو ماں کو پلنگ پر بے سدھ لیٹے دیکھ کر بات بے بات ضد کرنے لگی۔ کبھی یہ دو کبھی وہ لے دو۔ نوکرانی بل بل باہر لے جاتی لیکن ہر بار بسو کہتی۔ ممیں ممیں ممیں۔۔۔ آخر پتہ چلا کہ کہیں ہمسائے میں نئی گڑیا دیکھ لی ہے کسی کی وہ مانگتی ہے۔ شیخ صاحب تابی کی کلائی پکڑے کرسی پر بیٹھے تھے تھک ہار کر تابی بولی ۔۔۔'' اللہ! شیخ جی انارکلی لے جائیے اور ویسی گڑیا دلوا دیجیے۔ اس کا رونا سن سن کر تو سر پھٹنے لگا ہے۔''

انارکلی بازار کا سنتے ہی بسو لپک کر شیخ جی کے کندھے سے چمٹ گئی اور تب تک چمٹی رہی جب تک گال پر کالر کی لکیریں نہ پڑ گئیں۔ تابی تو حکم لگا کر نچنت ہو گئی لیکن شیخ جی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تابی یا بسو کو لے کر وہ آج تک باہر نہ گئے تھے۔ کھنگار کھنگار کر بہانے بناتے رہے۔ کبھی کہتے اس حال میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ کبھی کہتے اب تو شام ہو رہی ہے۔ ابھی بچی سو جائے گی۔ شیخ جی نے بہت پینترے مارے مگر تابی کو آج بسم اللہ کی ضد بہت پیاری تھی۔ بال ہٹ میں تریا ہٹ بھی شامل ہو گئی۔

بخار میں تپی ہوئی آنکھیں کھول کر تابی نے پوچھا'' ہیں بات کیا ہے آپ بچی کو لے جاتے کیوں نہیں؟۔۔۔۔''

پوکھر کے نتھرے پانیوں میں انگارے دہکتے دیکھ کر شیخ جی بدک گئے اور اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلنے لگے۔

'' آپ سچ سچ اصلی وجہ بتا دیں شیخ صاحب ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔''

شیخ صاحب کو سچ بولنے کی عادت نہ تھی مگر تابی کے مزاج سے بھی خوب واقف تھے۔ سہتے سہتے

لہجے میں بولے۔ ”بھلا میں اسے کیسے انار کلی لے جاؤں؟ کوئی واقف ہی مل گیا اگر؟ ساری بات کھل جائے گی۔۔۔۔۔“

اب تک تابی نے عطر کے پھوئے کی طرح شیخ جی کے ساتھ محض خوشبو بھری باتیں کی تھیں یہ جواب سنتے ہی وہ کٹ گئی۔ کچھ بخار سے تمتمائی بیٹھی تھی کچھ غصے نے آنچ دی شعلہ جوالا بن کر پلنگ سے نکل آئی۔

شیخ جی اس بپھری ہوئی پلنگ زادی کو دیکھ کر دس قدم پیچھے ہٹ گئے اور کھڑکی کے شیشے کو ٹنکا ٹنکا کر بینڈ بجانے لگے۔ ان کا خیال تھا ننھی بسو کو یوں بہلاتے دیکھ کر تابی کا دل پسیج جائے گا۔ لیکن جوار بھاٹا بڑھا چلا آ رہا تھا۔

”کیا بات کھل جائے گی شیخ جی؟۔۔۔۔۔“

شیخ جی نے سنی ان سنی کر دی اور شادو کو گانا سنانے لگے۔

”میری طرف دیکھیے شیخ صاحب میری طرف۔۔۔۔“

”تم کو بخار ہے خواہ مخواہ بستر سے نکل آئی ہو۔۔۔۔۔۔“

”آپ بخار و خار رہنے دیجیے۔ ایسی ہمدردیاں بہت ہو چکیں۔ میری طرف دیکھیے۔“

بڑے تردد سے شیخ جی نے تابی سے نظریں ملائیں۔

”آپ کا بسم اللہ سے رشتہ کیا ہے؟۔۔۔“ تابی ترشول کی طرح تنی کھڑی تھی۔

”بیٹی ہے۔۔۔ کمال ہے یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے!“

تابی غصے میں کانپ رہی تھی سنگار میز کا سہارا لے کر بولی۔ ”اور مجھ سے آپ کا رشتہ کیا ہے شیخ صاحب؟“

”یہ آج تمہارے سر پر سنیچر کیوں سوار ہو گیا ہے۔۔۔؟“ شیخ صاحب اصل موضوع پر چھپن جمائے رکھنا چاہتے تھے۔

”میرا آپ کا رشتہ کیا ہے؟۔۔۔۔“ تابی اب ان کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔۔۔۔“

”آپ کے نزدیک تو بالکل اہم بات نہیں لیکن میری تو جان پر بن آئی ہے۔“

تابی چیخ کر بولی۔

”میں۔۔۔ تم۔۔۔ میری بیوی ہو تا بندہ! آج تمہیں ہو کیا گیا ہے خدا کے لیے لیٹ جاؤ ہوا

لگ جائے گی۔"

چراغ پا تابی بولی۔۔۔"بیوی تو ہوں شیخ صاحب لیکن بغیر نکاح نامے کے۔۔میں نے تو کسبی پن چھوڑ کر بھی پیشہ ہی کیا۔لیکن آپ کو شرم نہیں آتی آپ تو بڑے دین دار، وضع دار، معزز شہری ہیں۔"

شیخ جی بسم اللہ کو کندھے سے لگائے کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے اور یہ موٹے موٹے آنسو گرانے لگے کہاں تو تابی بپھری لہر بن کر اٹھی تھی اور کہاں دیسی صابن کی جھاگ بن کر بیٹھ گئی۔موٹے موٹے آنسو اور وہ بھی شیخ جی کی فربہ گالوں پر۔تابی انہیں گھر بدر کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن بھاگ کر ان کے پاس جا بیٹھی اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

"شیخ جی کیا بات ہے؟طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔لایئے بسم اللہ کو مجھے دے دیجئے۔"

شیخ جی نے بسو کو اور بھی بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور ناک سے شلک شلک کی آوازیں نکال کر رونے لگے۔تابی بے تاب ہو کر کمرے میں پھرنے لگی۔اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اپنے سے بیس برس بڑے مرد کو کیسے چپ کراتے ہیں۔ویسے بھی اسے اب شیخ جی اتنے اچھے لگنے لگے تھے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پشیمان نہ ہونا اس کے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ادھر شیخ جی گلے کا گھنگھرو بجا بجا کر کہہ رہے تھے۔"خدا قسم میری نیت نیک ہے۔مجھے تمہاری قسم تابی نکاح میں ضرور پڑھوالوں لگا اور پڑھواؤں گا بھی'لیکن جس علاقے میں تم رہتی ہو۔۔۔وہاں ۔۔۔۔۔وہاں رہ کر ایسے کیونکر ہو سکتا ہے۔اگر کہیں تم باہر مکان لے لو تو ۔۔۔تو کیا مجال جو میں رتی بھر حیل و حجت کروں۔۔۔۔خدا قسم تابی۔۔۔۔۔"

تابی واپس پلنگ پر چلی گئی۔جیسے ایک سوچھ بخار میں برف کا غسل لے چکی ہو آہستہ سے بولی۔۔۔"شیخ جی آپ نے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔میں آج ہی سید و دلال کو بلا کر گلبرگ میں کوٹھی لوں گی۔خرچ ورچ آپ کے ذمے نہیں ہوگا۔جب نہ ہوں گے آپ ہی سے لینے ہیں ناں!۔۔۔لایئے بسو کو میرے پاس ڈال دیجیے۔ہائے بیچاری روتے روتے سو گئی۔"

تابی کو گلبرگ میں آئے دو مہینے ہو چکے تھے لیکن کسی دن تو وثیقہ نویس نہ ملتا تھا کسی دن نکاح پڑھوانے والے مولوی کے گردے میں درد ہونے لگتا۔یہ دونوں مل جاتے تو گواہ کچہریاں بھگتنے چلے جاتے۔غرضیکہ شاہی مسجد کے پچھواڑے سے اٹھ کر آنے کا فقط ایک نفع ہوا۔وہاں سارا محلہ جانتا تھا۔سارے کام گھر بیٹھے ہوتے۔گلبرگ میں اکنی کی جگہ روپیہ خرچ ہونے لگا۔پھر تابی کے لیے اس نئے ماحول میں ایک اور بڑی مشکل در پیش تھی۔اپنے محلے میں ان کی پرانی ساکھ تھی حیثیت عرفی سے سب واقف تھے۔یہاں محل نما کوٹھی

میں رہت سہت تو تمام بیگموں کی سی تھی۔ لیکن جی کا چور جینے نہ دیتا تھا۔ ہر وقت لوگوں سے چھپی رہتی تھی۔ یہی سوچ کر کسی سے نہ ملتی کہ اپنا تعارف کس نام سے کراؤں؟ خیال تو تھا کہ کوٹھی لیتے ہی پاسہ پلٹ جائے گا لیکن ہوایوں کہ بیچاری اور دبدھا میں پڑ گئی۔ گلبرگ کی کوٹھی تابی کو کڑکی نظر آنے لگی لیکن شیخ جی سے کہی ہوئی بات کا بھرم رکھنے کے لیے چپکی بیٹھی رہی۔۔۔۔۔۔

اور سب سے بڑی بات یہ بھی تھی کہ خدا جانے کیوں اور کیسے اسے شیخ جی سے عشق ہو گیا تھا۔ اس خیال سے ہی جی لرز اٹھتا کہ وہ جو کہیں شیخ جی نے بالکل چھوڑ دیا تو کیا بنے گا؟ ویسے بھی تابی میں نخاس والیوں جیسی بے لحاظی نہ تھی۔

ہر بات کا الزام گھوم پھر کر نہ جانے کیسے اپنے سر منڈھنے کی عادی تھی۔ دو مہینے گزر گئے اور شیخ جی پر دباؤ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی ادھر شیخ جی تابی کو گلبرگ پہنچا کر نچنت ہو گئے۔ روز ہیرا منڈی جانے کا کھٹکا کم ہوا تو نسل دار لوگوں کی طرح فوراً اپنا وعدہ بھول ناک میں نسوار لے خاموش ہو رہے۔ شاید اسی طرح کچھ برس اور گزر جاتے لیکن حالات نے یکدم کروٹ لی۔

برسات کا موسم تھا۔ کینال پارک کی جانب سے آندھی چڑھی۔ گھنٹوں ہوا نشہ پانی کیے کھڑکیاں دروازے توڑتی رہی۔ شام کو مٹی کی تہیں موزیک کے فرش پر سے دھلواتی ہوئی تابی نے دیکھا کہ ٹیکسی میں سے شیخ صاحب اتر رہے ہیں۔ ساتھ دو کھانچے آم کے اور ایک کھوکھا آلو بخارے کا چلا آ رہا ہے۔ ابھی وہ سب بیٹھے برف لگے آلو بخارے کھا ہی رہے تھے کہ شیخ جی کو دو چھینکیں آ گئیں۔ ساتھ ہی سر میں ایسا شدید درد اٹھا جیسے کوئی پھاوڑے سے بھیجا نکال رہا ہو۔ تابی نے اسپرو پلائی تو ایسی تے آئی کہ آنتیں الٹ گئیں۔

شیخ جی چارپائی پر پڑ گئے۔

بیس دن تابی نے شیخ جی کی وہ خدمت کی کہ پتی ورتا ساوتریوں کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ کچھ تو شیخ جی تابی کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے کچھ اپنے بچنے کی امید نہ تھی۔ دل میں رہ رہ کر یہ خوف ابھرتا کہ قبر تک سانسوں کا فاصلہ ہے۔ اس عورت سے جھوٹا وعدہ کر کے گیا تو مشتبہ مثل ساتھ لے کے جانا ہوگا اور پھر جانے کیا ہو؟

ایک روز نیم بے ہوشی کے عالم میں شیخ جی نے آپو کو بلایا اور مولوی صاحب کو بلوا بھیجنے کی تاکید کر دی۔

رات کو جس وقت سفید کپڑوں میں ملبوس' رانڈوں کی طرح چونڈا کسے ننگی بوچی تابی کا نکاح پر پڑھوانے تین آدمی آئے وہ ہاتھ میں شیخ جی کا استعمال شدہ بیڈ پین لیے غسلخانے کی طرف جا رہی تھی۔

سارے محلے کی زبان پر اس کے لیے ہمدردی کے بول تھے۔

پہلے خالہ اصغری آئیں۔ عطر پھلیل سے آنگن مہک گیا۔ کلیوں والے ریشمی برقعے کو چارپائی پر قرینے سے رکھ کروہ بھائیں بھائیں رونے لگیں۔ خالہ کے جاتے ہی پھوپی جمال آرا آ گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی دونوں کم عمر ٹیڈی بھتیجیاں بھی تھیں۔ بڑی دیر تک شیخ جی کا کیریکٹر زیر بحث رہا۔ پھوپھی گئیں تو منہ بولی بہن زاہدہ کا تانگہ بمع سات بچوں کے آ گیا۔

دو کریٹ کوکا کولا کے ختم ہو گئے۔ ساتھ ہی ساتھ اتنے آنسو بہائے گئے کہ کوکا کولا کا سارا کھاراپن ختم ہو گیا۔

سارا دن ہمدردیوں کی ڈاک بندھی رہی۔ ہر کارے پر ہرکارہ آتا رہا۔ رات آئی تو حمیدہ کا بند بند دکھنے لگا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پچھی مار مار کر کسی نے ادھ موا کر دیا ہو۔ بڑی دیر بیٹھی سوچتی رہی اب کیا کرنا چاہیے؟ غیرت برتوں اور گھر چلی جاؤں یا چپ چاپ روٹی کپڑا حلال کیے جاؤں اور اپنے بچوں کا بھلا چاہوں۔؟ شیخ صاحب کے ساتھ محبت یا مروت کا سوال تو پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ اسے تو ان کا تھل تھل وجود دیکھ کر ہی وحشت ہونے لگتی تھی۔ پھر سوتے میں ان کے نرخرے سے جو آوازیں نکلتی تھیں ان سے حمیدہ کو بڑی وحشت تھی۔ صحت ان کی بالو کا ڈھیر تھی۔ دبانے' سینک دینے' مزاج پرسی کرنے کا نہ تو حمیدہ کا شوق تھا نہ وقت۔ ویسے بھی وہ ہمیشہ سے کہتی آئی تھی کہ وہ بیوی ہے نرس نہیں۔ لیکن اب تو ایک کسبی سے مقابلہ آ پڑا تھا۔ ڈوم ڈھاڑیوں کے آگے وہ ہار ماننے والی تھوڑی تھی۔ وہ تو ادبدا کر میکے چلی جاتی۔ لیکن کار بنگلہ قالین فریج سب سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے۔ اور پھر کون جانے شیخ جی نان نفقہ کے بھی پیسے دیں نہ دیں۔ یہ خوف جان کالا گو ہو رہا تھا۔ ادھر جس طرح تابی نے اڑنگا دے کر پچھاڑا اس پینترے کی تو یہی شرط تھی کہ ایسی روٹھ کر میکے جائے کہ شیخ جی یا تو تابی کو طلاق دے دیں یا ہمیشہ کے لیے حمیدہ سے کھٹا پٹی ہو جائے۔

محلے والیوں کی ہمدردی بھرے جملے ٹپکے کے آموں کی طرح تھوڑی تھوڑی دیر بعد کانوں میں بھد بھد گرتے تھے۔۔۔۔۔۔ ''ارے یہ طوائفیں مردوں کو مٹھی میں لینا جانتی ہیں' تم یہ فن کیا جانو۔۔۔''

''دیکھا میں نہ کہتی تھی حمیدہ۔۔۔۔۔۔ کوئی مردوں کو بھی یوں آزاد چھوڑ دیتا ہے؟''

''تم کو کیا معلوم؟ کیا کیا کرتی ہیں یہ کوٹھے والیاں۔۔۔۔۔''

''اللہ جی! اب رنگ لائی گلبری۔۔۔۔۔ ہم بھی کہیں یہ شیخ جی روز روز کہاں جاتے ہیں۔''

بڑی دیر حمیدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ پھر اٹھی صندل کا شربت' دو گھونٹ حلق میں ٹپکایا۔ نائیلون کے دوپٹے سے آنکھ کے کونے کو پونچھا اور جی کو پچکار کر بولی۔۔۔۔

''چلو ہمیں کیا؟ نکاح پڑھوالیا تو اچھا کیا۔ ہماری جان چھوٹ گئی۔ روز ہماری بوٹیاں توڑ توڑ کر کھاتے تھے۔ لیکن ہم اپنا گھر کیوں چھوڑیں۔ آپی خرچا دیں گے۔ جب دوہری بپتا پڑے گی تب عقل ٹھکانے آئے گی۔''

ساری فکر حمیدہ کو اپنے ماہانے کی تھی۔ بار بار سوچتی کہ وہ جو کہیں اس مال زادی نے خرچ بند کروا دیا تو کیا ہوگا؟ رفتہ رفتہ اپنی کم نصیبی کی عظمت سے وہ کچھ اس طرح متاثر ہوئی کہ اٹھ کر ململ کا سفید دوپٹہ کانوں کے دونوں طرف اڑس لیا اور تکیے پر یوں آلیٹی جیسے حنوط شدہ قدیم مصر کی کوئی شہزادی ہو۔

آنسو آہستہ آہستہ کانوں کی طرف بڑھنے لگے۔

ٹپ ٹپ۔۔۔ بوند بوند

تکیہ بھیگنے لگا۔۔۔ لیکن عجیب سی بات تھی اتنے سارے آنسوؤں میں ایک آنسو بھی شیخ جی کی یاد میں نہ تھا۔ سب اپنی بدنصیبی اپنے بچوں کی بدنصیبی اپنے مستقبل کے اندھیرے پن پر مچل رہے تھے۔

بارش آہستہ آہستہ برس رہی تھی۔

تابی کی نگاہیں بار بار پلنگ کا طواف کرتی تھیں۔ کھڑکی میں بیٹھے اسے لگ رہا تھا جیسے وہ صندوقی ہودج میں بیٹھی تسخیر آفتاب کا منتر پڑھتی کسی مہم سے لوٹ رہی ہے۔ سارے گھر میں سکھ شانتی کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ گو باہر بوندیں برس رہی تھیں لیکن گھر کے اندر بارہ سردیوں کی گرم گرم دھوپ کا سماں تھا۔ آج بادلوں میں مایوسی' تکان اور آنسو نہ تھے۔ بلکہ آج تو اودے دوپٹے اوڑھے کندھوں پر برنجی گاگریں اٹھائے رادھا نگری سے گوپیاں قطار در قطار پانی لا رہی تھیں۔

تابی کی پتنگا سی نگاہیں سوئے ہوئے شیخ جی پر منڈلا رہی تھیں۔

یہی مرد کل تک شیخ صاحب تھا۔ اس سے اسے محبت تھی لیکن اس کے وجود سے تابی کے انگ انگ میں گناہ کی خارش اٹھتی تھی۔ ضمیر کے تازیانے کسی گھڑی اپنی کارگزاری بند نہ کرتے تھے۔ تابی کا سب کچھ پہلے بھی شیخ صاحب کے لیے تھا۔ لیکن نکاح کے دو بول اس گھر میں کیا سر ہوئے سارے گھر میں اس شخص کے وجود سے بہار آ گئی۔ تابی کو شیخ جی کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔ بلاوجہ۔ احمق پن کی حد تک۔

آپو کو یہ اعتراض تھا کہ شیخ جی موٹے بہت ہیں اور عمر میں تابی سے بڑے بھی بہت ہیں۔ آپو کے سامنے تابی چپ رہتی لیکن اکیلے میں تابی سوچتی موٹے ہیں تو کیا ہوا؟ شوہر موٹا نہ ہو تو رعب والا نہیں لگتا۔ عمر مرد کی عورت سے بڑی ہی ہونی چاہیے ورنہ شادی کے دسویں سال میاں بیوی کا رشتہ ماں بیٹے کا نظر آتا ہے۔ ان کی بیماری سے بھی تابی کو مریضانہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ سوچتی وہ تو شیخ جی قسمت سے بیمار رہتے ہیں ورنہ ان

ہاتھوں کو ان کی خدمت کا موقع ہی کب ملتا؟

شادی سے پہلے محض ایک وعدے کی بنا پر تابی شیخ جی کی ہو چکی تھی۔تن من دھن سے ان کی غلام تھی۔اب تو ہر پل احسان مندی سے بھی دل ڈوبا چلا جاتا تھا۔اس کا جی چاہتا اٹھ کر شیخ جی کے پاؤں چوم لے۔اپنے چمڑے کے سلیپر بنوا کر شیخ جی کے گدگدے پیروں میں پہنا دے۔۔۔اللہ مجھ راندی ہوئی سے شیخ جی نے نکاح پڑھوایا۔مجھ بازار والی کو یہ عزت بخشی۔کوڑے کی ٹوکری کو سر پر اٹھایا۔جب یہ باتیں اس کے ذہن میں آتیں تو شیخ جی کی محبت کا سوتا جسم پر آبشار بن کر گرتا اور روح تک کو سرشار کر جاتا۔اس محبت میں اندھیرے بادلوں کی سی ستر پوشی تھی۔حضرت بلال کی سی عبودیت تھی۔رام رام سمرن کرتی چتا کے گرد چکر لگاتی پدمنی کی لگن تھی۔

تابی آہستہ سے صندوقی ہودج سے اٹھی اور سوئے ہوئے شیخ صاحب کے پیروں پر سر رکھ کر ہولے ہولے رونے لگی۔

حمیدہ اٹھی تو طوفان بن کر لیکن نصیب برگشتہ کی طرح پھر ڈھیر ہو کر چوکی پر بیٹھ گئی۔

ماموں نے چھٹی مرتبہ وہی بات کہی۔۔۔۔۔"لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شیخ صاحب دوسرے نکاح کے بعد بھی حمیدہ کی کفالت کرتے رہیں گے؟۔۔۔۔۔اس سارے معاملے کا تو بس ایک ہی حل ہے کہ کسی طرح شیخ صاحب اس بدمعاش کو چھوڑ دیں۔"

جہاں تک حمیدہ کا تعلق تھا وہ یہ چاہتی تھی کہ شیخ صاحب چاہے جسمانی طور پر تابی کو چھوڑیں نہ چھوڑیں لیکن مچلکہ لکھ دیں کہ اس کا ہزار روپیہ ہر ماہ کھرا رہے گا۔ایک طرح سے تو وہ خوش تھی کہ گناہ سمیٹنے کو ایک دوسری آ گئی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ بقول ماموں تابی کسبی تھی، رنڈی تھی، روپے پیسے کی لوبھی، وہ کب تک برداشت کرتی رہے گی کہ حمیدہ کو ہزار روپیہ ماہوار مفت کا ملتا رہے۔

"ارے تم نہ ڈرو حمیدہ ہم تمھاری پشت پر ہیں۔ادھر تو کارخانے کو انڈسٹری کے ڈائریکٹر سے کہہ کر بند کروا دیں گے ادھر پٹرول پمپ سے نہ نکلوا دیا تو کہنا۔جب بزنس کا دریچہ بند ہوا تو یہ ساری محبت آپی آپ دم پخت ہو جائے گی۔"

حمیدہ لرز گئی۔محبت کو دم پخت کرنے کا یہ طریقہ اسے ایک آنکھ نہ بھایا۔اللہ وہ جو کہیں سے ایسا ملاج ہو کہ سانپ بھی مر جائے اور بزنس کی لاٹھی بھی سلامت رہے تو ہی لطف ہے۔

خالہ! اصغری ریشمی برقعے کو اٹھا کر بولیں "بھائی جی ہماری حمیدہ تو سیدھی سادی ہیں آپ خود جا

کر اس کل موہی سے ملیے۔۔۔۔اس رنڈی کے ہتھکنڈے بیچاری یہ کیا جانے۔۔۔۔۔"

"مشکل تو یہی ہے اگر شیخ صاحب نان ونفقہ کے ضامن بھی بن گئے تو کوٹھے والی کبھی کب کفیل رہنے دے گی۔ شیخ صاحب کو تو واپس ہی لانا پڑے گا۔۔۔۔ ہر قیمت پر۔۔۔"

اپنے ساتھ والے پلنگ پر تھل تھل کرتے ہوئے زرخرے سے بھیانک آوازیں نکالتے شیخ جی کے تصور سے ہی حمیدہ لرز گئی۔ اس کے دل کے آنگن میں پرانی آسنی پر شیخ جی کی وہ ساری باتیں افسوس کرنے آئی بیٹھی تھیں جن کا شیخ جی کی محبت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ رنڈی کے ہاتھوں خرچ بند ہو جانے کا خدشہ تو تھا ہی دوجے یہ واہمہ ستاتا تھا کہ سارے میں نک کٹی ہوگی ہماری توپ کو کیسی انجک چاٹ گئی کہ شیخ جی جیسا کو دن شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔

جب ماموں نے گلبرگ جانے کا قصد کیا تو خالہ اصغری نے بچوں کو گندے میلے کپڑے پہنا کر یتیموں کی ساری خوبیاں پیدا کر کے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر لا بٹھایا۔ پہلے تو حمیدہ ساتھ جانے پر رضامند نہ ہوتی تھی لیکن جب اٹھارویں مرتبہ چلتے چلتے ماموں بولے۔ "دیکھ لو حمیدہ! وہ حرفہ باز ہے مات دے گی تمہیں یہ مت سمجھنا کہ ایسی عورتوں کے وعدے اعتبار کے قابل ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سامنے ضرور مان جائے گی لیکن ایسی عورتوں کا کیا اعتبار۔ بہتر تو یہی تھا کہ تم ساتھ چلتیں اور کسی طرح شیخ جی کو لوا لاتیں ورنہ ان کے چلتر تم کیا سمجھو آنکھوں میں مٹھیاں دے دے کر روؤ گی۔"

حمیدہ خوفزدہ ہو کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ادھ کھلی کھڑکی سے سر اندر ڈال کر خالہ اصغری بولیں۔۔۔۔"اے حمیدہ! جب ماموں دبکا چکیں تو پھر دلار سے کام لینا کہیں پھانسا ہوا شکار نہ بدکا دینا۔ وہ تو ایسے سب گن پڑھی ہیں۔ میں تم کو تاکید کرتی ہوں لگاوٹ کی باتیں کرنا لگاوٹ کی۔۔۔۔وہ نہ ہو کہیں شیخ صاحب کی ہر شے کی وہی مالک بن بیٹھے۔۔۔۔"

کینال پارک کی جانب سے اٹھنے والا فیل مست بادل گلبرگ پر بے جان لیٹا تھا ٹیکسی کی پیلی چھت پر شہد جیسی بوندیں پھوار بن کر پڑ رہی تھیں اور میٹر دم بدم بڑھ رہا تھا۔

تابی شکست خوردہ راجپوت رانی کی طرح صندوقی ہودے میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔

پہلے ماموں نے پون گھنٹہ اس کی۔ اس کے پیشے کی' اس کے آباؤ اجداد کی بے غیرت زندگی کی لچھے دار گالیوں سے ضیافت کی۔ اس اثنا میں حمیدہ چارپائی کے سرہانے یوں کھڑی رہی جیسے اس کمرے کی ہر چیز میں پھول ماتا کے جراثیم ہوں' جب اپنے بھانویں ماموں تابی سے نپٹ چکے تو غصے کی گاڑی شنٹ کرتے

ہوئے شیخ جی سے بولے۔۔۔ ''تم جانتے ہو کہ ڈائریکٹر آف انڈسٹریز سے میرے کیسے تعلقات ہیں پل بھر میں ساری فیکٹری پر تالا نہ ڈلوادیا تو شیخ الٰہی بخش نام نہیں۔ جس دولت کے مان پر تمہیں یہ اللے تللے سوجھے ہیں اس دولت کا پرنالہ ہی بند کردوں گا' انشاء اللہ!''

شیخ جی کچی نیند سے جاگے تھے۔ چہرے پر پیلاہٹ جسم میں لرزاہٹ اور دل میں وسوسے تھے۔ پھر نگاہ جو کھلی تو سامنے حمیدہ اور ماموں کی شکل نظر آئی۔ بیماری نے پہلے ہی قوت مدافعت چھین لی تھی۔ پلنگ پر عادی مجرموں کی طرح بیٹھ گئے۔

''تم کچھ بولتے کیوں نہیں۔۔۔۔ لیکن اس آوارہ سے نکاح پڑھوا کر اب بولو بھی۔۔۔۔۔۔ بے شرم کار تو گھر پر ہی رہنے دیتے۔ یہ لوگ تو سارا مال ہتھیا کر بھی اپنی نہیں بنتیں۔''

''یہ میری ویسی ہی بیوی ہے جیسی حمیدہ۔۔۔ آپ آپ'' انہوں نے تابی کے لیے آواز کو بلند کرنا چاہا لیکن آواز کہیں حلق ہی میں سوکھ گئی۔

برآمدے میں حمیدہ کے بچوں نے ہلڑ مچا رکھا تھا۔ ننھی بسم اللہ کی سائیکل کو دھڑ ادھڑ دوڑا رہے تھے۔ آسمان پر گھرے سرمئی بادلوں میں خوفناک سی چمک کوڑیالے سانپ بن کر بار بار لہرا رہی تھی اور مینہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔

تابی آہستہ سے ہودج میں سے اتری۔ حمیدہ کے بچوں کی آوازیں اس کا کان میں گرم سیسہ بن کر اتر رہی تھیں۔ آخر ان معصوم روحوں کا کیا قصور تھا؟ جس قدر ربسو کو ایک والد کی ضرورت تھی اسی قدر ان بچوں کو بھی تو سہارے درکار ہے؟ وہ آہستہ آہستہ الماری تک آئی اور ہینگر پر ٹنگی ہوئی اچکن اتارنے لگی۔

شیخ جی نے تابی کی طرف دیکھنا چاہا لیکن اسی وقت آگے بڑھ کر حمیدہ نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا اور جوتیاں پیروں سے کھسکا کر ان کے برابر کر دیں۔ جاتے ہوئے نہ تو شیخ جی نے پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی طوائف انہیں ٹیکسی تک چھوڑنے گئی۔

کینال پارک سے آنے والے بادل کی قناتیں پھٹ گئیں اور کاجل بھری پھوار گلبرگ کی کوٹھی پر پڑنے لگی۔

تابی نے سارے کمرے پر نگاہ دوڑائی اور شیخ جی کے خالی پلنگ کی پائنتی جا بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں سے گرم گرم آنسو بہہ رہے تھے اور ایک ایک آنسو میں شیخ جی کی شبیہ ٹوٹ رہی تھی نکھر رہی تھی۔ اس کے سرکا سیس پھول پتی پتی سارے گھر میں بکھرا پڑا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی

کلیانی

اب اسے ان کالی، بھوری راہوں پر چلنے سے کوئی ڈر نہ آتا تھا، جہاں بے شمار گڑھے تھے، جن میں کالا پانی، بمبئی کے اس صنعتی شہر کی میل ہمیشہ جمع رہتی تھی اور کبھی نہ پنہ بیٹھتی، بے شکل سے پتھر، ادھر سے ادھر جیسے شوقیہ پڑے تھے۔ بے کار آخری روڑا ہونے کے لیے۔ اور وہ شروع کے دن جب ٹانگیں کانپتی تھیں اور تنکے بھی روکنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گلی کے موڑ پہ دیسی صابن کے بڑے بڑے چاک بنانے والا اور اس کے پڑوس میں کا حجام دیکھ رہے ہیں، اور برابر ہنس رہے ہیں۔ کم سے کم رو بھی نہیں رہے ہیں۔ پھر باجو کا کوئلے والا، جو آپ تو شاید اس چکلے میں کبھی نہ گیا تھا، اس پہ بھی اس کا منہ کالا تھا۔۔۔۔

بغل میں پہلے مالے پہ کلب تھی، جہاں چوری کی رم چلتی تھی اور یاری کی رمی۔ اس کی کھڑکیاں کسی یوگی آنکھوں کی طرح سے باہر کی بجائے اندر من کے چکلے میں کھلتی تھیں اور ان میں سگریٹوں کے دھوئیں کی صورت میں آہیں نکلتی تھیں۔ لوگ یوں تو جوئے میں سینکڑوں کے ہاتھ دیتے تھے مگر سگریٹ ہمیشہ گھٹیا پیتے تھے۔۔۔۔ بلکہ بیڑی، صرف بیڑی، جس کا جوئے کے ساتھ وہی تعلق ہوتا ہے جو پنسلین کا آتشک سے۔۔۔۔۔ یہ کھڑکیاں اندر کی طرف کیوں کھلتی تھیں؟ نہ معلوم کیوں؟ مگر کوئی خاص فرق نہ پڑتا تھا کیونکہ اندر کے صحن میں آنے والے مرد کی صرف چھایا ہی نظر آتی، جس سے معاملہ پٹائی ہوئی لڑکی اسے اندر لے جاتی، بٹھاتی اور ایک بار ضرور باہر آتی۔ نل پر سے پانی کی بالٹی لینے، جو صحن کے عین بیچوں بیچ لگا ہوا تھا اور دونوں طرف کی کھولیوں کی طرح طرح کی ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ پانی کی بالٹی اٹھانے سے پہلے لڑکی ہمیشہ ہمیشہ اپنی دھوتی یا ساری کو کمر میں کستی اور گاہک لگ جانے کی اکڑ میں کوئی نہ کوئی بات اپنی ہم پیشہ بہن سے ضرور کہتی۔۔۔۔ ''اے گرجا! جرا چاول دیکھ لینا، میرے کو گاہک لگا ہے''۔۔۔۔ پھر وہ اندر جا کر دروازہ بند کر لیتی۔ تبھی گرجا سندری سے کہتی۔۔۔ ''کلیانی میں کیا ہے ری، آج اسے دوسرا کسٹمر لگا ہے؟'' لیکن سندری کے بجائے جاڑی یا کھرسید، جواب دیتی۔۔۔''اپنی اپنی قسمت ہے نا؟''۔۔۔۔ تبھی کلیانی والے کمرے سے زنجیر لگنے کی آواز آتی اور بس۔ سندری ایک نظر بند دروازے کی طرف دیکھتی اور اپنے سنے

ہوئے بالوں کو چھانتی، تولیے سے پونچھتی ہوئی گنگنانے لگتی۔۔۔ ''رات جاگی رے بلم، رات جاگی''۔۔۔۔
'اور پھر ایکا ایکی گرجا سے مخاطب ہو اٹھتی۔۔۔۔۔ ''اے گرجا! کلیانی کے چاول ابل رہے ہیں۔ دیکھتی نہیں کیسی گڑ گڑ کی آواز آ رہی ہے۔ اس کے برتن سے؟'' اور پھر تینوں چاروں لڑکیاں مل کر ہنستیں اور ایک دوسری کے کولھے میں چپے دینے لگتیں۔ تبھی گرجا بلبلا اٹھتی اور کہتی۔۔۔۔ ''ائیا جور سے کیوں مارا، رنڈی! جانتی ہے' ابھی تک دکھ رہا ہے میرا پھول؟ کان کو ہاتھ لگایا بابا! میں تو کیا میری آل اولاد بھی کبھی کسی پنجابی کے ساتھ نہ بیٹھے گی۔'' پھر گرجا بغل کی کھولی میں کسی چھوکری کو آواز دیتی۔

''گنگی تیرا اوپٹ کیا بولتا۔۔۔؟''

گنگی کی شکل تو نہ دکھائی دیتی، صرف آواز آتی۔۔۔۔ ''میرا اوپٹ بولتا' بھج من رام' بھج من رام۔۔۔۔۔۔۔''

مطلب گنگی کو یا تو سرمیل ہے اور یا پھر کوئی کسٹمر نہیں لگا۔

مہی پت لال اب کے مہینوں کے بعد ادھر آیا ہے۔ بیچ میں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے وہ یہاں سے، کچھ ہی فرلانگ دور ایک نیپالی لڑکی چونی لا کے پاس چلا گیا تھا اور اس کے بعد چھیانوے نمبر کی ایک کرسچین چھوکری میں پھنس گیا جس کا اصلی نام تو کچھ اور تھا لیکن وہاں کی دوسری لڑکیاں اور دلال اسے اولگا کے نام سے پکارتے تھے۔ ادھر کلیانی کو کچھ پتہ بھی نہ تھا کیونکہ اس دھندے میں تو دو چار مکانوں کا فاصلہ بھی سینکڑوں میل کا ہوتا ہے۔ لڑکیاں زیادہ سے زیادہ پکچر دیکھنے کو نکلتی تھیں اور پھر واپس۔۔۔۔۔ جس منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے مہی پت دوسری لڑکیوں کے پاس چلا گیا تھا اسی کے لیے اس اڈے پر لوٹ آیا۔ لیکن یہ بات طے تھی کہ اتنے مہینوں کے بعد وہ کلیانی کو بھول چکا تھا۔ حالانکہ ملک جانے کے لیے اس نے کلیانی کو دو سو روپے بھی دیے تھے تب شاید نشے کا عالم تھا جیسا کہ اب تھا۔ بیئر کا پورا پیگ پی جانے کے کارن مہی پت لال کے دماغ میں کسی اور ہی عورت کی تصویر تھی اور وہ بھی نامکمل۔ کیونکہ اسے مکمل تو مہی پت ہی کو کرنا تھا۔۔۔ ایک مصور کی طرح سے جو کہ مرد ہوتا ہے اور تصویر جو کہ عورت ہوتی ہے۔۔۔۔

اندر آتے ہی مہی پت نے صحن کے پہلے پیراپٹ کو پھلانگا۔ تین چار سیڑھیاں نیچے اترا۔ لوگ سمجھتے ہیں پاتال، نرک کہیں دور دھرتی کے اندر ہیں۔ لیکن نہیں جانتے کہ وہ صرف دو تین سیڑھیاں نیچے ہیں۔ وہاں کوئی آگ جل رہی ہے اور نہ ابلتے، کھولتے ہوئے کنڈ ہیں۔ ہو سکتا ہے سیڑھیاں اترنے کے بعد پھر اسے کسی اوپر کے تھڑے پہ جانا پڑے، جہاں سامنے دوزخ ہے، جس میں ایسی ایسی اذیتیں دی جاتی ہیں کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

سیڑھیاں اترنے کے بعد، صحن میں پاؤں رکھنے کے بجائے مہی پت لال کھولیوں کے سامنے والے تھڑے پہ چلا گیا کیونکہ پکا ہونے کے باوجود صحن میں ایک گڑھا تھا، جس میں ہمیشہ ہمیشہ پانی جمع رہتا تھا۔ برس ڈیڑھ برس پہلے بھی یہ گڑھا ایسا تھا اور اب بھی ایسا ہی۔ لیکن گڑھے کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا پتہ ہو۔ اوپر صحن کے کھلے ہونے کی وجہ سے دشمی کا چاند گڑھے کے پانی میں جھلملا رہا تھا جیسے اسے میل، سر میل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نل سے پانی کا چھینٹا اس پر پڑتا تو چاند کی چھبی کانپنے لگتی، پوری کی پوری۔۔۔۔۔

کچھ گاہک لوگ گرجا، سندری اور جاڑی کو یوں ٹھونک بجا کے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کچے پکے گھڑے ہوں۔ ان میں سے کچھ اپنی جیبیں ٹٹول رہے تھے۔ مستری جاڑی کے ساتھ جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ گرجا، سندری، کھرسید سے زیادہ بدصورت تھی مگر تھی آٹھ اینٹ کی دیوار۔ حیرانی تو یہ تھی کہ لڑکیوں میں سے کسی کو حیرانی نہ ہو رہی تھی۔ وہ مرد اور اس کے پاگل پن کو اچھی طرح سے جانتی تھیں۔ مہی پت نے سندری کو دیکھا جو ویسے تو کالی تھی، مگر عام کونکنی عورتوں کی طرح تیکھے نقش نینوں والی۔ پھر کمر سے نیچے اس کا جسم۔ باپ رے، ہو جاتا تھا تبھی مہی پت کے کرتے کو کھینچ پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو سامنے کلیانی کھڑی تھی اور ہنستے ہوئے اپنے دانتوں کے موتی رول رہی تھی۔ مگر وہ دبلی ہو گئی تھی۔ کیوں؟ نہ معلوم کیوں؟ چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے دو آنکھوں کے لیے جگہ چھوڑ کر کسی نے ڈھولک پہ چمڑا مڑھ دیا چونکہ عورت اور تقدیر ایک ہی بات ہے، اس لیے مہی پت کلیانی کے ساتھ تیسری کھولی میں چلا گیا۔

کلب گھر کی کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا اور اوبھ کر بساط الٹ دی۔ کلیانی نے باہر آ کر نل پہ بالٹی بھری، دھوتی کو کمر میں کسا اور آواز دی۔۔۔۔ ''او گرجا، تھوڑا ہمار گٹھری سنبھالنا اور پھر وہ پانی لے کر کھولی میں چلی گئی۔۔۔۔۔۔''

پاس کی کھولی سے میڈم کی آواز آئی۔۔۔ ''ایک ٹیم کا دو ٹیم کا؟''

اندر کلیانی نے مہی پت کو آنکھ ماری اور میڈم والی کھولی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''ایک ٹیم'' اور پھر اس نے پیسوں کے لیے مہی پت کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا، جسے پکڑ کر مہی پت اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ پھر اٹھ کر اس نے پان سے پٹی لال لال مہری کلیانی کے ہونٹوں پہ لگا دی جسے دھوتی کے پلو سے پونچھتی ہوئی وہ ہنسی۔۔۔ اتنے بے صبر؟

اور پھر ہاتھ پھیلا کر کہنے لگی۔۔ ''تم ہم کو تیس روپے دے گا پر ہم میڈم کو ایک ہی ٹیم کا بولے گا۔ تم بھی اس کو نہیں بولنے کا۔۔ آں؟''

مہی پت نے ایسے ہی سر ہلا دیا۔۔۔''آں''

بدستور ہاتھ پھیلائے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔۔۔''چلی نکال۔''

''پیسے؟''۔۔۔مہی پت بولا۔

کلیانی نے اب کے رسم نہیں ادا کی' وہ سچ مچ ہنس دی۔''نہیں'' وہ شرما گئی۔ہاں وہ دھندا کرتی تھی ۔اور شرماتی بھی تھی۔کون کہتا ہے' وہاں عورت عورت نہیں رہتی؟ وہاں بھی حیا اس کا زیور ہوتا ہے اور حربہ۔۔۔۔جس سے وہ مرتی ہے اور مارتی بھی۔مہی پت نے بتیس روپے نکال کر کلیانی کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔کلیانی نے ٹھیک سے گنا بھی نہیں۔اس نے تو بس پیسوں کو چوما' سر اور آنکھوں سے لگایا' بھگوان کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور میڈم کو ایک ٹائم کے پیسے دیئے اور اپنے حصے کے پانچ لے کر رکھے' اندر کے دروازے کی طرف سے اور بھی اندر چلی گئی۔مہی پت کو جلدی تھی۔وہ بے صبری سے درگا میا کی تصویر کو دیکھ رہا تھا جو شیر پہ بیٹھی تھی اور جس کے پاؤں میں راکھشش مرا پڑا تھا۔درگا کی درجنوں بھجائیں تھیں جن میں سے کسی میں تلوار تھی اور کسی میں برچھی اور کسی میں ڈھال۔ایک ہاتھ میں کٹا ہوا سر تھا' بالوں سے تھاما ہوا اور مہی پت کو معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس کا اپنا سر ہے۔لیکن درگا کی چھاتیاں اس کے کولھے اور رانیں بنانے میں مصور نے بڑے جبر سے کام لیا تھا۔دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔وہ کوئی بات نہ تھی لیکن ان پر لپکتی ہوئی سیل اور اس میں گڈمڈ کائی نے عجیب بھیانک سی شکلیں بنا دی تھیں' جن سے طبیعت بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیواریں نہیں تبتی اسکول ہیں' جن پر نرک اور سورگ کے نقشے بنے ہیں۔گنہگاروں کو اژدہے ڈس رہے ہیں اور شعلوں کی لپلپاتی ہوئی زبانیں انہیں چاٹ رہی ہیں۔پورا سنسار کال کے بڑے بڑے دانتوں اور اس کے کھوہ ایسے منہ میں پڑا ہے۔

وہ ضرور نرک میں جائے گا۔۔۔مہی پت۔۔۔۔۔۔جانے دو!

کلیانی لوٹی اور لوٹتے ہی اس نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کر دیے۔

یہ کھیل مرد اور عورت کا۔۔۔جس میں عورت کو اذیت نہ بھی ہو تو بھی اس کا ثبوت دینا پڑتا ہے اور اگر ہو تو مرد اسے نہیں مانتا۔

مہی پت پہلے تو ایسے ہی کلیانی کو نوچتا کاٹتا رہا۔پھر وہ کود کر پلنگ سے نیچے اتر گیا۔وہ کلیانی کو نہیں' کائنات کی عورت کو دیکھنا چاہتا تھا' کیونکہ کلیانیاں تو آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔مہی پت بھی آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' لیکن عورت وہیں رہتی ہے اور مرد بھی۔

کیوں؟ یہ سب کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔حالانکہ اس میں سمجھ کی کوئی بات ہی نہیں۔

ایک بات ہے۔ ست جگ' دواپر اور تر تیا جگو میں تو پورا نیائے تھا۔ پھر بھی عورتیں محبت میں کیوں چوری کر جاتی تھیں؟ جب گنگا' ویشیا کیوں تھیں؟ آج تو انیائے ہے۔۔۔ پگ پگ پہ انیائے ہے۔ پھر انہیں کیوں روکا جاتا ہے؟ کیوں ان پر قانون لگائے جاتے ہیں؟ جو روپیہ ٹکسال سے آتا ہے اس کی قیمت آٹھ آنے رہ جاتی ہے۔ افلاس اور وافر پیسے کے میل جول کی جتنی ضرورت آج ہے تاریخ میں کبھی ہوئی ہے؟۔۔۔۔۔۔دبالیں اسے تاکہ گھر کی لکشمی باہر نہ جائے مگر دولت' پیسہ تو Goddess bitch ہے وہ کتیا بو پہ آئے گی تو جائے گی ہی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مہی پت کو الجھاوے کی ضرورت تھی' اسی لیے اسے کائنات کی عورت کے پیچ وخم کھا گئے۔ اس نے ایک بئیر کے لیے کہا' لیکن اس سے پہلے کہ کلیانی کا کالا وجود اٹھ کر لڑکے کو آواز دے' وہ خود ہی بول اٹھا ۔۔۔۔"رہنے دو" اور اس نظارے کو دیکھنے لگا جو نشے سے بھی زیادہ تھا۔ پھر جانے کیا ہوا' مہی پت نے جھپٹ کر اتنے زور سے کلیانی کی ٹانگیں الگ کیں کہ وہ بلبلا اٹھی۔ اپنی بربیت سے گھبرا کر مہی پت نے خود ہی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اب کلیانی پلنگ پر پڑی تھی اور مہی پت گھٹنوں کے بل نیچے فرش پہ بیٹھا ہوا تھا اور اپنے منہ میں زبان کی نوک بنا رہا تھا۔۔۔ کلیانی لیٹی ہوئی اوپر چھت کو دیکھ رہی تھی' جہاں پنکھا جالے میں لپٹا ہوا' ایک آہستہ رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی کلیانی کو کچھ ہونے لگا۔ اس کے پورے بدن میں مہی پت اور اس کی زبان کے کارن ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اور وہ اس چیونٹے کی طرح سے تلملانے لگی' جس کے سامنے بے رحم بچے جلتی ہوئی ماچس رکھ دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔

جبھی اپنے آپ سے گھبرا کر مہی پت اوپر چلا آیا۔ اس کے بدن میں بے حد تناؤ تھا اور بجلیاں تھیں جنہیں وہ کیسے بھی جھٹک دینا چاہتا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی پکڑ اس قدر مضبوط تھی کہ جابر سے جابر آدمی اس سے نہ نکل سکتا تھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی کلیانی کی طرف دیکھا۔ اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ ایک پیشہ ور عورت کی چھاتیوں کا وزن بھی ایکا ایکی بڑھ سکتا ہے اور ان کے حلقے اور دانے پھیل کر اپنے مرکز' ابھرے ہوئے مرکز کو بھی معدوم کر سکتے ہیں۔ ان کے اردگرد اور کولھوں اور رانوں پر ستیلا کے داغ سے ابھر سکتے ہیں۔ اپنی وحشت میں وہ اس وقت کائنات کی عورت کو بھی بھول گیا۔ اور مرد کو بھی۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ رہا کہ وہ خود کہاں ہے اور کلیانی کہاں؟ وہ کہاں ختم ہوتا ہے اور کلیانی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ وہ اس قاتل کی طرح سے تھا جو چھت پر سے کسی کو دھکیل دیتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اتنی بلندی سے گر کر وہ بیان دینے کے لیے بھی زندہ نہ رہے گا اور وہ اس پہ خودکشی کا الزام لگا کر خود بچ نکلے گا۔ ایک جست کے ساتھ اس نے اپنا پورا بدن کلیانی پہ پھینکنا شروع کر دیا۔

ایک دلدوز سی چیخ نکلی اور بلبلاہٹ سنائی دی۔ سیل اور کائی سے پٹی دیواروں پہ پنکھوں کے پر اپنی بڑی بڑی پر چھائیاں ڈال رہے تھے۔ جانے کس نے پنکھے کو تیز کر دیا تھا؟ مہی پت پسینے سے شرابور تھا اور شرمندہ بھی، کیونکہ کلیانی رو رہی تھی، کراہ رہی تھی۔ یا وہ ایک عام کسبی کی طرح سے گاہک کو لات مارنا نہ جانتی تھی اور یا پھر وہ اتنے اچھے گاہک کو کھو دینے کے لیے تیار نہ تھی۔

سرہانے میں منہ چھپائے، کلیانی الٹی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے شانے پھڑکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ تبھی مہی پت ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اس نے کلیانی کے چہرے کو ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی، مگر کلیانی نے اسے جھٹک دیا۔ وہ سچ مچ رو رہی تھی۔ اس کے چہرے کو تھامنے میں مہی پت کے اپنے ہاتھ بھی گیلے ہو گئے تھے۔ آنسو تو اپنے آپ نہیں نکل آتے۔ جب جبر اور بے بسی خون کی ہولی کھیلتے ہیں تبھی آنکھیں چھان پھٹک کر اس لہو کو صاف کرتی ہوئیں چہرے پہ لے آتی ہیں۔ اگر اسے اپنے ہی رنگ میں لے آئیں تو دنیا میں مرد دکھائی دے نہ عورت۔

کلیانی نے پھر اپنا چہرہ چھڑا لیا۔

مہی پت پہلے صرف شرمندہ، پھر سچ مچ شرمندہ تھا۔ اس نے کلیانی سے معافی مانگی اور مانگتا ہی چلا گیا۔ کلیانی نے پلنگ کی چادر سے آنکھیں پونچھیں اور بے بسی سے مہی پت کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اٹھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر اپنے گھنگھریالے بالوں والا کونکی سر رکھ دیا۔ پھر اس کی گھگھی بندھ گئی۔ جس سے نکلنے میں مہی پت کو اور بھی تلذذ کا احساس ہوا۔۔۔ اور کلیانی کو بھی۔ اس نے اپنے گھاتک ہی کی پناہ ڈھونڈ لی، مرد تو مرد ہو گا ہی، باپ بھی تو ہے، بھائی بھی تو ہے۔۔۔۔ عورت عورت ہی سہی، مگر وہ بیٹی بھی تو ہے، بہن بھی تو ہے۔۔۔۔۔

اور ماں۔۔۔۔

مہی پت کی آنکھوں میں سچ مچ کے پچھتاوے کو دیکھتے ہی تصویر الٹ گئی۔ اب اس کا سر کلیانی کی چھاتی پر تھا اور وہ اسے پیار کر رہی تھی مہی پت چاہتا تھا کہ وہ اس عمل کو انجام پہ پہنچائے بغیر ہی وہاں سے چلا جائے لیکن کلیانی اس توہین کو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

کلیانی نے پھر اپنے آپ کو اذیت ہونے دی۔ بیچ میں ایک دوبارہ درد سے کراہی بھی اور پھر بولی۔۔۔ ''ہائے میرا پھول۔۔۔ بھگوان کے لیے۔۔۔ میرے کو سوئی لگوانا پڑتا۔'' پھر آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ اس نے دکھ اور سکھ سہتے ہوئے کائنات کے مرد کو ختم کر دیا اور اسے بچہ بنا کر گود میں لے لیا۔ مہی پت کے ہر الٹے سانس کے ساتھ کلیانی بڑی نرمی، بڑی ملائمیت اور بڑی ہی ممتا کے ساتھ اس کا منہ چوم لیتی تھی۔

جس سے سگریٹ اور شراب کا تعفن لپک رہا تھا۔

دھونے دھلانے کے بعد مہی پت نے اپنا ہاتھ کپڑوں کی طرف بڑھایا مگر کلیانی نے تھام لیا اور بولی۔"میرے کو بیس روپیہ جیاستی دو۔"

"بیس روپیہ؟"

"ہاں۔" کلیانی نے کہا۔"ہم تمہارا گن گائے گا۔ہم بھولا نہیں اور دن جب ہم ملک گیا تھا تو تم ہم کو دو سو روپیہ روکڑا دیا۔۔۔ہم کاروار کا بڑا مندر میں ایک ٹانگ سے کھڑا ہو کے تمہارے واسطے پرارتھنا کیا اور بولا۔۔۔میرا مہی کا رکھشا کرنا بھگوان۔۔۔اس کو لمبا جندگی دینا، پیسہ دینا۔۔۔"

اور کلیانی امید بھری نظروں سے پہلی اور اپنی پرارتھنا کا اثر دیکھنے لگی۔

مہی پت کے نتھنے نفرت سے پھولنے لگے۔۔۔پیشہ ور عورت! پچھلی بار دو سو روپے لینے سے پہلے بھی ایسے ہی ٹسوے بہائے تھے اس نے۔۔۔یوں روئی چلائی تھی جیسے میں کوئی انسان نہیں جانور ہوں، وحشی ہوں۔۔۔مگر اور بیس روپے؟ پھر رونے کی کیا ضرورت تھی آنسو بہانے کی؟ ویسے ہی مانگ لیتی تو کیا میں انکار کر دیتا؟۔۔۔جانتی بھی ہے۔میں پیسے سے انکار نہیں کرتا۔دراصل انکار مجھے آتا ہی نہیں۔اسی لیے تو بھگوان کا سو شکر کرتا ہوں کہ میں عورت پیدا نہیں ہوا ورنہ۔۔۔میں تو یہاں منہ مانگے دینے کا قائل ہوں، جس سے پھر گناہ کا احساس نہیں ہوتا۔ایسے ہی آدمی کا تو انتظار کیا کرتی ہیں یہ۔۔۔اور جب وہ آتا ہے تو اس سے جھوٹ بولنے، اس کے کپڑے اتارنے سے بھی نہیں چوکتیں۔۔۔کہتی ہیں: میں نے سوچا تھا تم منگل کو جرور آؤ گے۔۔۔منگل کو کیا ہے بھائی؟۔۔۔منگل کو میں نے بھگوان سے پرارتھنا کی تھی!۔۔۔یہ رونا۔۔۔۔شاید سچی روئی ہو۔۔۔میں نے بھی تو ایک اندھے کی طرح سے کہیں بھی چلنے دیا اپنے آپ کو۔آؤ دیکھا نہ تاؤ۔تاؤ کتنا اچھا تھا!۔۔۔مگر میں نے جواز پیدا کر لیا ہے۔ اس سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔۔۔دے دو روپے۔۔۔۔مگر کیوں؟ پہلے ہی میں نے اسے دو نیم کے پیسے دیے اور ایک ہی نیم دیکھا۔

مہی پت کے حیص بیص کو دیکھ کر کلیانی نے کہا۔۔۔"کیا سوچنے کو لگ گیا؟ دے دونا۔۔۔میرا بچہ تم کو دعا دے گا۔۔۔۔"

"تیرا بچہ؟!"

"ہاں۔۔تم نے نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔۔۔کہاں، کس سے لیا؟"

کلیانی ہنس دی۔ پھر وہ لجا گئی۔ اس پہ بھی بولی۔ ''کیا مالم کس کا؟ میرے کو سکل تھوڑا دھیان میں رہتا؟ کیا کھمر تمہارا ہو۔''

مہی پت نے گھبرا کر کرتے کی جیب، میں سے بیس روپے نکال کر کلیانی کے ہاتھ پر رکھ دیے جو ابھی تک برہنہ کھڑی تھی او جس کی کمر اور کولھوں پہ پڑا ہوا چاندنی کا پنکا چمک رہا تھا۔ ایک ہلکا سا ہاتھ کلیانی کے پیچھے تھپتھپاتے ہوئے مہی پت نے کچھ اور سوچ لیا۔ کلیانی نے ساری پکڑ کر لپیٹی ہی تھی کہ وہ بولا۔۔۔ ''اگر ایک ملائیم اور بیٹھ جاؤں تو؟ (پیسے دے دیے ہیں)''

''بیٹھو۔۔۔'' کلیانی نے بنا کسی جھجک کے کہا اور اپنی ساری اتار کر پلنگ پر پھینک دی۔ چلوں چلوں کرتا ہوا اس کا گوشت سب مار بھول چکا تھا۔ عقل حیوانی سے بھی تجاوز کر چکا تھا۔۔۔ لیکن مہی پت نے سر ہلایا۔۔۔ ''اب دم نہیں رہا!''

''ہوں''۔۔۔ کلیانی نے کہا۔۔۔۔ ''بہت جن آتا میرے ادھر پر تم سا کڑک ہم نہیں دیکھا' سچی۔۔۔ تم جاتا تو بہت دن یہ (ناف) ٹھکانے پہ نہیں آتا۔''

۔۔۔۔۔۔ چاند گڑھے پر سے سرک گیا تھا۔ کوئی بالکل ہی لیٹ جاوے تو اسے دیکھ پائے تبھی کلیانی مہی پت کا ہاتھ پکڑ کر اس کمرے میں لے آئی۔ جہاں گرجا' سندری' جاڑی وغیرہ تھیں۔ جاڑی مستری اور اس کے بعد ایک بوہرے کو بھی بھگتا چکی تھی۔ ایک سردار سے جھگڑا کر چکی تھی۔ جب مہی پت آیا تو اس نے کھر سید کے کہنی ماری اور بولی۔۔۔۔ ''آیا' کلیانی کا مرد!''۔۔۔ اس لیے کہ پہلے جب بھی مہی پت ادھر آیا تھا تو ہمیشہ کلیانی ہی کے پاس۔۔۔۔۔۔

کلیانی کے ساتھ کھولی میں آتے ہوئے' مہی پت نے باتھ روم کے پاس پڑی ہوئی گٹھری کو دیکھا جس کے پاس بیٹھی ہوئی گرجا اپنے پلو سے اسے ہوا کر رہی تھی۔ کلیانی نے گٹھری کو اٹھا لیا اور مہی پت کے پاس لاتے ہوئے بولی۔

''دیکھو دیکھو میرا بچہ۔۔۔۔''

مہی پت نے اس کچلے چار پانچ مہینے کے بچے کی طرف دیکھا' جسے گود میں اٹھائے ہوئے کلیانی کہہ رہی تھی۔۔۔ ''اسی ہلکٹ کو پیدا کرنے' دودھ پلانے سے ہم یہ ہو گیا۔ کھانے کو کچھ ملتا نہیں نا۔۔۔ اس پہ تم آتا تو۔۔۔۔۔''

پھر ایکا ایکی مہی پت کے کان کے پاس منہ لاتے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔ ''سندری کو دیکھتا؟ تم بولے اچھا تو ہم اگلے ٹیم سندری کو لا دے گا۔۔۔ نہیں نہیں۔ پرسوں ہم آپی اچھا ہو جائے گا یہ سب جگہ بھر

جائے گا نا۔۔۔۔۔" اور کلیانی نے اپنی چھاتی اور اپنے کولھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔" یہ سب' جن سے تم اپنا ہاتھ بھرتا' اپنا با جو بھرتا۔۔۔۔ٹھیک ہے۔ کچھ ہاتھ میں بھی تو آنا مانگتا۔۔۔ سندری کو لینا ہوئیں گا تو میرے کو بولنا۔ ہم سب ٹھیک کر دے گا۔ پر تم کو آنے کا میرے پاس۔ گرجا کے پاس نہیں آنے کا۔ اوجھنا اوں آں بوت کرتا۔ بوت نکھرا اس کا۔۔۔۔" اور پھر بچے کو اپنے بازوؤں میں جھلاتے ہوئے کلیانی بولی۔۔۔" ہم اس کا نام اچمی رکھا۔"

"اچمی۔اچمی کیا؟"

" یہ تو ہم کو نہیں مالم۔۔۔" کلیانی نے جواب دیا اور پھر تھوڑا ہنسی۔۔۔" کوئی آیا تھا کسٹمر' بولا۔۔۔میرا تیرے کو ٹھہر گیا تو اس کا نام اچمی رکھنے کا۔ یہ ہم نہیں بولنے سکتا' اسی کا ٹھہرا کہ کس کا' پر نام یاد رہ گیا میرے کو۔ او تو پھر ایا چ نہیں اور تم بھی کوچھ نہیں بولا۔" اور پھر اور ہنستے ہوئے بولی۔۔۔" اچھا۔ اگلے ٹیم دیکھیں گا۔۔۔۔"

مہی پت نے ایک نظر اچمی کی طرف دیکھا اور پھر ارد گرد کے ماحول کی طرف۔ یہاں پلے گا یہ بچہ! بچہ۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا' ان لڑکیوں کے پاس آتا ہوں تو میں کوئی پاپ نہیں کرتا۔ یہ دس کی آشا رکھتی ہیں تو میں بیس دیتا ہوں۔۔۔ یہ بچہ؟!

یہاں تو دم گھٹتا ہے۔۔۔ جاتے سمے تو گھٹتا ہی ہے۔۔۔۔

مہی پت نے جیب سے پانچ کا نوٹ نکالا اور اسے بچے پہ رکھ دیا۔

"یہ اس دنیا میں آیا ہے' اس لیے یہ اس کی دکشنا۔"

"نہیں نہیں۔ یہ ہم نہیں لیں گا۔"

"لینا پڑے گی' تم انکار نہیں کرسکتیں۔"

پھر واقعی کلیانی انکار نہ کرسکی بچے کی خاطر؟ مہی پت نے کلیانی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔۔۔" مجھے معاف کردو کلیانی۔ میں نے سچ مچ آج تم سے جانوروں کا سلوک کیا ہے" لیکن مہی پت کی بات سے یہ بالکل پتہ نہ چلتا تھا کہ اب وہ ایسا نہ کرے گا۔ ضرور کرے گا وہ۔ اس بات کا تو نشہ تھا۔ سے بیر تو فالتو سی بات تھی۔

کلیانی نے جواب دیا۔۔۔" کوئی بات نہیں۔ پر تم آج کھلاص کر دیا' مار دیا میرے کو۔" اور وہ یہ شکایت کچھ اس ڈھب سے کر رہی تھی' جیسے مرنا ہی تو چاہتی تھی وہ۔ کیا اس لیے کہ پیسے ملتے ہیں' پیٹ پلتا ہے؟ ۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ہاں' جب بھوک سے پیٹ دکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دنیا میں سارے مرد ختم ہو گئے۔

عورتیں مر گئیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مہی پت نے پوچھا۔۔۔۔۔"یہ اچھی لڑکا ہے یا لڑکی؟"

ایک عجیب سی کرن نے کلیانی کے "پٹے" مار کھائے ہوئے چہرے کو منور کر دیا اور وہ چہرے کی پنکھڑیاں کھولتے ہوئے بولی۔۔۔۔"چھوکرا!"

پھر کلیانی نے جلدی اچھی کا لنگوٹ کھولا اور دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اچھی کے لڑکے پن کو مہی پت کے سامنے کرتی اتراتی ہوئی بولی۔۔۔"دیکھو دیکھو۔۔۔۔۔۔"

مہی پت کے منہ موڑتے ہی کلیانی نے پوچھا۔۔۔۔۔"اب کبھی آئیں گا؟"

"جلدی۔۔۔۔۔" مہی پت نے گھبرا کر جواب دیا اور پھر وہ باہر کہیں روشنیوں میں منہ چھپانے کے لیے نکل گیا۔

رحمان مذنب

پُتلی جان

تالیوں کی گونج میں ایک گھر آباد ہوا دوسرا برباد ہوا۔

پتلی جان کا آنا تھا کہ جانی کے یہاں صف ماتم بچھ گئی۔ ذرا کشائش پیدا ہونے کو آئی تھی کہ پٹ بند ہو گئے۔ پہلے ہی وہ کب نہال تھا کہ آفت کا نیا پہاڑ سر پر آن گرا' غریب نے جو سنہرے خواب دیکھے کھنڈر ہوئے' جو سوچا وہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

اس کے چوبارے کا حال خستہ تھا۔ کڑیاں ایک تو دھوئیں کی کالونچ سے اتنی بھیانک ہو رہی تھیں جیسے چڑیلوں نے اپنی ننگی بانہیں پھیلا دی ہوں' دوسرے جگہ جگہ سے تڑخ گئی تھیں۔ ان کے کڑاکے بول رہے تھے۔ پوری چھت سن رسیدگی کے باعث دم توڑ رہی تھی اور وہ جوانی ہی میں دم توڑنے لگا تھا لیکن امید کب اسے دم توڑنے دیتی تھی۔

جو حال چھت کا سو دیواروں اور فرش کا۔ ہر روز کنستر بھر پلستر جھڑتا۔ فرش کی ٹیپ تو ٹیپ اینٹیں تک اکھڑ چکی تھیں۔ اور اب جانی کی چولیں اکھڑ رہی تھیں۔ کھرا اچھا خاصا چوبچہ بن گیا تھا اور اسے دیکھ دیکھ کر کبھی کبھی سوچتا یہیں چلو بھر پانی میں ڈوب مروں' اس کے چوبارے کی مرمت ہونے والی تھی' راج مزدور سے بات کر لی تھی گچ گارے کا حساب لگا لیا تھا اینٹوں کا سودا کر لیا تھا کہ ہوا کا رخ پلٹ گیا۔ امید ہی نہ رہی کہ اس کے چوبارے کی بھی سنی جائے گی۔ پھر بھی جانی کی بڈی کری تھی۔ ہمت ہارنے والی آسامی نہ تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو پتلی جان کی شکل دیکھتے ہی زہر پھانک لیتا۔

جانی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے بکھرے بالوں میں اطمینان سے کنگھی پھیری اور پھر وہیں بیٹھ گیا اور '' سجن گھر آ جا'' والا مخصوص گیت گانے لگ گیا۔ نیچے بازار میں چائے والے نے ریڈیو اونچا کر کے جانی کی آواز دبا دی لیکن جانی نے پروانہ کی' وہ کسی کو سنانے کے لیے تھوڑی گا رہا تھا یہ تو اس کے اندر کی آواز تھی جو دل سے دل تک تھی۔

حاجی تنکا پر کیسے بھروسہ رہا؟ جانی کا سہارا تو ٹوٹ ہی گیا۔ اس خود غرضی کی کوئی حد تھی؟ تلی جان کا برابر کے چوبارے میں آنا تھا کہ جانی اس سے کٹ کر الگ ہو گیا۔

جانی نے نئے کپڑے پہن اور لپ سٹک لگا کر آرسی میں چھب دیکھی۔ چہرے پر گلاب کی ہلکی ہلکی رنگت تھی' لانبا قد' لانبا چہرہ' ستواں ناک' بڑی بڑی آنکھیں۔ اسے وہ دن یاد آیا جب اس کا چوبارہ میلا اور خستہ نہ تھا۔ یہاں نئی دری بچھی تھی اس پر اجلی چاندنی تھی' پورے کمرے میں چمک دمک تھی' اجلاہٹ تھی اور وہ لمحہ کتنا فرحت انگیز تھا اور انمول تھا جب حاجی تنکا نے اچانک آ کر اس زور سے بھینچا کہ وہ چیخ کر رہ گیا' اس دن حاجی تنکا نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا تھا'' جانی پیارے بٹیرے کو کنگنی دی ہے۔ جی توڑ کر لڑے گا۔ تیری قسم! سب کو بھگل کر دے گا' ہمارے بٹیرے کی دنیا عاشق ہے بتا! تیری رضا کیا ہے؟''

پھر وہ بٹیر کو تو بھول گیا اور شراب کے گرد ہو گیا۔ دیسی کی پوری بوتل چڑھا گیا اس نے نشے میں آ کر جانی کا برا حال کر دیا۔ جیسے کسی نے نئی روئی دھنک کر رکھ دی ہو۔

جوانی میں تیز تیز سوئیاں چبھیں' دیر تک جانی کے بدن میں میٹھی میٹھی ٹیسیں اٹھتی رہیں' کوئی اسے تند اور جلادانہ وحشت سے نوچ لے تو وہ اف نہ کرے۔ اسے تو مزا ہی تب آئے' جب نرم نرم رگوں میں میٹھے میٹھے مگر تیکھے تیکھے کانٹے رینگنے لگیں لیکن کوئی اس کا اپنا بنے تبھی تو حاجی تنکا کا بٹیر بڑا اجی دار نکلا' اس نے سب بٹیروں کو میدان سے بھگا دیا' جانی اس کا ہو گیا' فتح یابی کی خوشی میں چوبارے پر تمام رات گانا بجانا ہوتا اور شراب کا دور چلتا رہا' پھر نہایت وسیع پیمانے پر حرب وضرب کی محفل گرم رہی۔

پھر زمانہ بدلا' نیت بدلی' نئی دری رہی' نئی چاندنی رہی نہ چوبارے کا اجلا پن وہ شب بیداری' وہ گرم بازاری جاتی رہی' یہ سب کچھ ہوا تو جانی کی جان پر ہوا' اجڑا تو اس کا چوبارہ اجڑا۔ برابر والا چوبارہ رشک جنت بن گیا۔ اس سے جانی کے سینے پر سانپ نہ لوٹتے تو کیا ہوتا؟

برابر والے چوبارے کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ جب سے موتی شاہ پکڑا گیا اور جوئے کا اڈہ بند ہوا تب سے یہ اجڑا پڑا تھا۔ یوں تو جانی کا چوبارہ بھی کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بن کر رہ گیا تھا تاہم یہ آس تھی کہ ایک نہ ایک دن مولا مشکل کشا کے یہاں اس کی سنی جائے گی بلکہ قریب قریب سنی ہی گئی تھی پھر جانے کس کی دعا کا الٹا اثر ہوا کہ جانی کا چوبارہ کھٹائی میں پڑ گیا اور برابر والے چوبارے پر ہن برس پڑا۔ صابر شاہ کی خانقاہ پر تو وہ روز ہی ننگے پاؤں جاتا لیکن شاہ جی کی نظر چوک گئی اور دھوکے میں ہمسائے پر جا پڑی۔

موتی شاہ کا بوسیدہ چوبارہ پھر سے آباد ہو گیا۔ تلی جان کے آنے سے جانی کا پتا تو کٹا لیکن اس نے بڑی عقلمندی سے کام لیا چڑھتے سورج کی پوجا نہ کرو پر اس کی نندا بھی نہ کرو! جانی کم از کم اس اصول کا

قائل تھا۔ اس نے حوصلہ کر کے چھاتی پر وہ پتھر رکھ لیا جس نے اس کا مکان ڈھایا تھا' اسے ڈھایا تھا۔ تِلّی جان نے اس کے دن اس کی راتیں چھین لیں۔

تِلّی جان کے لیے تین دن کے اندر اندر پرانا چوبارہ نیا ہو گیا۔ بوسیدہ چھت ادھیڑ کر نئی چھت ڈالی گئی۔ پلستر ہوا' ٹیپ ہوئی' سفیدی ہوئی اور یہ سب کچھ جانی نے جی کڑا کر کے دیکھا۔ وہی مصالحہ جسے جانی کے چوبارے میں کھپنا تھا تِلّی جان کے چوبارے میں لگا۔

ایک بار تو مستری بھولے سے تگاری تیشہ لیے جانی کے چوبارے پر ہی چڑھ آیا۔ پر جانی نے کولھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ "ہائے ہائے صابر سائیں ہمارا نہیں تِلّی کا ہے۔ اس نے ہوا کا رخ پھیر دیا تو ادھر کیوں آیا ہے؟ مسالہ میرے ہی چوبارے کا ہے پر لگے گا برابر کے چوبارے میں۔ مستری تیرا بھلا ہو جہاں کی مٹی ہے اسے وہیں لگا! اب یہ اپنے یہاں نہیں لگے گی۔" اس نے ترتالے میں تالیاں مارتے مارتے کہا۔

مستری ہنس کر نیچے اتر آیا لیکن جانی دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے یہ غم نہ تھا کہ اس کا چوبارہ مرمت سے رہ گیا اور تِلّی جان کے چوبارے کی سنی گئی۔ اسے تو یہی غم کھانے لگا کہ تِلّی جان نے اس کے چوبارے کی گہما گہمی لوٹ لی۔ کون اپنا بھرا گھر اجڑتا دیکھ سکتا تھا؟ جسے قہقہوں کی برکھا میں رہنے کا چسکا پڑا ہو وہ تنہائی میں کیسے رہے؟

حاجی تنکا نے یوں آنکھیں پھیر لیں جیسے اسے جانی سے کبھی تعلق خاطر ہی نہ رہا ہو حالانکہ دونوں کا نکاح پڑھا گیا تھا اور پھوپھی کریم بخش مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے مٹھائی بانٹی تھی۔ خلیفہ جی ابھی زندہ تھے۔ انہی کے ایما پر نکاح ہوا تھا لیکن حاجی تنکا اب کسی کی سنتا ہی نہ تھا۔ وہ تو صاف کہتا۔۔۔ "نکاہ وکاہ کوئی چیز نہیں یونہی ڈھکوسلاہ ہے۔ من کا سودا ہے۔ وہار بیوپار ہے۔ جب تک موج آئی جانی سے یارانہ رکھا اور جب موج نہ رہی یارانہ توڑ دیا۔ کسی کا ٹھیکہ تو نہیں کہ یارانہ توڑو ہی نہیں۔

جانی کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ حاجی تنکا نکاح کر کے مکر گیا۔ اس میں جانی کی بڑی بدنامی تھی کون اپنی بدنامی گوارا کرتا؟ اس کی تو ناک ہی کٹ گئی۔ برادری میں باتیں ہوئیں۔ ہستی ہی مٹ گئی اس کی دو کوڑی کا نہ رہا۔ اب وہ لوگوں کی نظروں میں جچتا ہی نہ تھا۔ نیا یارانہ ہوتا اور ٹوٹ جاتا تو وہ اتنا اثر نہ لیتا' سبکی بھی نہ ہوتی۔ تِلّی جان نے جانی کے یار کو نہیں اس کے خصم کو ہتھیایا تھا اور اسے سب کی نظروں سے گرا کر خاک میں ملایا تھا جانی خلیفہ جی کے پاس جا کر رویا پیٹا لیکن وہ بے چارہ کیا کرتا۔ اس نے محض اتنا کہا۔۔۔ "جانی صبر کر! مولا مشکل کشا تیری سنے گا اور تجھ پر اپنا فضل کرے گے۔ تو راستی پر ہے۔ مولا مشکل کشا سچوں کا ساتھ دیتا ہے۔ گھبرائے بات نہیں بنتی۔"

جانی نے صبر تو کرلیا پر وہ کبھی کبھی یہ ضرور سوچتا کہ خلیفہ جی پتلی جان کو منع کیوں نہیں کرتے کہ کسی کو رسوا اور ذلیل نہ کرے۔ قصور آخر پتلی جان کا بھی تو تھا لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ پتلی جان کو یہاں آئے آخر دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو وہ خلیفہ جی کی بڑائی کا قائل بھی نہ ہوا ہوگا۔ خلیفہ جی کا حکم تو اسی پر چل سکتا جو ان سے عقیدت رکھتا۔

جانی کا چوبارہ جانی سمیت اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کا سہاگ قضا نے لوٹ لیا۔ چوبارے کا سارا پلستر اور ملبہ اس کے اوپر آ گرا۔ سانس لینا اور جینا دوبھر ہو گیا۔ برابر والے چوبارے سے جب قہقہوں کا وحشتناک شور اٹھتا تو اسے بھالے لگتے اور سینہ چھلنی چھلنی ہو جاتا۔ اس کا چوبارہ دوزخ کا ایسا ٹکڑا بن گیا جہاں سب سے بڑا عذاب نازل ہو رہا ہو۔ ایسے میں اگر جانی سانس لیتا اور جیتا رہا تو یہ اس کے حوصلے کی خوبی تھی۔

رزق خدا دیتا ہے۔ چنانچہ جانی بھی بھوکا نہیں رہا۔ سینے کی مشین اس کے پاس تھی۔ اس نے صابر سائیں کے مزار پر جا کر دعا مانگی۔ خلیفہ جی سے مشورہ لیا اور باوفا منکوح کی طرح زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چوبارہ چھوڑ کر ایک چھوٹی سے دکان پر جا بیٹھا۔ عذاب جہنم قدرے کم ہوا۔ پتلی جان کا ستارہ دیکھتے دیکھتے زمین سے آسمان پر جا پہنچا۔

عجیب اتفاق تھا۔ بازار کے جس حصے میں پتلی جان کا چوبارہ تھا اس کا کوئی نام نہ تھا ممکن ہے' اس کی یہ وجہ ہو کہ وہاں کبھی کوئی لیڈر پیدا نہ ہوا البتہ لیڈروں کا ادھر گزر ضرور تھا۔ چھوٹے موٹے لیڈر اور موری ممبر تو وہاں رات گزارنے میں بھی مضائقہ نہ سمجھتے لیکن ایسے عارضی لیڈروں کے نام پر بازار کا نام نہ پڑ سکتا تھا۔ علاقائی لیڈر تھے سو انہوں نے بھی معاملے کی نزاکت پر کبھی توجہ نہ دی۔ ایسی اہم جگہ اور نام سے محروم رہے حالانکہ الیکشن کے دنوں میں ان کی توجہ ایک ایک اینٹ' ایک ایک کواڑ' ایک ایک کھڑکی' ایک ایک دکان' مکان اور چوبارے پر رہی۔ ووٹ کے سلسلے میں وہ نوٹ لیے لیے پھرے' بیسیوں بار خلیفہ جی اور پتلی جان سے ملے بلکہ ایک لیڈر نے تو ایسے سنہری موقع پر بیٹے کی ولادت کو غنیمت جانا اور بازار بھر کو پتلی جان کے ناچ گانے سے نوازا۔

ایک طرف کھلی سڑک تھی جو نورے پہلوان کے اکھاڑے کو نکل جاتی اور دوسری طرف رنڈی بازار تھانے تک پھیلا ہوا تھا۔ درمیان میں فرلانگ بھر کا یہ بے نام ٹکڑا تھا جسے لوگ رفتہ رفتہ پتلی بازار کہنے لگے۔

جانی کو بجا طور پر رنج تھا وہ یہاں کب سے آباد تھا لیکن کسی نے اس کے نام پر بازار کا نام نہ رکھا۔

اسے تو حاجی تنکا نے گھر میں ڈال کر برباد کیا۔

پتلی بازار بہت جلد مقبول ہوگیا۔ اس نام ہی میں جادو کا اثر تھا۔ اگر اسے شیخ شریف کے نام سے موسوم کرتے جس کا علاقے کی تین چوتھائی جائداد پر قبضہ تھا یا صابر سائیں کے نام سے فائدہ اٹھاتے تب بھی بازار کی شہرت کو ایسے چار چاند نہ لگتے جیسے اب لگے تھے۔ بازار آسانی سے لوگوں کی زندگی میں داخل ہوگیا۔ نہ کسی وزیر نے رسم افتتاح ادا کی نہ بورڈ چسپاں ہوا۔ نہ اخبار میں خبر چھپی۔ بات ہونے والی تھی سو ہوگئی۔

جو شوقین مزاج رنڈی بازار کی سیر کو آتے وہ پتلی بازار سے ہو کر جاتے' بڑے غور سے بازار کی جان کو دیکھتے اور قدرت کے ہنر کی داد دیتے۔ بعض تماش بین کچے بھی ہوتے جو ایسے گم ہوتے کہ پتلی بازار ہی کے ہو رہتے۔

ایک حاجی تنکا ہی نہیں پتلی جان پر سارا جہان مرنے لگا۔ کون تھا جو ادھر سے گزرتا اور پتلی جان کا دیدار کئے بغیر چل دیتا۔ لوگ اسے اس انہماک سے دیکھتے جیسے وہ عالم بالا سے اتری ہوئی نعمت ہو اور اسے دیکھنے سے مریض شفایاب ہو جاتے ہوں۔

پتلی جان کی رنگت ایسی تھی جیسے گورے پن اور سانولے پن نے بیاہ رچایا ہو جیسے صندل کے شربت میں مالٹے کا رس ملایا ہو۔ سارا بدن بے داغ تھا۔ پنڈلیاں اور بانہیں ولایتی کانچ کی طرح صاف اور چکنی تھیں۔ ان پر ہاتھ یوں پھسلتے جیسے ریشمی کپڑوں پر گرم گرم استری۔ آنکھیں یوں مٹکتیں جیسے نور بھرے تالاب میں ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی ہوں' لمبی لمبی پلکیں بڑی بڑی آنکھوں پر سایہ ڈالے رہتیں۔ مکھڑا تھا کہ چاند پر شفق نکھری تھی۔ کلائی پر زنانہ گھڑی چمکتی رہتی۔ انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں جگمگ جگمگ کرتیں۔ کانوں میں ٹاپس چمکتے۔ عید بقرعید پر وہ گلے میں سونے کا ہار ڈال لیتا۔

مولسری کے پھول اس کی جان تھے۔ ہمیشہ دیر سے اٹھتا اور سورج جتنے بانس چاہے اوپر چلا جائے وہ مولسری کے پھول چننے ضرور باغ میں جاتا۔ مولسری کے پیڑوں میں ایسی جاذبیت نہ تھی اور پھول دیکھنے میں ایسے خوشنما بھی نہ تھے لیکن خوشبو دلپذیر تھی۔ مٹھی میں سمیٹ کر انہیں سونگھتا تو یوں آنکھیں میچ لیتا جیسے میٹھے میٹھے' سنہری سنہری خواب اس کی سوچ میں گھل مل رہے ہوں' وہ ایسے انمول دیس میں کھو جاتا جہاں صرف کیف ہو' صرف لذت ہو' صرف مہک ہو۔

ملگجے ملگجے پھول اپنے اندر امنگوں کا طوفان سمیٹے رہتے' پتلی جان کے ہاتھ لگاتے ہی یہ بکھر جاتا۔ مولسری کے پھول کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ پھلیرے نے موتیا اور چنبیلی کے ساتھ مولسری کے پھول اور ہار بھی رکھنے شروع کر دیئے۔ پتلی جان حاجی تنکا کی دکان پر آ کر بیٹھتا تو پھلیرا بھی آ کر کھڑا ہو جاتا

اور وہیں کھڑے کھڑے مولسری کے ہار بک جاتے۔ تپلی بازار میں صرف مولسری کے ہار بکتے۔ انہیں ٹھکانے لگا کر پھلیرے کو رنڈی بازار کا رخ کرنا پڑتا۔ جہاں موتیے اور چنبیلی کے چٹی چاندنی جیسے ہار بکتے۔

جب کوئی قدر دان مولسری کا ہار خرید کر تپلی جان کے گلے میں ڈالتا اور اسے بازو سے پکڑ کر دکان سے اٹھا کر لے جاتا تو حاجی تنکا کو بڑا تاؤ آتا لیکن وہ کیا کرتا؟ تپلی جان نہ تو اس کا منکوح تھا اور نہ ہی وہ تپلی جان کا بوجھ اٹھا سکتا جو دن میں دو دو بار کپڑے بدلتا اور ہر ہفتے ریشمی سوٹ سلواتا۔ پیز سوپ کی ٹکیہ سے چھترے کو نہلاتا۔ تکیوں کے غلاف اور بستر پوش روز بدلواتا' نئی نئی قمیصیں' شلواریں اور دو پٹے اس بے تکلفی سے مہترانی کے حوالے کر دیتا جیسے دادا جی کی فاتحہ کے لیے بہت بڑے حلوائی کی دکان مل گئی ہو۔۔۔۔۔ اسے حاجی تنکا کیونکر اپنے کھاتے میں ڈالتا۔ ادھر تپلی جان ایک کے ہو جانے کی قباحتوں سے آگاہ تھا۔ جانی کا حال اسے معلوم تھا۔

جانی کا گزارہ بھی صبر وقناعت پر تھا اور حاجی تنکا کا بھی۔ دونوں کا مرض ایک نہ تھا لیکن علاج ایک ہی تھا۔ صبر وقناعت امرت دھارا ثابت ہوا۔

تپلی جان جونہی بازار میں آتا سب کی نظریں اس کا خیر مقدم کرتیں۔ گاموں کی دکان کے پھلوں سے لدے پھندے چھبے اسے اپنی طرف بلاتے۔ ریڈ بلڈ مالٹے' سنگترے' سیب اور انار گاموں کی جانب سے خیر سگالی کا پیغام دیتے۔ سردیوں کے ایام میں انہی سے دکان کی بہار ہوتی۔ منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا تو گاموں کی دکان پر چلا جاتا اور مالٹے سنگترے اٹھا کر چھیلنے لگتا۔ کبھی کبھی چھیلتے چھیلتے باریک سی پھوار اس کی آنکھوں میں جا گرتی اور وہ ایکدم آنکھیں میچ لیتا۔ گاموں جھٹ دھوتی کا پلو اٹھا کر آنکھیں پونچھ دیتا۔ تپلی جان کو اس سے کسی قدر سکون ملتا اور وہ مالٹے سنگترے کھانے میں مشغول ہو جاتا۔۔۔۔ تپلی جان منہ کا ذائقہ بدل کر جانے لگتا تو گاموں اپنے منہ کا ذائقہ بدلنے کی غرض سے اسے ٹھہرالیتا' پکڑ لیتا: ور تالی بجا بجا کر ''یاری لائیں تے نبھائیں سجنا'' گاتا۔

گاموں ہر موسم کا پھل لاتا۔ جب مالٹے سنگترے کم یابی کی وجہ سے صرف بیماروں کے خریدنے کے لائق رہ جاتا تب بھی وہ تپلی جان کی خاطر ضرور لاتا۔ کبھی کیلے لاتا اور تپلی جان انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے پھل کی جانب ہاتھ بڑھاتا تو گاموں اس کی کلائی تھام کر بول اٹھتا۔ ''سوہنیا! ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! مولا جانے بڑا شیریں ہے'' ۔۔۔۔۔ پھر بن پوچھے چھلکا اتارتا اور کیلا اس کے ہونٹوں کے قریب لے جا کر کہتا ۔۔۔۔ ''شہزادیا! دکان تیری ہے جو من میں آئے کھا لیکن ذرا یہ کیلا بھی کھا کر دیکھ! اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے۔''

یہ درست ہے کہ کیلے لذیذ ہوتے' گھلے ہوئے' میٹھے اور خوشبو دار لیکن پتلی جان ہمیشہ ان سے کتراتا مگر جتنا کتراتا گاموں اتنا ہی ستاتا آخر کیلے کھا کر ہی پتلی جان کی خلاصی ہوتی۔

جانی یہ سب کچھ دیکھتا اور جی ہی جی میں کڑھتا۔ کیلے کھانے کو اس کا بھی جی چاہتا لیکن گاموں اسے جھوٹے منہ بھی نہ پوچھتا۔ تنہائی کی گھڑیاں کاٹنے کے لیے ہولے ہولے تالی بجاتا اور گنگناتا۔

حاجی تنکا بھی جلتا۔ جانی کو دھتکار کر اس نے اپنی کشتیاں جلا دی تھیں اور سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ کیوں نہ لگاتا؟ پتلی جان چیز ہی ایسی اونچی تھا۔

حاجی تنکا نے دکان کا جائزہ لیا۔ اس کی دکان پر تو پان سگرٹ ہی ملتے اور پتلی جان کا صرف انہی پر گزارہ نہ تھا۔ اسے گاموں کے مسکراتے' جگمگاتے' ہنستے بولتے پھلوں کے تازہ انبار اپنی طرف کھینچ لیتے۔ حاجی مجبور تھا۔ وہ پھل پھلاری کے دھندے سے بالکل ناواقف تھا۔ ہاں پتلی جان کو خوش کرنے اور گاموں سے اس کا پیچھا چھڑوانے کی نیت سے سوچ سوچ کر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ وہ منڈی جا کر سستے داموں تھوڑا تھوڑا پھل لانے لگا۔ تھڑے پر جگہ بنا کر ٹوکرا جما دیتا لیکن اس سے کچھ بات نہ بنی۔ تجربہ چنداں کامیاب نہ ہوا۔ گاموں کی دکان پر جو بہار تھی وہ یہاں کہاں؟ اور پھر پتلی جان کے انگ انگ میں دن بھر جوانی انگڑائیاں لیتی رہتی یہ مستیاں کب کل پڑنے دیتیں۔ انگڑائیاں ٹوٹتی ہی بھلی لگتیں۔ وہ انگڑائیاں لئے گاموں کی دکان پر گئے بغیر نہ رہتا۔

گاہک تو گاہک پتلی جان نے بھی حاجی تنکا کے پھلوں پر توجہ نہ دی۔ وہ مالٹے لائے تو پتلی جان سیب کھانے گاموں کی دکان پر جا پہنچے۔ وہ سیب لائے تو پتلی جان سردہ کھانے گاموں کے پاس چلا جائے۔

حاجی تنکا سمجھ گیا کہ پتلی جان کو صرف پھل ہی سے نہیں گاموں سے بھی رغبت ہے۔ جہاں تک اڈے کا تعلق تھا حاجی تنکا کی دکان سے بہتر بازار میں کوئی اڈہ نہ تھا۔ پڑے کے ایک طرف اتنی جگہ تھی کہ پتلی جان کی چوکی بچھ جائے۔ سر پر ایک تختے کے اوپر ریڈیو جما رکھا تھا۔ برابر میں نامی گرامی پہلوانوں اور ایکٹرسوں کی تصویریں لگی تھیں۔ دکان کے وسط میں بجلی کا بلب آویزاں تھا۔ چوبارے سے اتر کر آتا۔ بیٹھنے کو جی چاہتا تو پتلی جان یہیں آ بیٹھتا۔ ایک تو یہاں نمائش ٹھیک سے ہوتی' دوسرے سب شوقین مزاج سہولت سے جمع ہو جاتے۔ کوئی تھڑے پر بیٹھ جاتا اور کوئی سامنے کھڑا ہو جاتا۔ پان سگریٹ کا دور چلتا۔ چھیڑ چھاڑ ہوتی لطیفے چلتے ہنسی مذاق کی باتیں کی جاتیں اور گاہک پھنستے۔ گاہکوں کا موڈ بنانے میں یہ اڈہ اہم کردار ادا کرتا۔۔۔ اور کہیں یہ بات نہ تھی۔

گاموں کی دکان پتلی جان کا اڈہ نہ بن سکتی تھی۔ وہ اور ہی قسم کا آدمی تھا۔ اس روانی اور بے تکلفی

سے مخول کرتا کہ اچھے اچھوں کے منہ پھیر دیتا۔ پتلی جان اس کے یہاں جا کر بیٹھتا تو گاہک بدک جاتے کسی کو اس سے بالمشافہ گفتگو کرنے ہی نہ دیتا اور کسی کی پروا کیے بغیر اسے کھڑے کھڑے دوہرا کر کے اس کے آدھے بدن کو تھڑے پر ہی چت کر دیتا۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس کے بدن میں مچلتی ہوئی انگڑائیوں کو توڑ رہا ہو۔ بے چارے کے کپڑوں میں سلوٹ پڑ جاتے اور انہیں دھول لگ جاتی۔۔۔۔ پتلی جان کو اس کا یہ جارحانہ انداز بھلا لگتا لیکن وہ زیادہ دیر یہاں نہ ٹھہرتا۔ تھوڑا سا پھل کھایا ذرا کی ذرا کے لیے گاموں کے پیار کا تختہ مشق بنا اور وہاں سے چل دیا۔

گاموں کی زبان گندی تھی اور طبیعت میں درندگی تھی۔ اس کی نسبت حاجی تنکا کی زبان میں مٹھاس اور شائستگی تھی وہ آدمی بھی نرم طبع تھا نہ تو مخول بازی میں مہارت رکھتا اور نہ پتلی جان کے گاہکوں کو بھگاتا۔ سچ پوچھو تو اس کی دکانداری پتلی جان کی وجہ سے چمک اٹھی جسے پان سگریٹ کی عادت نہ تھی اسے بھی ان کا چسکا پڑ گیا۔ کوئی خود پیے نہ پیے۔ پتلی جان کو تو پان کھلانے اور سگریٹ پلانے میں اپنی نجات ضرور سمجھتا۔ حاجی تنکا پتلی جان کا احسان مند تھا اور اسی لیے اسے گاموں کی دکان پر جانے سے نہ روکتا۔ پتلی جان کو کس کی محتاجی اور کس بات کی کمی تھی؟ حاجی تنکا ماتھے پر تیوری ڈالے تو وہ اٹھ کر جیجے کے قہوہ خانے میں چلا جائے اور پھر گاہک بھی وہاں پہنچ جائیں۔۔۔۔ ویسے بھی حاجی تنکا کا حساب آدھی رات کے بعد شروع ہوتا جب تماش بین اور استاد صاحبان رنڈیوں کے کوٹھوں پر سے اٹھ کر آتے اور نشے کی ٹوٹ میں اس سے رجوع کرتے تو وہ انہیں نمٹا کر ہی دکان بڑھاتا۔ یہی اس کے آخری گاہک ہوتے اس کے بعد وہ چوبارے پر جاتا اور پتلی جان سے رجوع کرتا۔ پتلی جان اس آخری اور مستقل گاہک کو نمٹانے میں بخل سے کام نہ لیتا۔

سورج نکلنے سے پہلے ابھی سارا پتلی بازار بند ہوتا کہ جیجے کا قہوہ خانہ کھل جاتا۔ لال لال کوئلوں کی گود میں دھری ہوئی کیتلیوں کی ٹونٹیوں سے بھاپ ناچتی ناچتی نکلتی اور ہوا میں غائب ہو جاتی۔ کیتلیوں کے اندر گدگدیاں اٹھتیں اور چائے کا تیز تیز فلیور پتلی جان کو پاس بلاتا۔

جیجا چائے بناتا اور خوش الحانی کے ساتھ کبھی ''میرے مولا بلا لو مدینے مجھے'' کا ورد کرتا اور کبھی ''پتلی کمریا' ترچھی نجریا'' کی رٹ لگاتا۔

دن چڑھے پتلی جان کی آنکھ کھلتی تو وہ انگڑائیاں لیتا لیتا کھڑکی میں آ بیٹھتا۔ جیجا اسے دیکھتے ہی زور سے سیٹی بجاتا۔ پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے بلاتا۔ کچھ دیر تو پتلی جان متوجہ ہی نہ ہوتا۔ بس انگڑائیاں لیے جاتا اور اس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے حسن کی کمانیں چلہ چڑھا رہی ہوں کسی آتش فشاں سے قوس قزح ابھر رہی ہو۔ اس کے ساتھ اردگرد پھیلی ہوئی کائنات انگڑائیاں لینے لگتی۔ جوں جوں انگڑائیاں لیتا' نیند کا نشہ

ٹوٹتا۔ ذرا ہوش آتا تو جیجے کی طرف دھیان دیتا۔ جیجا بند ڈبل روٹی پر مکھن لگاتے لگاتے یا چائے بناتے بناتے مسکراتا اور کہتا ۔۔۔۔۔''میری جان! چوبارے کا کھیڑا چھوڑ ذرا ہمارے پاس آ! ہماری خاطر چائے کی ایک پیالی ہی پی لے!''

پتلی جان کی بڑی بڑی آنکھیں دور سے نیم خوابیدہ ستارے کی طرح مستی میں کھوئی ہوئی نظر آتیں۔ بڑے انداز سے صراحی دار گردن ہلا کر کہتا۔۔۔۔۔''ہونہہ' جسے کلیجے میں آگ لگانی ہو وہ چائے پیے۔''

ادھر دولا حرامی بھی چپ نہ رہتا۔ پرانے سینما کی سیڑھیوں پر جیجے کے چائے خانے کے عین سامنے' پتلی جان کے چوبارے سے ذرا دور اس کا سری پائے کا دیگچہ کھلا رہتا اور پتلی جان کو دعوت دیتا۔ آنکھ مار کر کہتا۔۔۔۔''پیارے! ذرا ہم پر بھی نظر سوتی ہو گرما گرم مال ہے۔ مغز اور مکھ ملا دوں گا۔ آتو سہی۔ داتا جانے جلوہ آجائے گا۔''

بھجا پھاڈی اپنے تھڑے پر کھڑا ہو کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی جیجے کے قہوہ خانے کو اور کبھی دولے حرامی کے دیگچے کو دیکھتا۔ پھر دھوتی کے پلو اٹھا اٹھا کر پنکھا جھلنے لگتا۔ ساتھ ساتھ پتلی جان کی طرف دیکھ کر ہنستا جاتا۔ پتلی جان منہ پھیر لیتا تو وہ تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا۔

صبح صبح بھجے پھاڈی کو کون خاطر میں لاتا؟ ہاں! دوپہر آتی۔ اس کے یہاں کونڈی ڈانڈا کھڑکتا تو پتلی جان وہاں چلا جاتا۔ اس وقت حاجی تنکا' گاموں' جیجا' دولا حرامی اور خلیفہ جی بھی آجاتے۔ کبھی کبھی جانی بھی کچھ دیر کے لیے آجاتا۔ پیالہ سبھی کدورتیں اور رقابتیں دور کر دیتا۔

پتلی جان کی ریشمی اور سرمئی آنکھوں کی پیالیاں مستی سے لبریز ہو جاتیں۔ ہونٹوں پر ہنسی رقص کرنے لگتی اور بہار نکھر آتی۔ گاموں گھڑا سنبھال لیتا اور ترنگ میں آکر گانے لگتا۔ دیر تک محفل جمی رہتی' گرمی کٹ جاتی اور پھر ادھر پتلی جان نہانے کے لیے اٹھتا ادھر محفل بکھر جاتی۔

جسے سب چاہیں اسے ایک آدمی کیسے بس میں لائے؟ حاجی تنکا یہی غنیمت سمجھتا کہ پتلی جان اس کی دکان پر آ بیٹھتا اور اس کی دکانداری کو چار چاند لگا دیتا۔

اسی دکان' اسی تھڑے اور اسی چوکی پر جہاں اب پتلی جان بیٹھتا کبھی جانی بیٹھتا تھا اور اس سے کہیں زیادہ دیر تک مسلسل بیٹھتا لیکن اتنی بکری کبھی نہ ہوئی۔ پتلی جان تھوڑی دیر بیٹھتا اور جب قدردان ہجوم کر آتے اور اسے زیادہ ستاتے تو اٹھ کر ادھر ادھر کھسک جاتا اس پر بھی حاجی تنکا کی بن آتی۔ پانوں کی ڈھولی دو دن میں غائب اور کم از کم سگریٹ کا ایک بڑا ڈبہ بھی لیمن کے ادھے الگ درجنوں کے حساب سے اٹھتے۔

گرمی سردی سے خاص اثر نہ پڑتا۔ البتہ پھل نہیں بکے۔

تپلی جان کا مزاج درویشانہ تھا۔ اس میں پیسے کا لالچ تو رتی بھر نہ تھا۔ بازار والوں سے یوں پیش آتا جیسے اس کے اپنے ہوں۔ ججے کی چائے' گاموں کے پھل اور دولے حرامی کے سری پائے رائیگاں نہ جاتے۔ وہ ان سب کا حق پہچانتا اور فرض جان کر ادا کرتا۔ یار لوگ خالی ہاتھ چوبارے پر آتے لیکن جو چاہے پالیتے۔ پھجے پھاڈی کا قرض اس کی دکان پر ہی چکا دیتا۔ رہا حاجی تنکا کا معاملہ سو وہ گھر کی بات تھی۔ تپلی جان کی آدھی رات اس کے پاس گروی پڑی تھی۔ مندا ہوتا تو حاجی تنکا بوریت ٹالنے کے لیے ہیر یا ماہیا گانے لگتا۔ کوٹھوں سے آنے والے آخری گاہکوں کو نمٹانے کے بعد ہی تپلی جان کے پاس جاتا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد نیند بڑی پیاری لگتی لیکن زندگی فقط نیند نہیں۔ زندگی کا ایک ضروری مقام تپلی جان تھا۔ یہیں وہ رات کو قیام کرتا۔ شب خون میں نیند حرام ہو جاتی۔ ایسے میں چوبارے پر صرف تین چیزیں ہوتیں ایک چیز وہ خود تھا' دوسری چیز تپلی جان تھا اور تیسری چیز شراب تھی۔ شراب کی اس کے یہاں کمی نہ تھی کیونکہ وہ اس کی بلیک کرتا تھا

تپلی جان کو حاجی تنکا کی ذات سے اور تو کوئی خاص فائدہ نہ تھا ہاں اتنی بات تھی کہ ہر وقت کی غمخواری کو ساتھی میسر تھا۔ وقت بے وقت آڑے آتا۔ ویسے تو خدا کے فضل سے کتنے ہی ایسے قدردان تھے جو اس کے اشارہ ابرو پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے لیکن وہ دکھڑا ہر کسی کو کیسے کہہ سنا سکتا تھا؟

تپلی جان کو کوئی لمبا چوڑا غم نہ تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار اپنے آپ کو اس بھری پری دنیا میں اکیلا اکیلا سا محسوس کرنے لگتا۔۔۔۔۔۔ جیسے اس کا کوئی دردمند نہ ہو' جیسے وہ سمندر کے اس پار کھڑا ہو جدھر جہازوں کا گزر نہ ہو۔ جیسے اس کے شاندار حال میں اداس اداس مستقبل جھانک رہا ہو۔ وہ سوچتا' کوئی آفت نہ آ جائے جو اس کی سہانی زندگی کا شیرازہ منتشر کر دے' اسے اس ہنستے کھیلتے' ناچتے گاتے بازار سے دور کر دے۔ گاہے گاہے اسے فکر بھی دامنگیر ہوتا کہ چند سال بعد جب چہرے کے بالوں میں سختی آ جائے گی اور ان کی کھونٹیاں نکالنے میں دشواری پیش آئے گی پھر کیا بنے گا؟ ابھی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ٹھوڑی پر چند بال تھے۔ موچنا لے کر بیٹھ جاتا تو چند منٹ میں انہیں صاف کر لیتا اور جلد یوں نکل آتی جیسے چودھویں کی چاندنی میں نکھرے ہوئے گلاب کی ملائم ملائم پتیاں۔ ججا اسے تازہ ڈبل روٹی کی طرح ملائم خیال کرتا اور گاموں اناس کے گودے کی طرح نرم و لذیذ۔ ایسی اداسی کے عالم میں تپلی جان گم سم حاجی تنکا کی دکان پر جا بیٹھتا اور ہولے ہولے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتا۔ حاجی تنکا مزاج آشنا تھا۔ وہ تو یہی چاہتا کہ تپلی جان یونہی اداس اور شوخیوں شرارتوں سے باز رہے۔ اسے دیکھ کر حاجی تنکا بھی اداس ہو جاتا اور اداسی کے یہ دونوں مجسمے ایک

دوسرے کے مثالی ساتھی معلوم ہوتے۔

دولت بڑی چیز سہی لیکن چلی جان اس سے بھی بے نیاز تھا۔ دولت پیدا کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا پھر اسے وہ ہاتھ کا میل سمجھتا اور شیخ شریف مہینے کے مہینے کرایہ لینے آتا تو نہایت بے پروائی سے نوٹ پھینک دیتا جنہیں شیخ شریف اس احتیاط سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا جیسے ان کا کوئی اعتبار نہ ہو، جیسے انہیں پیسے لگے ہوں۔ چلی جان کے ہاتھ کا میل اسے جان سے بڑھ کر عزیز تھا۔ یہی میل ہر سال گچ گارے میں تبدیل ہو کر دکانوں، چوباروں اور کوٹھوں کی شکل اختیار کر لیتا اور پھر ان کی بدولت نیا میل اکٹھا ہونے لگتا۔ اسی میل کے طفیل اس نے موٹر خریدی جسے وہ تب استعمال کرتا جب اسے بڑے لوگوں سے ملنے جانا پڑتا ورنہ اپنی کٹڑی میں تو وہ یوں رہتا جیسے یہ بھی دوسروں کی طرح کوئی کرایہ دار ہو۔ وہ بالکل بوسیدہ دیوار کی ٹوٹی پھوٹی اینٹ لگتا۔۔۔۔۔ چلی جان کے یہاں بڑا میل تھا۔ جانے یہ میل کہاں کہاں سے بہنے کو آتا۔ کوئی اس چوبچے کا کیمیائی تجزیہ کرتا جو چوبارے کے پرنالے کے عین نیچے واقع تھا اور جسے منگو دن میں تین چار بار صاف کرتا تو شاید کچھ پتہ چلتا۔

شروع شروع میں چلی جان نے پیسے کی ضرور پروا کی اور اس سلسلے میں حاجی تنکا کا احسان اٹھاتا رہا، چوبارے کی مرمت بھی اسی نے کروائی لیکن بہت جلد اس کے یہاں ہن برسنے لگا اور وہ غنی ہو گیا۔ جیبوں میں، طاق میں، تکیے کے نیچے، پلنگ کی نواڑ میں، فرش پر اِدھر اُدھر نوٹ پڑے رہتے۔ اب حاجی تنکا کا روپوں والا صندوقچہ پڑا رہتا اور چلی جان اسے ہاتھ تک نہ لگاتا۔ روپے کے بل پر حاجی تنکا اسے زیر نہ کر سکتا تھا۔ ہاں پیسے کے بغیر اسے جیت لیتا تو اور بات تھی۔ پیار بڑی چیز ٹھہری۔

پہلے تو اس نے چلی جان کو چوبارہ لے کر دیا۔ پھر اسے اپنا اڈہ دیا، چوبارے میں اس کے سنگ ڈیرے ڈالے، دکان میں دھری ہوئی چارپائی سونی کی، دکان اسے سونپ دی جس دن وہ سگریٹ کا کوٹہ لینے اور سودا سلف خریدنے جاتا چلی جان کو دکان پر بٹھا جاتا۔ چلی جان بے تکلفی سے پیسے نکال کر فقیروں اور بندر نچانے والوں کو دے دیتا۔ کبھی کبھی سارا بھان ٹھکانے لگا دیتا۔ حاجی تنکا کچھ نہ کہتا۔

حاجی تنکا کھانے پکانے کا بندوبست بھی چوبارے ہی پر کر لیا کرتا۔ وہ اس کام میں طاق تھا۔ جانی بھی بڑا کاریگر تھا لیکن حاجی تنکا کا لوہا مانتا۔ جب بھی جانی بیمار پڑا تو اسی نے چولھا سنبھالا۔

ادھر قصائی نے ریڑے سے گوشت اتارا اور ادھر حاجی تنکا سر پر سوار ہوا۔ سب سے اچھی بوٹی چھانٹ کر لاتا۔ دوپہر کی ہانڈی تیار کر کے چلی جان کے سامنے لا دھرتا۔ دونوں مل کر کھاتے۔

جانی بڑے صبر والا تھا اور کوئی ہوتا تو جان ہا کان کر بیٹھتا۔ وہی تھا کہ آنکھوں کے سامنے سارا

تماشا دیکھتا اور اف تک نہ کرتا۔ حاجی تنکا تو پتلی جان کا اتنا گرویدہ ہو چکا تھا کہ جیسے وہ فلمی ہیروئن کا ہیرو ہو۔ جانی وفادار، جاں نثار اور تابعدار تھا لیکن حاجی تنکا نے کبھی اس پر یوں جان نہ چھڑکی۔

ضبط کرنے کو تو کر لیا جاتا لیکن انسان پھر انسان ٹھہرا پتھر نہیں جس دن پتلی جان ریشمی شلوار سلوانے کی نیت سے جانی کے یہاں گیا تو اسے دیکھتے ہی جانی بھڑک اٹھا۔ اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ساٹن کا جھلملاتا ہوا لال ٹکڑا شعلہ بن کر اس کی آنکھوں سے ٹکرایا۔ غصے کا طوفان اٹھا اور پتلی جان پر ٹوٹ پڑا۔ پہلے تو اس نے بے تحاشا گالیاں فرمائیں اور پھر کمر سے پکڑ کر اسے زمین پر پٹخ دیا سینے پر چڑھ بیٹھا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر اسے لہولہان کر دیا۔

شلوار اور قمیض کی دھجیاں ہوا کے جھونکے اڑا کر لے گئے۔

ساٹن کی چندیاں گلے میں لپٹائے اور دھول میں سن کر جب پتلی جان آیا تو حاجی تنکا سامنے رو دیا اور بولا ''۔۔۔۔ مجھے داتا کوڑھی کر دے جو میں جھوٹ بولوں۔ مولا جانے میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ شلوار سینے کو ضرور کہا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا اسے مجھ سے بدلہ لینا تھا۔ کسی اور سے شلوار سلوا لیتی۔ جانی کا ٹھیکہ تھوڑی تھا۔''

جانی کا نام سنتے ہی حاجی تنکا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جانی کی یہ مجال کہ اس کے یار پر ہاتھ اٹھائے۔ اس نے برف توڑنے کا سوا لیا اور چھلانگ لگا کر دکان سے اترا۔ لپک کر جانی کی کوٹھری کی طرف گیا۔ جانی آنے والے طوفان سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے دور سے حاجی تنکا کو آتے دیکھا تو مضبوطی سے کواڑ بند کر لیا۔ حاجی تنکا کا خون کھول رہا تھا۔ اس نے پورے زور سے لات ماری لیکن کواڑ ڈھیٹ نکلا۔ نہ کھلا۔ ہاں پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ حاجی نے طیش آلود لہجے میں جھلا کر کہا۔۔۔۔ ''رانی خاں کے سالے! آج میں تیرا پیٹ پھاڑ کر دم لوں گا تو اپنے آپ کو بھولو پہلوان سمجھتا ہے میں یخنی بنا دوں گا۔ تیرے حمایتیوں کی ماں ۔۔۔۔۔۔ میں نے تیری بوٹی بوٹی نہ کی تو مجھے حاجی تنکا نہ کہنا حرام کا جنا ہوا کہنا۔''۔۔۔ دوبارہ آنے کی نیت کر کے لوٹ آیا۔

شیخ شریف کا خدا بھلا کرے جس نے مضبوط کواڑ لگوا رکھے تھے ورنہ آج جانی کا کام تمام ہو جاتا۔ دیر تک گود گرم کر کر کے پتلی جان حاجی تنکا کے پاؤں کی ٹکور کرتا رہا۔ اس وقت تو غصے کا بھوت سر پر سوار تھا۔ پتہ نہ چلا لیکن اب درد نے بے چین کر دیا۔ جب رات بھر ٹکور کرنے کے بعد بھی درد نہ گیا تو حاجی نے بے گوجر کو پاؤں دکھایا۔ بے گوجر نے پاؤں کو بے طرح جھٹکا دیا اور زور زور سے مالش کی تو حاجی کی چیخیں نکل نکل گئیں۔۔ معاملہ لمبا پڑ گیا۔

جیجے کو جانی کی حرکت اتنی اچھی تو نہ لگی لیکن وہ اسے اتنا خطاوار بھی نہ سمجھتا۔ ایک لحاظ سے تو جانی حق پر تھا۔ پکی جان لاکھ بے خطا سہی لیکن جانی کا خون اس کی گردن پر تھا اور اگر جانی نے بدلہ لیا تو کیا برا کیا؟ اسے اس کا حق پہنچتا تھا۔ پھر حاجی تنکا کہاں سے پکی جان کا خیر خواہ تھا پکی جان کا بدلہ لینے کو ایک حاجی تنکا ہی رہ گیا تھا؟ جیجا بھی تو بدلہ لے سکتا تھا اور اچھی طرح لے سکتا تھا۔ حاجی تو بالکل پاجی تھا۔ ایک جھانپڑ سے تو جانی کی جان نکل جاتی اور یہ ماں کا پہلوان سوالے کے چلا گیا تھا جیسے یہی تو بازار میں ایک غنڈہ رہ گیا تھا' باقی سب نے تو جیسے چوڑیاں پہنی تھیں۔

پکی جان چائے خانے میں آیا تو جیجے نے حسرت آلود لہجے میں شکایتاً کہا۔ ''پیارے! ہم بھی تیرے سجن ہیں۔ حاجی ہم سے بڑا غنڈہ تو نہیں۔ ہمیں کہنا تھا۔ ہم جانی سے بدلہ لے کر دکھاتے۔ اس ماں کے ماں بشک نے تو ٹانگ بھی تڑوائی اور بدلہ بھی نہ لیا۔ بھلا جانی بھی کوئی شے ہے؟ اس کی کیا ہستی ہے کہ تیری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے؟ کلیر والے کی سوں! میں اس کا لہو پی جاؤں۔''

پکی جان کی آنکھوں میں خوف جھلکا اور دل میں رحم کی لہر دوڑ گئی۔ بولا ''جس کا گھر اجڑا ہو وہ کیا کچھ نہیں کرتا؟ جانی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اسے تو حاجی پر رنج تھا غصہ مجھ پر نکالا۔''

''تیری خیر ہو! صابر پیر کی قسم! جانی بے قصور ہے۔ کوئی مرد ہوتا تو حاجی کا اندر پیٹا باہر کر کے چھوڑتا۔''

حاجی تنکا کا روگ بڑھتا ہی چلا گیا۔ بسا گوجر بڑا استاد تھا۔ پہلوان اترے ہوئے جوڑ اسی سے چڑھواتے لیکن قسمت کی بات ہے' حاجی تنکا کی ٹانگ ٹھیک نہ ہوئی۔ اب نہ تو وہ پابندی سے قصائی کی دکان پر جاتا اور نہ گرم جوشی سے چکی چولھا کرتا۔ گھر کا شیرازہ پریشان ہونے لگا۔

حاجی تنکا کے ٹخنے پر ہر وقت پٹیاں بندھی رہتیں اور وہ آہستہ آہستہ کراہتا رہتا۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے پینترے بدلتا اور پاؤں دباتا سہلاتا رہتا۔

وہی پکی جان تھا۔ وہی چوبارہ وہی فرصت شب تھی لیکن ٹخنے کے درد نے نظام زندگی درہم برہم کر دیا۔

دکان پر سکون نہ رہا۔ بیمار گھر کا ماحول پیدا ہو گیا۔ پکی جان کا دل کمزور تھا اور اس کی طبیعت نازک تھی۔ جب ذرا گھبراہٹ محسوس کرتا اٹھ کر گھومنے لگتا۔ حاجی تنکا کے پاس بہت کم تک کرتا تھا۔ ویسے بھی اب گھر کی ہانڈی کی لذت سے محروم ہو گیا تھا۔

جانی ہر تغیر بڑے اشتیاق سے دیکھتا' نئے نئے ٹانے بانے بنتا اور خوبصورت خوابوں سے مستقبل

کو سجاتا۔ بڑی باقاعدگی سے خلیفہ جی کے پاس جاتا' ان کی خدمت کرتا۔

جب تک دکان پر ٹھٹھا مخول کرنے والے جمع رہتے۔ محفل لگی رہتی۔ پتلی جان مزے سے بیٹھا رہتا۔ محفل ٹوٹتی تو وہ بھی ادھر ادھر کھسک جاتا۔ حاجی تنکا یہ سب کچھ دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا لیکن کچھ نہ کر پاتا۔ وہ اب ایک لمحے کے لیے بھی پتلی جان سے الگ نہ رہنا چاہتا۔ پتلی جان پر سو جان سے فدا تھا۔ اس کی خاطر اس نے گھر اجاڑا تھا۔

حاجی تنکا کے دل میں ایسی ایسی ٹیسیں اٹھتیں کہ جیسے اسے کوئی بار بار سولی پر چڑھا رہا ہو۔ برف کا وہی سوا جو اس نے جانی کا مغز چھیدنے کو اٹھایا تھا۔ آنکس بن کر اس کی کھوپڑی میں چبھتا رہتا۔ اسے ہر وقت یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی نشتر لے کر نہایت بے دردی سے اس کا سینہ کھرچ رہا ہو۔ پاؤں کا درد جو اسے رات رات بھر سونے نہ دیتا اب اس میں ایک نیا درد مل گیا نئی ٹیس اور نئی تڑپ پیدا ہو گئی۔

پتلی جان کی زندگی بھی جمی جمائی نہ رہی۔ پہلے گھر کا کھانا میسر تھا۔ اب وہ میسر نہ رہا۔ کھانے پینے کے پروگرام میں گڑبڑ آ گئی۔ کبھی دولے حرامی کی دکان پر ناشتہ کرتا کبھی جیجے کے چائے خانے میں جا کر رات اور دوپہر کا کھانا کھاتا' کبھی گاموں کے ساتھ کھاتا' کبھی اکیلا کھاتا۔ جیجے کا لونڈا اسے ہر چیز لا دیتا۔ پہلی سی بات نہ رہی۔ ایک وہ زمانہ کہ تنہائی محسوس ہوتی تو حاجی تنکا کی صحبت میں سکون مل جاتا اور ایک زمانہ کہ ہر شے گرد و غبار کی طرح بکھر کر رہ گئی۔۔۔ حاجی تنکا کی زندگی میں جو بدمزگی آئی تھی اس کا اثر پتلی جان پر بھی پڑا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ اس کا کیا علاج کرے۔ علاج معلوم نہ ہو تو آوارہ گردی ہی تکلیف رفع کرتی ہے چنانچہ اس نے آوارہ گردی بڑھالی۔ گاموں کی دکان' جیجے کے ہوٹل اور بھیجے پھاڈی کے اڈے کے دن بھر چکر کاٹتا لیکن طبیعت سیر ہوتی نہ چین ملتا۔ ہاں جانی کو ضرور چین ملا۔ وہ یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا کہ پتلی جان اب حاجی تنکا کی دکان پر برائے نام بیٹھتا اور جیجے کے چائے خانے میں منڈلی جماتا ہے دوپہر لونڈا لی اٹھ کر بھیجے پھاڈی کے یہاں جمتی وہی روز کا سماں بندھتا۔۔۔ بھنگ گھٹتی دور چلتے گھڑا بجتا تانیں اڑتیں اور۔۔۔۔۔ اس کے بعد پتلی جان نہانے کی غرض سے اٹھ آتا تو محفل تتر بتر ہو جاتی۔

حاجی تنکا کی دکان کے بعد جیجے کا چائے خانہ غنیمت ثابت ہوا اور پتلی جان نے وہاں سکون محسوس کیا۔ گپ باز آ جاتے اور وقت کٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ بیکلی کم ہوئی۔

حاجی تنکا کے پاس بیٹھتا تو جھٹ بیزار ہو جاتا۔ ایک تو حاجی کراہتا رہتا۔ دوسرے شکایتوں کا دفتر کھول بیٹھتا۔ پہلے کبھی اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا تھا اور اب وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے لگا تھا۔ وہ گاموں' دولے حرامی' بھیجے پھاڈی اور جیجے کے خلاف زہر اگلتا رہتا بلکہ پتلی جان کی بے

وفائی کا بھی گلہ کرتا۔

جانی کے ڈوبے ہوئے دل میں امید کی ہلکی ہلکی لہریں زور پکڑنے لگیں اور وہ سمجھنے لگا کہ مرجھائے ہوئے پھولوں میں جان پڑنے کی رت آ گئی ہے۔ ایک دن آنکھوں میں آنسو لیے خلیفہ جی کا پاس پہنچا اور ان کے پاؤں پکڑ کر بولا۔۔۔۔۔۔۔ آپ میرے پیر خانہ ہیں۔ دین دنیا میں مجھے بس آپ کا آسرا ہے۔ میں تھک ہار چکی ہوں۔ جیسے بھی بنے آپ میری مدد کریں۔ حاجی کو سمجھائیں۔ خواہ مخواہ اپنی مٹی پلید کر رہا ہے۔ مجھے اپنے برے دنوں کی لونڈی بنا لے۔"

پہلے تو خلیفہ جی نے سوچا معاملہ ان کے اختیار سے باہر ہے لیکن پھر جب جانی کے ٹپ ٹپ گرتے آنسو دیکھے اور چیخیں سنیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور مداخلت کریں گے۔

رات گئے حاجی تنکا اداسیوں کی گھنیری گھٹاؤں میں گھرا بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے گھمبیر تنہائی میں مرا جا رہا ہو۔ خلیفہ جی نے اسے اونچ نیچ سے واقف کرنا چاہا لیکن وہ تمام اونچ نیچ سمندر کی لہروں کے حوالے کیے بیٹھا تھا۔ اب تو اس کے سامنے گہرائی ہی گہرائی تھی۔ وہ کسی قیمت پر جانی کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسے پتلی جان سے پیار تھا۔

خلیفہ جی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور محبت کے اسرار و رموز سے کماحقہ آگاہ تھے۔ انہوں نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔۔۔۔۔۔۔ "حاجی تنکا! بن کا پنچھی پنجرے میں قید نہیں رہتا۔ پتلی جان کو کیا سمجھتے ہو؟ وہ آزاد طبیعت کی بندی ہے۔ اسے کسی سے پیار نہیں اور سب سے ہے اسے پابند نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک کی صفت الگ الگ ہوتی ہے۔ پتلی جان کو مولا نے نرالی طبیعت دی ہے۔ اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کو خوش رکھے اور ایک کو ناراض کرے۔ اس کی تو ایسی طبیعت ہے کہ خوش رکھے تو سبھی کو خوش رکھے۔ میری مانو جانی سے صلح کر لو! کہو تو پاؤں پکڑوا دوں معافی منگوا دوں۔ وہ تمہارے پاؤں دھو دھو پیے۔ مولا دستگیر جانے میں نے کبھی کسی کو غلط صلاح نہیں دی۔ مجھے پتلی جان سے بیر نہیں لیکن جو سچی بات ہے وہ سچی ہی ہے اور میں نے کہہ دی ہے۔

اس گفتگو نے حاجی کو سوچ میں ڈال دیا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ پہلے تو یوں لگا جیسے وہ کچھ کہے گا ہی نہیں، جیسے وہ بولنے کی تاب ہی نہیں رکھتا لیکن تھوڑی دیر بعد بولا "جانی کا نام نہ لو خلیفہ! اس نے مجھے برباد کیا ہے۔ اس کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے پتلی جان سے پیار ہے۔ آج نہیں تو کل اسے پا لوں گا۔ مجھے پتہ ہے لوگ اسے بہکا رہے ہیں لیکن اسے ضرور ٹھوکر لگے گی۔ جو لگ اسے بہکا رہے ہیں اسے دھوکا دیں گے پھر پتلی میرے پاس آئے گی۔"

خلیفہ جی کے جانے کے بعد حاجی تنکا کو دھچکا سا لگا۔ اسے یہ سن کر دکھ ہوا کہ پتلی جان کا آوارہ پن اسے ایک کا ہو رہنے پر آمادہ نہ کر سکے گا۔ اسے پہلے ہی روگ لگا تھا۔ اب یہ غم کھانے لگا کہ وہ پتلی جان کو سب کے پنجے سے چھڑا کر اپنا بنانے میں ناکام ہوا تھا۔

خلیفہ جی نہ آتے تو اچھا تھا۔ انہوں نے آ کر تو اور بھالے مار دیئے۔ وہ تو کب سے کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ اب یہ کانٹے اس کی روح کو بھی ڈسنے لگے۔ وہ اور زیادہ کراہنے لگا۔ جوں جوں سوچتا پتلی جان کا پیار تیکھا ہوتا جاتا اور کانٹے زیادہ شدت سے ڈسنے لگتے۔ وہ تو جیسے آندھی کا پیچھا کر رہا تھا۔ خلیفہ جی نے رہی سہی امید بھی توڑ دی۔ اسے جتا دیا کہ پتلی جان کی بے وفائی اٹل ہے۔

دل کی دنیا سونی ہوئی تو دوکان بھی سونی ہو گئی۔ جس کے دم قدم سے رونق تھی اسے حاجی تنکا کی پروا نہ تھی۔ گاہکوں کی آمد کم ہو گئی۔ اب تو وہی آتے جو پرانی وضعداری کے پابند تھے۔ سودا باقاعدگی سے نہ آتا۔ کبھی پان ہے تو کتھا چونا نہیں۔ قینچی کا سگریٹ ہے تو کیونڈر کا نہیں۔ بڑھتی ہوئی اداسی کے ساتھ ساتھ حاجی تنکا کا دل بیٹھتا جاتا۔ ڈوبا ہوا دل ابھرنا چاہتا لیکن رہ جاتا۔

ایک دن تو وہ اتنا غمزدہ ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دکان بند کر کے شیر شاہ کی درگاہ پر چلا گیا۔ یہاں آ کر اس کے دل میں روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور کشتی بھنور سے نکل کر کنارے آ لگی۔ اس نے درگاہ کے کنویں سے پانی نکالا اور وضو کیا۔ نہایت خشوع وخضوع سے درگاہ میں داخل ہوا۔ آج سے چند سال ادھر جب وہ حج کرنے گیا تھا تب بھی اس کے دل میں اس طرح عقیدت کا طوفان اٹھا تھا۔ اس نے قدموں کی طرف تعویذ کی جڑ میں سر رکھ دیا۔ اپنے پیار کی کامیابی کے لیے دعا مانگی۔ اسے پورا پورا یقین تھا کہ شیر شاہ اس کی سنیں گے اور مراد پوری کر کے رہیں گے۔ اس نے سر اٹھایا اور بیٹھ کر وہ دو چار آیتیں پڑھیں جو اس نے حج پر جاتے ہوئے حفظ کی تھیں۔ اس نے ساری رات درگاہ پر گزاری۔ کبھی سجدے میں جاتا اور کبھی بیٹھ کر آیتیں پڑھتا۔ ساتھ ساتھ آنسو بہاتا۔

فجر کی اذان ہوئی تو اسے نیند آ گئی۔ دن چڑھے تک آنکھ نہ کھلی۔ جانے کب تک یونہی پڑا رہتا کہ ایک زائر نے اسے جگا دیا۔ زائر کا خیال تھا کہ درگاہ کی حدود میں دعا مانگی جا سکتی تھی' سویا نہیں جا سکتا تھا۔ ٹانگ کی چوٹ کے بعد آج پہلی بار اسے نیند آئی کہ اسے جگا دیا گیا۔

رت جگے کی وجہ سے اس کا سارا بدن درد کرنے لگا۔ دکان پر جانے کی بجائے وہیں درگاہ کی بغل والے تکیے میں چلا گیا اور چرس کا سوٹا لگا کر ایک طرف میلی چٹائی پر سو رہا۔ دوپہر کے وقت اٹھا اور دوکان پر آیا۔

نیچے کے چائے خانے میں قہقہوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ حاجی کی طبیعت جو رات بھر کی ریاضت سے قدرے ہلکی ہوئی تھی۔ قہقہوں کا شور سن کر پھر بھر گئی۔ ایک کڑا بوجھ سینے پر آ گرا۔ پتلی جان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ پتلی جان نے حد کر دی۔ حاجی تنکا رات بھر غائب رہا' اس نے خبر تک نہ لی۔ حاجی تنکا نے دل میں کہا۔۔۔۔ ''ظالم کو لگن ہوتی تو ضرور اسے ڈھونڈ نکالتا اور شیر شاہ کی درگاہ پر پہنچتا۔''' یہ کون دور جگہ تھی؟ شاہی مسجد کے مقابل قلعے کے پیچھے ہی تو تھی۔ بہت ہو گا تو دس منٹ کا راستہ ہو گا۔ پتلی جان کو معلوم تھا کہ حاجی تنکا دکان سے اٹھ کر جاتا تو صرف تین جگہ جاتا۔۔۔۔۔ سودا سلف لینے بازار جاتا۔ سوٹا لگانے بودی سائیں کے تکیے میں اور دعا مانگنے شیر شاہ کی درگاہ پر جاتا۔

حاجی تنکا کو شیر شاہ سے بلا کی عقیدت تھی۔ زندگی میں کئی بار ان کے کمالات دیکھ چکا تھا۔ ایک دفعہ جب گنجا ٹھوٹھی جھانسہ دے کر جانی کو بھگا کر لے گیا تو شیر شاہ کی مہربانی سے جانی صحیح سلامت لوٹ آیا۔ چوری ہوئی تو شیر شاہ نے نظر کرم کی چور پکڑا گیا۔ مال برآمد ہو گیا۔ پھر پتلی جان بھی تو انہیں کی عنایت سے اسے ملا تھا۔

اس کے دل میں حسرت ہی رہی جب وہ درگاہ پر آنسو بہا رہا اور دعا مانگ رہا تھا اگر اس وقت شیر شاہ کرشمہ دکھاتے اور پتلی جان کو کھینچ لاتے تو کتنا مزہ آتا؟

حاجی تنکا چپ چاپ دکان پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد جیجا پتلی جان کے گلے میں ہاتھ ڈالے چائے خانے سے باہر نکلا۔ اگر گاموں پیچھے سے آ کر گھونسہ رسید نہ کرتا تو ہاتھ اپنی جگہ سے الگ نہ ہوتے۔
جیجا اور پتلی جان بھجے پھاڈی کے اڈے پر چلے گئے۔ حاجی تنکا دیکھتا ہی رہ گیا' اسے امید تھی کہ پتلی جان آئے گا اور حال پوچھے گا۔ لیکن کہاں؟ وہ ایسا غائب ہوا کہ جب بھجے پھاڈی کے اڈے سے اٹھ کر چوبارے پر گیا تو حاجی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔۔۔۔۔ حاجی لہو کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔
اگلے دن چراغوں کا میلہ تھا۔ چراغوں کے میلے سے حاجی تنکا کو بڑا عشق تھا۔ اس نے کبھی میلہ نہ چھوڑا تھا۔ جب بھی میلہ آتا وہ ایک ہفتہ پہلے سے تیاریوں میں لگ جاتا۔ جیجے' گاموں' بھجی' دولے اور سب دوستوں کو بلاتا۔ جانی کو شریک اجلاس کرتا اور پروگرام تیار کرتا۔ بڑی سرگرمی دکھاتا۔ ایک دن پہلے پارٹی اس کی قیادت میں شالامار پہنچ جاتی۔ یہ لوگ اچھی سے اچھی جگہ دیکھ کر خیمہ گاڑتے اور ڈیرے جماتے' گانے کی محفل لگتی۔ چائے پانی کے دور چلتے' مرغ بھنتے اور خوب گہما گہمی رہتی۔ کبھی یہ جوش و خروش تھا اور اب یہ حالت تھی کہ کسی نے سابقہ قائد کو بھولے سے بھی تو نہیں کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے۔ دنیا کیسی طوطا چشم تھی۔ گو اس میں جانے کی ہمت نہ تھی لیکن پتلی جان دعوت دیتا تو وہ چلنے کے لیے تیار ہو جاتا اور پاؤں کا درد بھول جاتا۔

وہ جان گیا کہ اسے جان بوجھ کر انظر انداز کیا گیا ہے۔

زوال کے بعد تِلّی بازار میں شور وغل ہونے لگا۔ گاموں نے ججے کو اور ججے نے تِلّی جان کو آواز دی تھوڑی دیر کے بعد بھجے پھاڈی نے تھڑے پر کھڑے ہو کر بازار کا جائزہ لیا۔ دولا حرامی خوانچہ سنبھال کر گھر جا رہا تھا۔ بھجے پھاڈی نے کہا۔ ''اوئے دولے حرام دے! اب تو نے دکان بڑھائی ہے' تیار کب ہو گا' میلے کو کب جائے گا؟''

دولے حرامی نے نہایت بے پروائی سے کہا' 'ماں کے یار! تجھے بڑی جلدی ہے تو بے شک چلا جا! میں تو اب جا کر تیاری کروں گا مجھے ساتھ لے لیا تو خیر صلا۔ نہیں تو میں اکیلا شالامار پہنچ جاؤں گا۔ مجھے راستہ آتا ہے۔''

''تیری خوشی پیارے! ہم تو تیار بر تیار ہیں۔

دولا حرامی خوانچہ اٹھا کر گھر چلا گیا اور بھجا پھاڈی تھڑے سے اتر کر نالی میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ گاموں ہرے رنگ اور لال دھاریوں والی ملتانی دھوتی اس پر دو گھوڑا بوسکی کا نیا کرتہ اور گلابی ریشمی مندیل پہن کر نکلا۔ گاہے شاہی نئی سرخ جوتی چمک رہی تھی گلے میں سونے کا کنٹھا بہار دکھا رہا تھا۔ مونچھیں سروں تک خوب بٹی ہوئی تھیں جیسے پولیس کے سپاہی ڈیوٹی پر ڈٹ رہے ہوں۔ تِلّی جان نے چوبارے میں بیٹھے بیٹھے دولہا کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔ گاموں نے زبان میں دو انگلیاں اڑا کر اس زور سے سیٹی بجائی کہ پورا تِلّی بازار گونج اٹھا۔ ججا سیٹی سنتے ہی دکان سے باہر نکل آیا۔ اس کی ترچھی لمبے شملے والی لنگی اور ڈھیلی ڈھالی شلوار فراغت اور چھٹی کا اعلان کر رہی تھی۔ کالر والی قمیض کی ایک جیب میں اصلی ریشم کا مہین گلناری رومال آدھا اندر اور آدھا باہر تھا۔

گاموں نے سگریٹ کا دھواں منہ سے اڑاتے ہوئے کہا۔ ''اوئے یار! میلے کب چلے گا؟'' ججے نے تِلّی جان کے چوبارے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ''جب ہمارا دلبر تِلّی جان چلے گا۔''

حاجی تنکا کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ ایک تو اس کا میلے سے رہ جانا ہی کم قیامت نہ تھا۔ پھر تِلّی جان کا ان سب کے ہجوم میں مل کر جانا تو اور بھی غضب تھا۔ کوئی کہاں تک صبر کرتا؟ حاجی کو تو کسی نے انگاروں پر لٹا دیا۔

تِلّی جان ابھی تک تیار نہ ہوا تھا۔ کھڑکی میں بیٹھا دوسروں کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ بال بکھر رہے تھے جیسے رات سایہ ڈال رہی ہو۔ کھلے گریبان میں سے بدن کا بے داغ' چمکتا دمکتا حصہ نظر آ رہا تھا جس نے شاید سحری سویرے بھیک مانگ لی تھی۔ ہونٹ پینے کے بعد سستی سی آ گئی تھی اور اس کا باسی مکھڑا پھیکی

مسکراہٹوں کے بوجھ تلے دب رہا تھا۔اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھیں بازار پر اس انداز سے پڑ رہی تھیں جیسے آفتاب کرنیں نچھاور کر رہا ہو۔وہ کبھی گاموں کو اور کبھی جیجے کو دیکھتا۔

"پھجے پھاڈی نے سب کو مات کر دیا۔ساجی درزی نے اپنے خاص الخاص مشورے اور اپنی مرضی سے میلے کے لیے اسے بش شرٹ سی دی جو اس نے شلوار پر ہی پہن لی حالانکہ ساجی نے پتلون بھی تیار کر دی تھی۔آنکھوں میں سرمہ ڈال کر گلفام بن گیا۔

حاجی سب کے ٹھاٹ دیکھ کر جل بھن گیا۔وہ ہر گز نہ چاہتا کہ تیلی جان ان کے ساتھ جائے وہ چاہتا تھا کہ میلے کا دن تیلی جان اس کے ساتھ گزارے۔اس کے پہلو میں بیٹھے اسے مدت ہی ہو گئی تھی۔آج تیلی جان کی اسے بڑی آرزو ہوئی۔تصور کی زبردست لہر اٹھی اور وہ اس میں بہہ گیا۔

دکان رہی نہ لنگڑا پاؤں اور نہ اس کی غمگین زندگی۔وہ خوبصورت محل سرا میں جا پہنچا جہاں تیلی جان اس کے انتظار میں بے قرار تھا۔نظروں سے نظریں ٹکرائیں بھرپور مستی دھیرے دھیرے آنکھوں میں سے ہو کر حاجی تنکا کے بدن میں سرایت کر گئی۔اس نے قریب جا کر تیلی جان کو بغلگیر کیا۔ہلکی ہلکی آنچ جذبات کو دم پخت کرنے لگی۔قریب ہی سنہری پلنگ پر ریشمی بچھونا لگا تھا۔بچھونا بالکل بجرا تھا اور اس پر نام کو سلوٹ نہ تھے لیکن پھر دیکھتے دیکھتے اس پر سلوٹ پڑنے لگے۔جو سلوٹ دلوں میں پڑ رہے تھے وہی سلوٹ پلنگ پر نمودار ہونے لگے۔دو زندگیوں میں بڑی بے تابی سے سلوٹ پڑنے لگے۔پھر یہ سلوٹ دو بے تاب زندگیوں کا دلفریب تصور اور محل سرا غائب ہوئے۔۔۔۔صرف غسل خانہ سامنے رہ گیا۔

نل کھلا تھا اور پانی یوں ٹپ ٹپ گر رہا تھا۔جیسے استاد انترے کے بول گا رہا ہو کبھی نل کی دھار ہلکی پڑ جاتی اور بول انترے سے اتر کر استائی پر آ جاتے۔غسلخانے کا کواڑ نیچے سے شکستہ تھا۔اس لیے اندر سے پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر باہر فرش پر پڑ رہے تھے۔

پلنگ پر گہرے نیلے رنگ کا ریشمی غرارہ دھرا تھا۔اس میں ازار بند بھی اسی رنگ کا پڑا تھا اگر سرے سنہرے تاروں سے گندھے نہ ہوتے تو ازار بند کا پتہ ہی نہ چلتا۔اس پر ہلکے نیلے رنگ کی لنن کی قمیض رکھی تھی اور برابر میں گہرے نیلے رنگ کا دوپٹہ پڑا تھا۔ایک طرف سرخ پرس رکھا تھا۔پلنگ کے نیچے سچے تلے کی جوتی دھری تھی۔گاموں' پھجا' پھاڈی' دولا حرامی' بودی سائیں' گنجا ٹھوٹھی' ساجی درزی اور جیجا سب چائے خانے میں بیٹھے بے قراری سے تیلی جان کے چوبارے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دولا حرامی بولا۔۔۔۔۔۔"یار تیلی نے تو بڑی دیر لگا دی۔"

پھجے پھاڈی نے جواباً کہا۔۔۔۔۔۔"معشوق کا کام دیر لگانا ہی تو ہے۔"

پھر میلے کے پروگرام پر گفتگو ہونے لگی۔ سڑک پر حسّو تانگے پر بیٹھا سوٹا لگا رہا تھا اور اس کا گھوڑا ہنہنا رہا تھا۔ ساتھ ہی کرمو اپنے ریڑھے پر ٹانگیں پسارے پڑا تھا۔

حسو جماہی لیتے ہوئے مایوسانہ انداز میں بولا۔۔۔۔۔ ''استاد جیجا! کتنی دیر اور ہے؟'' کرمو نے کان کھڑے کیے۔

جیجے نے بڑی بے تکلفی سے دو تین چالو قسم کی گالیاں فرمائیں اور پھر کہا۔۔ ''تجھے تو دیہاڑی پوری ملے گی۔ تجھے دیر سویر سے کیا؟''

''ہاں ٹھیک ہے۔ مجھے دیہاڑی چاہیے۔ دیر سویر سے کیا؟ اور تنا کہہ کر وہ سوٹا لگانے لگا۔ کرمو بھی تار کا سگریٹ نکال کر پینے لگا۔

ادھر نل بند ہوا۔ پانی کی ٹپ ٹپ رک گئی۔ کواڑ کھلا۔ تلی جان مسکراتا مسکراتا باہر نکلا اور اس کا ننگا بدن یوں چمکا جیسے چاند دھل کر طلوع ہوا ہو۔ ایک دم زور کی چیخ نکلی اور تیز چھری اس کی نرم و نازک پسلیوں میں دھنس گئی۔ بھاگ کر کوٹھے پر چڑھنے لگا لیکن حاجی تنکا نے اس دہشت زدہ گائے کو لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ لیا اور اسی ٹانگ کے نیچے دبا لیا جو لنگڑی تھی اور اب اس میں کوٹ کوٹ کر بجلی بھر گئی تھی۔ تلی جان فریادی گائے کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن قصاب نے رحم نہ کھایا بلکہ تیز چھری نرخرے پر رکھ کر حلق میں اتار دی۔ خون کی دھار نکلی اور حاجی تنکا کے کپڑے لال کر گئی۔

ایک مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔

ایک پھول دھول میں مل گیا۔

تلی جان کی لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی اور پھر بازار یوں سونا ہوا جیسے دلی اجڑی ہو۔

سعادت حسن منٹو

ہتک

دن بھر کی تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سوگئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی' ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور گھر واپس گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ رات کو یہاں بھی ٹھہر جاتا مگر اسے اپنی دھرم پتنی کا بہت زیادہ خیال تھا جو اس سے بے حد پریم کرتی تھی۔

وہ روپے جو اس نے جسمانی مشقت کے بدلے اس داروغہ سے وصول کیے تھے اس کی چست اور تھوک بھری چولی کے نیچے سے اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی سانس کے اتار چڑھاؤ سے چاندی کے یہ سکے کھنکھنانے لگتے اور اس کی کھنکھناہٹ اس کے دل کی غیر آہنگ دھڑکنوں میں گھل مل جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ان سکوں کی چاندی پگھل کر اس کے دل کے خون میں ٹپک رہی ہے۔

اس کا سینہ اندر سے تپ رہا تھا۔ یہ گرمی تو کچھ اس برانڈی کے باعث تھی جس کا ادھا داروغہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ اس "بیوڑا" کا نتیجہ تھی جس کا سوڈا ختم ہونے پر دونوں نے پانی ملا کر پیا تھا۔

وہ ساگوان کے لمبے اور چوڑے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں' پتنگ کی اس کانپ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔۔۔۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار مونڈنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔

کمرہ بہت چھوٹا تھا جس میں بے شمار چیزیں بے ترتیبی کے ساتھ بکھری ہوئی تھیں۔ تین چار سوکھے سڑے چپل پلنگ کے نیچے پڑے تھے جن کے اوپر منہ رکھ کر ایک خارش زدہ کتا سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کو منہ چڑا رہا تھا۔ اس کتے کے بال جگہ جگہ سے خارش کے باعث اڑے ہوئے تھے۔ دور سے آ کر کوئی اس کتے کو دیکھتا تو سمجھتا کہ پیر پونچھنے والا پرانا ٹاٹ دوہرا کر کے زمین پر رکھا ہے۔

اس طرف چھوٹے سے دیوار گیر پر سنگار کا سامان رکھا تھا۔ گالوں پر لگانے کی سرخی' ہونٹوں کی

سرخ بتی' پاؤڈر' کنگھی اور لوہے کے پن جو وہ غالباً اپنے جوڑے میں لگایا کرتی تھی۔ پاس ہی ایک لمبی کھونٹی کے ساتھ سبز طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا جو گردن کو اپنی پیٹھ کے بالوں میں چھپائے سو رہا تھا۔ پنجرہ کچے امرود کے ٹکڑوں اور گلے ہوئے سنگترے کے چھلکوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان بدبودار ٹکڑوں پر چھوٹے چھوٹے کالے رنگ کے مچھر یا پتنگے اڑ رہے تھے۔

پلنگ کے پاس ہی بید کی ایک کرسی پڑی تھی' جس کی پشت سر ٹیکنے کے باعث بے حد میلی ہو رہی تھی۔ اس کرسی کے دائیں ہاتھ کو ایک خوبصورت تپائی تھی جس پر ہز ماسٹرز وائس کا پورٹ ایبل گراموفون پڑا تھا۔ اس گراموفون پر منڈھے ہوئے کالے کپڑے کی بہت بری حالت تھی۔ زنگ آلود سوئیاں تپائی کے علاوہ کمرے کے ہر کونے میں بکھری ہوئی تھیں۔ اس تپائی کے عین اوپر دیوار پر چار فریم لٹک رہے تھے جن میں مختلف آدمیوں کی تصویریں جڑی تھیں۔

ان تصویروں سے ذرا ادھر ہٹ کر یعنی دروازے میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف کی دیوار کے کونے میں شوخ رنگ کی گنیش جی کی تصویر تھی جو تازہ اور سوکھے ہوئے پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ شاید یہ تصویر کپڑے کے کسی تھان سے اتار کر فریم میں جڑوائی گئی تھی۔ اس تصویر کے ساتھ چھوٹے سے دیوار گیر پر جو کہ بے حد چکنا ہو رہا تھا تیل کی ایک پیالی دھری تھی جو دیئے کو روشن کرنے کے لیے وہاں رکھی گئی تھی۔ پاس ہی دیا پڑا تھا جس کی لو ہوا بند ہونے کے باعث ماتھے کے تلک کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ اس دیوار گیر پر دھوپ کی چھوٹی بڑی مروڑیاں بھی پڑی تھیں۔

جب وہ بوہنی کرتی تھی دور سے گنیش جی کی اس مورتی سے روپے چھوا کر اور پھر اپنے ماتھے کے ساتھ لگا کر انہیں اپنی چولی میں رکھ لیا کرتی تھی۔ اس کی چھاتیاں چونکہ کافی ابھری ہوئی تھیں اس لیے وہ جتنے روپے بھی چولی میں رکھتی محفوظ پڑے رہتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی جب مادھو پونے سے چھٹی لیکر آتا تو اسے اپنے کچھ روپے پلنگ کے پائے کے نیچے اس چھوٹے سے گڑھے میں چھپانا پڑتے تھے جو اس نے خاص اس کام کی غرض سے کھودا تھا۔ مادھو سے روپے محفوظ رکھنے کا یہ طریقہ سوگندھی کو رام لال دلال نے بتایا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تھا کہ مادھو پونے سے آ کر سوگندھی پر دھاوا بولتا ہے تو کہا تھا۔۔۔۔۔۔ ''اس سالے کو تو نے کب سے یار بنایا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بڑی انوکھی عاشقی ہے۔۔۔۔۔۔ سالا ایک پیسہ اپنی جیب سے نکالتا نہیں اور تیرے ساتھ مزے اڑاتا رہتا ہے۔ مزے الگ رہے۔ تجھ سے کچھ لے بھی مرتا ہے۔۔۔۔۔ سوگندی مجھے کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ اس سالے میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو تجھے بھا گیا ہے۔۔۔۔۔ سات سال سے یہ دھندا کر رہا ہوں۔ تم چھوکریوں کی ساری کمزوریاں جانتا ہوں۔''

یہ کہہ کر رام لال دلال نے جو بمبئی شہر کے مختلف حصوں سے دس روپے سے لے کر سو روپے تک والی ایک سو بیس چھوکریوں کا دھندا کرتا تھا۔ سوگندھی کو بتایا۔۔۔۔"سالی! اپنا دھن یوں نہ برباد کر۔ تیرے انگ پر سے یہ کپڑے بھی اتار لے جائے گا۔ وہ تیری ماں کا یار!۔۔۔۔۔ اس پلنگ کے پائے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس میں سارے پیسے دبا دیا کر اور جب وہ یار آیا کرے تو اس سے کہا کر۔۔۔"تیری جان کی قسم مادھو آج صبح سے ایک دھیلے کا منہ نہیں دیکھا۔ باہر والے سے کہہ کر ایک کوپ چائے اور ایک افلاطون بسکٹ تو منگا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ سمجھیں؟ بہت نازک وقت آ گیا ہے میری جان۔۔۔۔۔ اس سالی کانگریس نے شراب بند کر کے بازار بالکل مندا کر دیا ہے۔ پر تجھے تو کہیں نہ کہیں سے پینے کو مل ہی جاتی ہے۔ بھگوان قسم، جب تیرے یہاں کبھی رات کی خالی کی ہوئی بوتل دیکھتا ہوں اور دارو کی باس سونگھتا ہوں تو جی چاہتا ہے تیری جون میں چلا جاؤں۔"

سوگندھی کو اپنے جسم میں سب سے زیادہ اپنا سینہ پسند تھا۔ ایک بار جمنا نے اس سے کہا تھا۔"نیچے سے ان بم کے گولوں کو باندھ کر رکھا کر۔ انگیا پہنا کرے گی تو اس کی سختائی ٹھیک رہے گی۔"

سوگندھی یہ سن کر ہنس دی۔"جمنا تو سب کو اپنے سری کا سمجھتی ہے۔ دس روپے میں لوگ تیری بوٹیاں توڑ کر چلے جاتے ہیں تو تو سمجھتی ہے کہ سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ کوئی موا لگائے تو ایسی ویسی جگہ ہاتھ۔۔۔۔۔۔ ارے ہاں کل کی بات تجھے سناؤں! رام لال رات کے دو بجے ایک پنجابی کو لایا۔ رات کا تیس روپے طے ہوا۔ جب سونے لگے تو میں نے بتی بجھا دی۔۔۔۔۔ ارے وہ تو ڈرنے لگا!۔۔۔۔ سنتی ہو جمنا؟ تیری قسم اندھیرا ہوتے ہی اس کا سارا ٹھاٹھ کرکرا ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ ڈر گیا۔ میں نے کہا چلو چلو دیر کیوں کرتے ہو! تین بجنے والے ہیں۔ ابھی دن چڑھ آئے گا۔۔۔۔۔ بولا۔۔۔۔۔ روشنی کرو۔۔۔۔ روشنی کرو۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا یہ روشنی کیا ہوا!۔۔۔۔ بولا لائٹ۔۔۔۔ لائٹ! اس کی بھنچی ہوئی آواز سن کر مجھ سے ہنسی نہ رکی۔ بھئی میں تو لائٹ نہ کروں گی! اور یہ کہہ کر میں نے اس کی گوشت بھری ران کی چٹکی لی۔۔۔۔۔۔ تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور لائٹ آن کر دی۔ میں نے جھٹ سے چادر اوڑھ لی اور کہا تجھے شرم نہیں آتی ہے مردوے!۔۔۔۔۔ وہ پلنگ پر آیا تو میں اٹھی اور لپک کر لائٹ بجھا دی۔۔۔۔۔ وہ پھر گھبرانے لگا۔۔۔۔۔ تیری قسم بڑے مزے میں رات کٹی۔۔۔ کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔ کبھی اجالا کبھی اندھیرا۔۔۔۔۔ ٹرام کی کھڑکھڑ ہوئی تو پتلون وتلون پہن کر وہ اٹھ بھاگا۔۔۔۔۔ سالے نے تیس روپے سٹے میں جیتے ہوں گے، جو یوں مفت دے گیا۔۔۔۔۔ جمنا تو بالکل الھڑ ہے۔ بڑے بڑے گر یاد ہیں مجھے ان لوگوں کے ٹھیک کرنے کے لیے۔"

سوگندھی کو واقعی بہت سے گر یاد تھے۔ جو اس نے اپنی دو ایک سہیلیوں کو بتائے بھی تھے۔ عام طور پر وہ یہ گر سب کو بتایا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔ "اگر آدمی شریف ہو' زیادہ باتیں کرنے والا ہو تو اس سے خوب شرارتیں کرو' ان گنت باتیں کرو۔ اسے چھیڑو' اس کے گدگدی کرو' اس سے کھیلو۔۔۔ اگر داڑھی رکھتا ہو تو اس میں انگلیوں سے کنگھی کرتے کرتے دو چار بال بھی نوچ لو۔ پیٹ بڑا ہو تو تھپتھپاؤ۔۔۔ اس کو اتنی مہلت ہی نہ دو کہ اپنی مرضی کے مطابق کچھ کرنے پائے۔۔۔۔ وہ خوش خوش چلا جائے اور تم بھی بچی رہو گی۔۔۔۔ ایسے مرد جو گپ چپ رہتے ہوں بڑے خطرناک ہوتے ہیں بہن۔۔۔۔ ہڈی پسلی توڑ دیتے ہیں اگر ان کا داؤ چل جائے۔"

سوگندھی اتنی چالاک نہیں تھی جتنی خود کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کے گاہک بہت کم تھے۔ غایت درجہ جذباتی لڑکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام گر جو اسے یاد تھے اس کے دماغ سے پھسل کر اس کے پیٹ میں آ جاتے تھے۔ جس پر ایک بچہ ہونے کے باعث کئی لکیریں پڑ گئی تھیں ان لکیروں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر اسے ایسا لگا تھا کہ اس کے خارش زدہ کتے نے اسے پنجے سے یہ نشان بنا دیئے ہیں۔۔۔۔۔۔ جب کوئی کتیا بڑی بے اعتنائی سے اس کے پالتو کے پاس سے گزر جاتی تو وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے زمین پر اپنے پنجوں سے اسی قسم کے نشان بنایا کرتا تھا۔

سوگندھی دماغ میں زیادہ رہتی تھی لیکن جوں ہی کوئی نرم و نازک بات۔۔۔۔ کوئی کومل بول اس سے کہتا تو جھٹ پگھل کر وہ اپنے جسم کے دوسرے حصوں میں پھیل جاتی۔ گو مرد اور عورت کے جسمانی ملاپ کو اس کا دماغ بالکل فضول سمجھتا تھا مگر اس کے جسم کے باقی اعضاء سب کے سب اس کے بہت بری طرح قائل تھے! وہ تھکن چاہتے تھے۔۔۔۔ ایسی تھکن جو انہیں جھنجھوڑ کر۔۔۔۔ انہیں مار کر سلانے پر مجبور کر دے! ایسی نیند جو تھک کر چور چور ہونے کے بعد آئے۔ کتنی مزیدار ہوتی ہے۔۔۔۔ وہ بے ہوشی جو مار کھا کر بند بند ڈھیلے ہو جانے پر طاری ہوتی ہے۔ کتنا آنند دیتی ہے۔۔۔۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ہو اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نہیں ہو اور اس ہونے اور نہ ہونے کے بیچ میں کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ تم ہوا میں بہت اونچی جگہ لٹکی ہوئی ہو۔ اوپر ہوا' نیچے ہوا' دائیں ہوا' بائیں ہوا' بس ہوا ہی ہوا اور پھر اس ہوا میں دم گھٹنا بھی ایک خاص مزا دیتا ہے۔

بچپن میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھی اور اپنی ماں کا بڑا صندوق کھول کر اس میں چھپ جایا کرتی تھی' تو ناکافی ہوا میں دم گھٹنے کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کے خوف سے وہ تیز دھڑکن جو اس کے دل میں پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ کتنا مزا دیا کرتی تھی۔

سوگندھی چاہتی تھی کہ اپنی ساری زندگی کسی ایسے ہی صندوق میں چھپ کر گزار دے جس کے باہر ڈھونڈنے والے پھرتے رہیں۔ کبھی کبھی اس کو ڈھونڈ نکالیں تاکہ وہ بھی ان کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ زندگی جو وہ پانچ برس سے گزار رہی تھی' آنکھ مچولی ہی تو تھی۔ کبھی وہ کسی کو ڈھونڈ لیتی تھی اور کبھی کوئی اسے ڈھونڈ لیتا تھا۔۔۔۔۔بس یوں ہی اس کا جیون بیت رہا تھا۔ وہ خوش تھی اس لیے کہ اس کو خوش رہنا پڑتا تھا۔ ہر روز رات کو کوئی نہ کوئی مرد اس کے چوڑے ساگوان کے پلنگ پر ہوتا تھا اور سوگندھی جس کو مردوں کے ٹھیک کرنے کے بے شمار گر یاد تھے اس بات کا بار بار تہیہ کرنے پر بھی کہ وہ ان مردوں کی کوئی ایسی ویسی بات نہیں مانے گی اور ان کے ساتھ بڑے روکھے پن کے ساتھ پیش آئے گی' ہمیشہ اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جایا کرتی تھی اور فقط ایک پیاسی عورت رہ جایا کرتی تھی۔

ہر روز رات کو اس کا پرانا یا نیا ملاقاتی اس سے کہا کرتا تھا۔ ''سوگندھی' میں تجھ سے پریم کرتا ہوں۔'' اور سوگندھی یہ جان کر کہ وہ جھوٹ بولتا ہے بس موم ہو جاتی تھی اور ایسا محسوس کرتی تھی جیسے سچ مچ اس سے پریم کیا جا رہا ہے۔۔۔۔ پریم۔۔۔۔ کتنا سندر بول ہے۔ وہ چاہتی تھی' اس کو پگھلا کر اپنے سارے انگوں پر مل لے۔ اس کی مالش کرے تاکہ یہ سارے کا سارا اس کے مساموں میں رچ جائے۔۔۔۔۔ یا پھر وہ خود اس کے اندر چلی جائے۔ سمٹ سمٹا کر اس کے اندر داخل ہو جائے اور اوپر سے ڈھکنا بند کر دے۔ کبھی کبھی جب پریم کرنے اور پریم کئے جانے کا جذبہ اس کے اندر بہت شدت اختیار کر لیتا تو کئی بار اس کے جی میں آتا کہ اپنے پاس پڑے ہوئے آدمی کو گود میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دے اور لوریاں دے کر اپنی گود ہی میں سلا دے۔

پریم کرنے کی اہلیت اس کے اندر اس قدر زیادہ تھی کہ ہر اس مرد سے جو اس کے پاس آتا تھا وہ محبت کر سکتی تھی اور پھر اس کو نباہ بھی سکتی تھی۔ اب تک چار مردوں سے اپنا پریم نباہ ہی تو رہی تھی جن کی تصویریں اس کے سامنے دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ہر وقت یہ احساس اس کے دل میں موجود رہتا تھا کہ وہ بہت اچھی ہے لیکن یہ اچھا پن مردوں میں کیوں نہیں ہوتا' یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔۔۔۔۔ ایک بار آئینہ دیکھتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔۔۔۔ ''سوگندھی! تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا۔''

یہ زمانہ یعنی پانچ برسوں کے دن اور ان کی راتیں اس کے جیون کے ہر تار کے ساتھ وابستہ تھا۔ گو اس زمانے سے اس کو خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی' جس کی خواہش اس کے دل میں موجود تھی تاہم وہ چاہتی تھی کہ یوں ہی اس کے دن بیتے چلے جائیں۔ اسے کون سے محل کھڑے کرنا تھے جو روپے پیسے کا لالچ کرتی۔ دس روپے اس کا عام نرخ تھا جس میں سے ڈھائی روپے رام لال اپنی دلالی کا کاٹ لیتا تھا۔ ساڑھے سات

روپے اسے روز مل ہی جایا کرتے تھے جو اس کی اکیلی جان کے لیے کافی تھے اور مادھو جو پونے سے بقول رام لال دلال' سوگندھی پر دھاوے بولنے کے لیے آتا تھا تو وہ دس پندرہ روپیہ خراج بھی ادا کرتی تھی۔ یہ خراج صرف اس بات کا تھا کہ سوگندھی کو اس سے کچھ وہ ہو گیا تھا۔ رام لال دلال ٹھیک کہتا تھا اس میں ایسی بات ضرور تھی جو سوگندھی کو بہت بھا گئی تھی۔ اب اس کو چھپانا کیا ہے بتا ہی کیوں نہ دیں!۔۔۔ سوگندھی سے جب مادھو کی پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا تھا "تجھے لاج نہیں آتی اپنا بھاؤ کرتے۔ جانتی ہے تو میرے ساتھ کس چیز کا سودا کر رہی ہے؟۔۔۔۔ اور میں تیرے پاس کیوں آیا ہوں؟۔۔۔ چھی چھی چھی۔۔۔ دس روپے اور جیسا کہ تو کہتی ہے ڈھائی روپے دلالی کے' باقی رہے ساڑھے سات' رہے نا ساڑھے سات۔ ۔۔۔ ان ساڑھے سات روپوں پر تو مجھے ایسی چیز دینے کا وچن دیتی ہے جو تو دے ہی نہیں سکتی اور میں ایسی چیز لینے آیا ہوں جو میں لے ہی نہیں سکتا۔۔۔ مجھے عورت چاہیے' پر تجھے کیا اس وقت اسی گھڑی مرد چاہیے۔ مجھے تو عورت بھی بھا جائے گی۔ پر کیا میں تجھے جچتا ہوں۔۔۔ تیرا میرا ناطہ ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس یہ دس روپے۔۔۔۔ جن میں ڈھائی روپے دلالی میں چلے جائیں گے اور باقی ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔ تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے ہیں۔۔۔ تو بھی ان کا بجنا سن رہی ہے اور میں بھی۔ تیرا من کچھ اور سوچتا ہے میرا من کچھ اور۔۔۔ کیوں نہ کوئی ایسی بات کریں کہ تجھے میری ضرورت ہو اور مجھے تیری۔ پونے میں حوالدار ہوں۔ مہینے میں ایک بار آیا کروں گا۔ تین چار دن کے لیے۔۔۔۔ یہ دھندا چھوڑ۔۔۔ میں تجھے خرچ دیا کروں گا۔۔۔ کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟۔۔۔۔۔

مادھو نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ جس کا اثر سوگندھی پر اس قدر زیادہ ہوا تھا کہ وہ چند لمحات کے لیے خود کو حوالدارنی سمجھنے لگی تھی۔ باتیں کرنے کے بعد مادھو نے اس کے کمرے کی بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے رکھی تھیں اور ننگی تصویریں جو سوگندھی نے اپنے سرہانے لٹکا رکھی تھیں' بنا پوچھے گچھے پھاڑ دی تھیں اور کہا تھا "۔۔۔۔ سوگندھی بھئی میں ایسی تصویریں یہاں نہیں رکھنے دوں گا۔ اور پانی کا یہ گھڑا۔۔۔ دیکھا۔ کتنا میلا ہے اور یہ۔۔۔ یہ چیتھڑے۔۔۔ یہ چندیاں۔۔۔ اف کتنی بری باس آتی ہے۔ اٹھا کر باہر پھینک ان کو۔۔۔ اور تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس کر رکھا ہے۔۔۔۔ اور۔۔۔۔"

تین گھنٹے کی بات چیت کے بعد سوگندھی اور مادھو آپس میں گھل مل گئے تھے اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں سے حوالدار کو جانتی ہے۔ اس وقت تک کسی نے بھی کمرے میں بدبودار چیتھڑوں' میلے گھڑے اور ننگی تصویروں کی موجودگی کا خیال نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی نے اس کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا تھا کہ اس کا ایک گھر ہے۔ جس میں گھریلو پن آ سکتا ہے۔ لوگ آتے تھے اور بستر تک کی غلاظت کو محسوس کیے

بغیر چلے جاتے تھے۔ کوئی سوگندھی سے یہ نہیں کہتا تھا ''دیکھ تو آج تیری ناک کتنی لال ہورہی ہے۔ کہیں زکام نہ ہو جائے۔ تجھے۔۔۔۔۔ ٹھہر میں تیرے واسطے دوالاتا ہوں۔'' مادھو کتنا اچھا تھا۔ اس کی ہر بات باون تولہ اور پاؤ رتی کی تھی۔ کیا کھری کھری سنائی تھیں۔ اس نے سوگندھی کو۔۔۔۔۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اسے مادھو کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔

مہینے میں ایک بار مادھو پونے سے آتا تھا اور واپس جاتے ہوئے ہمیشہ سوگندھی سے کہا کرتا تھا ''دیکھ سوگندھی اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔۔۔۔۔ اگر تو نے ایک بار بھی کسی مرد کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔۔۔۔ دیکھ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔۔۔۔۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔۔۔''

نہ مادھو نے کبھی پونا سے خرچ بھیجا تھا اور نہ سوگندھی نے اپنا دھندا بند کیا تھا۔ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کیا ہو رہا ہے۔ نہ سوگندھی نے کبھی مادھو سے یہ کہا تھا ''تو یہ ٹرٹر کیا کرتا ہے۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی دی ہے کبھی تو نے؟'' اور نہ مادھو نے کبھی سوگندھی سے پوچھا تھا ''یہ مال تیرے پاس کہاں سے آیا ہے جب کہ میں تجھے کچھ دیتا ہی نہیں۔''۔۔۔ دونوں جھوٹے تھے۔ دونوں ایک ملمع کی ہوئی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن سوگندھی خوش تھی۔ جس کو اصل سونا پہننے کو نہ ملے وہ ملمع کیے ہوئے گہنوں پر ہی راضی ہو جایا کرتا ہے۔

اس وقت سوگندھی تھکی ماندی سو رہی تھی بجلی کا قمقمہ جسے اوف کرنا وہ بھول گئی تھی اس کے سر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی مگر وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔۔۔۔ رات کے دو بجے یہ کون آیا تھا؟ سوگندھی کے خواب آلود کانوں میں دستک کی آواز بھنبھناہٹ بن کر پہنچی۔ دروازہ جب زور سے کھٹکھٹایا گیا تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔۔۔ ملی جلی شرابوں اور دانتوں کی ریخوں میں پھنسے ہوئے مچھلی کے ریزوں نے اس کے منہ کے اندر ایسا لعاب پیدا کر دیا تھا جو بے حد کسیلا اور لیسدار تھا۔ دھوتی کے پلو سے اس نے یہ بدبودار لعاب صاف کیا اور آنکھیں ملنے لگی۔ پلنگ پر وہ اکیلی تھی۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کا کتا سوکھے ہوئے چپلوں پر منہ رکھے سو رہا تھا اور نیند میں کسی غیر مرئی چیز کا منہ چڑا رہا تھا اور طوطا پیٹھ کے بالوں میں سر دیے سو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سوگندھی بستر سے اٹھی۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ گھڑے سے پانی کا ایک ڈونگا نکال کر اس نے کلی کی اور دوسرا ڈونگا غٹا غٹ پی کر اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور کہا۔ ''رام لال؟''

رام لال جو باہر دستک دیتے دیتے تھک گیا تھا۔ بھنا کر کہنے لگا ''تجھے سانپ سونگھ گیا تھا یا کیا ہو

گیا تھا۔ ایک کارک (گھنٹے) سے باہر کھڑا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ کیا مر گئی تھی؟"۔۔۔۔ پھر آواز دبا کر اس نے ہولے سے کہا تھا۔"اندر کوئی ہے تو نہیں؟"

جب سوگندھی نے کہا۔"نہیں"۔۔۔۔۔ تو رام لال کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔"تو دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟۔۔۔۔۔ بھئی حد ہو گئی۔ کیا نیند پائی ہے۔ یوں ایک ایک چھوکری اتارنے میں دو دو گھنٹے سر کھپانا پڑے تو میں اپنا دھندا کر چکا۔۔۔۔ اب تو میرا منہ کیا دیکھتی ہے' جھٹ پٹ یہ دھوتی اتار کر وہ پھولوں والی ساڑھی پہن' پاؤڈر ووڈر لگا اور چل میرے ساتھ۔۔۔ باہر موٹر میں ایک سیٹھ بیٹھے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ چل چل ایک دم جلدی کر۔"

سوگندھی بھی آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور رام لال آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

سوگندھی نے تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بام کی شیشی اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولتے ہوئے کہا۔ "رام لال آج میرا جی اچھا نہیں۔"

رام لال نے کنگھی دیوار گیر پر رکھ دی اور مڑ کر کہا۔"تو پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔"

سوگندھی نے ماتھے اور کنپٹیوں پر بام ملتے ہوئے رام لال کی غلط فہمی دور کر دی۔"وہ بات نہیں رام لال۔۔۔۔ ایسے ہی میرا جی اچھا نہیں۔۔۔۔۔ بہت پی گئی۔"

رام لال کے منہ میں پانی بھر آیا۔"تھوڑی بچی ہو تو لا۔۔۔۔ ذرا ہم بھی منہ کا مزا ٹھیک کر لیں۔"

سوگندھی نے بام کی شیشی تپائی پر رکھ دی اور کہا۔"بچائی ہوتی تو یہ موا سر میں درد ہی کیوں ہوتا۔۔۔۔۔ دیکھ رام لال! وہ جو باہر موٹر میں بیٹھا ہے اسے اندر ہی لے آ۔"

رام لال نے جواب دیا۔"نہیں بھئی وہ اندر نہیں آ سکتے۔ جنٹلمین آدمی ہیں' وہ تو موٹر کو گلی کے باہر کھڑی کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔۔۔۔ تو کپڑے وپڑے پہن لے اور ذرا گلی کی نکڑ تک چل۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ساڑھے سات روپے کا سودا تھا۔ سوگندھی اس حالت میں جبکہ اس کے سر میں شدت کا درد ہو رہا تھا کبھی قبول نہ کرتی مگر اسے روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کے پاس والی کھولی میں ایک مدراسی عورت رہتی تھی جس کا خاوند موٹر کے نیچے آ کر مر گیا تھا۔ اس عورت کو اپنی جوان لڑکی سمیت اپنے وطن جانا تھا لیکن اس کے پاس چونکہ کرایہ ہی نہیں تھا اس لیے وہ کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھی۔ سوگندھی [illegible] کو ڈھارس

دی تھی اور اس سے کہا تھا۔ ''بہن تو چنتا نہ کر۔ میرا مرد پونے سے آنے ہی والا ہے۔ میں اس سے کچھ روپے لے کر تیرا جانے کا بندوبست کر دوں گی۔'' مادھو پونا سے آنے والا تھا مگر روپوں کا بندوبست تو سوگندھی ہی کو کرنا تھا چنانچہ وہ اٹھی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ پانچ منٹوں میں اس نے دھوتی اتار کر پھولوں والی ساڑھی پہنی اور گالوں پر سرخی پوڈر لگا کر تیار ہو گئی۔ گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پیا اور رام لال کے ساتھ ہو لی۔

گلی جو کہ چھوٹے شہروں کے بازار سے بھی کچھ بڑی تھی بالکل خاموش تھی۔ گیس کے وہ لیمپ جو کہ کھمبوں پر جڑے تھے پہلے کی نسبت بہت دھندلی روشنی دے رہے تھے۔ جنگ کے باعث ان کے شیشوں کو گدلا کر دیا گیا تھا۔ اس اندھی روشنی میں گلی کے آخری سرے پر ایک موٹر نظر آ رہی تھی۔

کمزور روشنی میں اس سیاہ رنگ کی موٹر کا سایہ سا نظر آیا اور رات کے پچھلے پہر کی بھیدوں بھری خاموشی۔۔۔۔ سوگندھی کو ایسا لگا کہ اس کے سر کا درد فضا پر بھی چھا گیا ہے۔ ایک کسیلا پن اسے ہوا کے اندر بھی محسوس ہوتا تھا۔ جیسے برانڈی اور بیوڑا کی باس سے وہ بھی بوجھل ہو رہی ہے۔

آگے بڑھ کر رام لال نے موٹر کے اندر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کچھ کہا۔ اتنے میں جب سوگندھی موٹر کے پاس پہنچ گئی تو رام لال نے ایک طرف ہٹ کر کہا۔ ''لیجئے وہ آ گئی۔۔۔۔۔۔ بڑی اچھی چھوکری ہے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اسے دھندا شروع کئے۔'' پھر سوگندھی سے مخاطب ہو کر کہا۔ سوگندھی ادھر آ سیٹھ جی بلاتے ہیں۔''

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ نے بیٹری اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکاچوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی بجھ گئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونہہ'' نکلا پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا۔۔۔۔۔۔

سوگندھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موٹر چل دی۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک بیٹری کی تیز روشنی گھسی ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک طرح سے سیٹھ کا چہرہ بھی تو نہ دیکھ سکی تھی۔ یہ آخر ہوا کیا تھا اس ''اونہہ'' کا کیا مطلب تھا جو ابھی تک اس کے کانوں میں بھنبھنا رہی تھی۔ کیا؟۔۔۔ کیا؟

رام لال دلال کی آواز سنائی دی۔ ''پسند نہیں کیا تجھے؟۔۔۔ اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ دو گھنٹے مفت ہی میں برباد کر دیئے۔''

یہ سن کر سوگندھی کی ٹانگوں میں اس کی بانہوں میں اس کے ہاتھوں میں ایک زبردست حرکت پیدا

ہوئی۔ کہاں ہے وہ موٹر۔۔۔ کہاں ہے وہ سیٹھ۔۔۔۔تو ''اونہہ'' کا مطلب یہ تھا کہ اس نے مجھے پسند نہیں کیا۔۔۔اس کی۔۔۔۔۔۔۔

گالی اس کے پیٹ کے اندر سے اٹھی اور زبان کی نوک پر آکر رک گئی۔ وہ آخر گالی کسے دیتی۔ موٹر تو جا چکی تھی۔ اس کی دم کی سرخ بتی اس کے سامنے بازار کے اندھیارے میں ڈوب رہی تھی اور سوگندھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لال لال انگارہ ''اونہہ'' ہے جو اس کے سینے میں برمے کی طرح اترا چلا جا رہا تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ زور سے پکارے۔ ''او سیٹھ۔۔۔او سیٹھ۔ ذرا موٹر روکنا اپنی۔۔۔۔۔ میں ایک منٹ کے لیے۔'' پر وہ سیٹھ تھوڑی ہے اس کی ذات پر بہت دور نکل چکا تھا۔

وہ سنسان بازار میں کھڑی تھی۔ پھولوں والی ساڑھی جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتی تھی، رات کے پچھلے پہر کی ہلکی پھلکی ہوا سے لہرا رہی تھی۔

یہ ساڑھی اور اس کی ریشمی سرسراہٹ سوگندھی کو کتنی بری معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس ساڑھی کے چیتھڑے اڑا دے کیونکہ ساڑھی ہوا میں لہرا لہرا کر ''اونہہ اونہہ'' کر رہی تھی۔

گالوں پر اس نے پوڈر لگایا تھا اور ہونٹوں پر سرخی۔ جب خیال آیا کہ یہ سنگار اس نے اپنے آپ کو پسند کرانے کے واسطے کیا تھا تو شرم کے مارے اسے پسینہ آ گیا۔ یہ شرمندگی دور کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ سوچا۔۔۔۔۔'' میں نے اس موئے کو دکھانے کے لیے تھوڑی اپنے آپ کو سجایا تھا۔ یہ تو میری عادت ہے۔۔۔۔ میری کیا سب کی یہی عادت ہے۔۔۔۔ پر۔۔۔۔ پر۔۔۔۔ یہ رات کے دو بجے اور رام لال دلال اور۔۔۔۔۔ یہ بازار۔۔۔۔ اور وہ موٹر اور بیٹری کی چمک۔'' یہ سوچتے ہی روشنی کے دھبے اس کی حد نگاہ تک فضا میں ادھر ادھر تیرنے لگے اور موٹر کے انجن کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ہوا کے ہر جھونکے میں سنائی دینے لگی۔

اس کے ماتھے پر بام کا لیپ جو سنگار کرنے کے دوران میں بالکل ہلکا ہو گیا تھا۔ پسینہ آنے کے باعث اس کے مساموں میں داخل ہونے لگا اور سوگندھی کو اپنا ماتھا کسی اور کا ماتھا معلوم ہوا۔ جب ہوا کا ایک جھونکا اس کے عرق آلود ماتھے کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا لگا کہ سرد ٹین کا ٹکڑا کاٹ کر اس کے ماتھے کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ سر میں درد ویسے کا ویسا موجود تھا مگر خیالات کی بھیڑ بھاڑ اور اس کے شور نے اس درد کو اپنے نیچے دبا کر رکھا تھا۔ سوگندھی نے کئی بار اس درد کو اپنے خیالات کے نیچے سے نکال کر اوپر لانا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انگ انگ دکھنے لگے۔ اس کے سر میں درد ہو اس کی ٹانگوں میں درد ہو۔ اس کے پیٹ میں درد ہو اس کی بانہوں میں درد ہو۔۔۔ ایسا درد کہ وہ صرف درد ہی کا خیال

کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کے دل میں کچھ ہوا۔۔۔ کیا یہ درد تھا؟۔۔۔۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑا اور پھر پھیل گیا۔۔۔۔ یہ کیا تھا؟۔۔۔۔ لعنت! یہ تو وہی ''اونہہ'' تھی جو اس کے دل کے اندر کبھی سکڑتی اور کبھی پھیلتی تھی۔

گھر کی طرف سوگندھی کے قدم اٹھے ہی تھے کہ رک گئے اور وہ ٹھہر کر سوچنے لگی۔ رام لال دلال کا خیال ہے کہ اسے میری شکل پسند نہیں آئی۔۔۔۔۔۔ شکل کا تو اس نے ذکر نہیں کیا۔ اس نے تو یہ کہا تھا۔ ''سوگندھی تجھے پسند نہیں کیا!'' اسے۔۔۔۔ اسے۔۔۔ صرف میری شکل ہی پسند نہیں آئی۔۔۔۔ نہیں آئی تو کیا ہوا؟۔۔۔۔۔ مجھے بھی تو کئی آدمیوں کی شکل ہی پسند نہیں آتی۔۔۔۔۔۔ وہ جو اماوس کی رات کو آیا تھا کتنی بری صورت تھی اس کی۔ کیا میں نے ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی؟ جب وہ میرے ساتھ سونے لگا تھا مجھے گھن نہیں آئی تھی؟ کیا مجھے ابکائی آتے آتے نہیں رک گئی تھی؟۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ پر سوگندھی۔۔۔۔۔ تو نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ تو نے اسے ٹھکرایا نہیں تھا۔۔۔ اس موٹر والے سیٹھ نے تو تیرے منہ پر تھوکا ہے۔۔۔۔ اونہہ۔۔۔۔ اس ''اونہہ'' کا اور مطلب ہی کیا ہے؟۔۔۔۔ یہی کہ اس چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔۔۔۔ اور۔۔۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔۔۔۔! ارے رام لال تو یہ چھپکلی کہاں سے پکڑ کر لے آیا ہے۔۔۔ اس لونڈیا کی اتنی تعریف کر رہا ہے تو۔۔۔۔ دس روپے اور یہ عورت۔۔۔۔۔۔ خچر کیا بری ہے۔۔۔۔۔

سوگندھی سوچ رہی تھی اور اس کے پیر کے انگوٹھے سے لے کر چوٹی تک گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کو کبھی اپنے آپ پر غصہ آتا تھا اور کبھی رام لال پر جس نے رات کے دو بجے اسے بے آرام کیا۔ لیکن فوراً ہی دونوں کو بے قصور پا کر وہ سیٹھ کا خیال کرتی تھی' اس خیال کے آتے ہی اس کی آنکھیں' اس کے کان' اس کی باہیں' اسکی ٹانگیں' اس کا سب کچھ مڑتا تھا کہ سیٹھ کو کہیں دیکھ پائے۔۔۔۔ اس کے اندر یہ خواہش بڑی شدت سے پیدا ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے ایک بار پھر ہو۔۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔۔۔ وہ ہولے ہولے موٹر کی طرف بڑھے۔۔۔۔ موٹر کے اندر سے ایک ہاتھ بیٹری نکالے اور اس کے چہرے پر روشنی پھینکے۔ ''اونہہ'' کی آواز آئے اور وہ۔۔۔۔۔ سوگندھی۔۔۔ اندھا دھند اپنے دونوں پنجوں سے اس کا منہ نوچنا شروع کر دے۔ وحشی بلی کی طرح جھپٹے اور۔۔۔۔ اپنی انگلیوں کے سارے ناخن جو اس نے موجودہ فیشن کے مطابق بڑھا رکھے تھے اس سیٹھ کے گالوں میں گاڑ دے۔۔۔۔ بالوں سے پکڑ کر اسے باہر گھسیٹ لے اور دھڑا دھڑ مکے مارنا شروع کر دے اور جب تھک جائے۔۔۔۔۔ جب تھک جائے تو رونا شروع کر دے۔

رونے کا خیال سوگندھی کو صرف اس لیے آیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں غصے اور بے بسی کی شدت کے باعث تین چار بڑے آنسو بن رہے تھے۔ ایکا ایکی سوگندھی نے اپنی آنکھوں سے سوال کیا۔ ''تم روتی

کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہوا ہے کہ ٹپکنے لگی ہو؟"۔۔۔۔۔آنکھوں سے کیا ہوا سوال چند لمحات تک ان آنسوؤں میں تیرتا رہا جواب پلکوں پر کانپ رہے تھے۔ سوگندھی ان آنسوؤں میں سے دیر تک اس خلاء کو گھورتی رہی جدھر سیٹھ کی موٹر گئی تھی۔

پھڑ پھڑ پھڑ۔۔۔۔۔یہ آواز کہاں سے آئی؟۔۔۔۔سوگندھی نے چونک کر اِدھر ادھر دیکھا لیکن کسی کو نہ پایا۔۔۔۔۔ارے! یہ تو اس کا دل پھڑ پھڑایا تھا۔ وہ سمجھی تھی موٹر کا انجن بولا ہے۔۔۔۔۔اس کا دل۔۔۔۔۔یہ کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو۔۔۔۔۔آج ہی یہ روگ لگ گیا تھا اسے۔۔۔۔۔اچھا بھلا چلتا چلتا ایک جگہ رک کر دھڑ دھڑ کیوں کرتا تھا۔۔۔۔۔۔بالکل اس گھسے ہوئے ریکارڈ کی طرح جو سوئی کے نیچے ایک جگہ رک جاتا تھا۔"رات کٹی گن گن تارے۔" کہتا کہتا تارے تارے کی رٹ لگا دیتا تھا۔

آسمان تاروں سے اٹا ہوا تھا۔ سوگندھی نے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔" کتنے سندر ہیں"۔۔۔۔۔وہ چاہتی تھی کہ اپنا دھیان کسی اور طرف پلٹ دے پر جب اس نے سندر کہا تو جھٹ سے یہ خیال اس کے دماغ میں کودا۔" یہ تارے سندر ہیں پر تو کتنی بھونڈی ہے۔ کیا بھول گئی کہ ابھی ابھی تیری صورت کو پھٹکارا گیا ہے؟"

سوگندھی بدصورت تو نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ تمام عکس ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جوان پانچ برسوں کے دوران میں وہ آئینے میں دیکھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا رنگ وروپ اب وہ نہیں رہا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے تھا۔ جبکہ وہ تمام فکروں سے آزاد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتی تھی لیکن وہ بدصورت تو نہیں ہو گئی تھی۔ اس کی شکل وصورت ان عام عورتوں کی سی تھی جن کی طرف مرد گزرتے گزرتے گھور کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو سوگندھی کے خیال میں ہر مرد اس عورت میں ضروری سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسے ایک دو راتیں بسر کرنا ہوتی ہیں۔ وہ جوان تھی۔ اس کے اعضاء متناسب تھے کبھی کبھی نہاتے وقت جب اس کی نگاہیں اپنی رانوں پر پڑتی تھیں تو وہ خود ان کی گولائی اور گدراہٹ کو پسند کیا کرتی تھی۔ وہ خوش خلق تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں شاید ہی کوئی آدمی اس سے ناخوش ہو کر گیا ہو۔۔۔۔۔۔بڑی ملنسار تھی' بڑی رحم دل تھی' پچھلے دنوں کرسمس میں جب وہ گول پیٹھا میں رہا کرتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس آیا تھا۔ صبح اٹھ کر جب اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا تو بٹوہ غائب پایا۔ سوگندھی کا نوکر یہ بٹوا لے اڑا تھا۔ بے چارہ بہت پریشان ہوا' چھٹیاں گزارنے کے بعد حیدرآباد سے بمبئی آیا تھا۔ اب اس کے پاس واپس جانے کے لیے دام نہ تھے۔ سوگندھی نے ترس کھا کر اسے اس کے دس روپے واپس دے دیئے تھے۔۔۔۔۔

"مجھ میں کیا برائی ہے؟" سوگندھی نے یہ سوال ہر اس چیز سے کیا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر، اور سڑک کی اکھڑی ہوئی بجری ۔۔۔۔ان سب چیزوں کی طرف اسے نے باری باری دیکھا پھر آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں جو اس کے اوپر جھکا ہوا تھا مگر سوگندھی کو کوئی جواب نہ ملا۔ جواب اس کے اندر موجود تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ پر وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کی تائید کرے۔۔۔

کوئی۔۔۔۔۔۔کوئی۔۔۔اس وقت کوئی اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا کہہ دے۔ "سوگندھی! کون کہتا ہے تو بری ہے، جو تجھے برا کہے وہ آپ برا ہے"۔۔۔۔۔۔نہیں یہ کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ کسی کا اتنا کہہ دینا کافی تھا۔ "سوگندھی! تو بہت اچھی ہے!"

وہ سوچنے لگی کہ وہ کیوں چاہتی ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ اس سے پہلے اسے اس بات کی اتنی شدت سے ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج کیوں وہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے ان پر اپنے اچھے ہونے کا احساس طاری کرنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ کیوں ماں بن رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ ماں بن کر دھرتی کی ہر شے کو اپنی گود میں لینے کے لیے کیوں تیار ہو رہی تھی؟۔۔۔۔اس کا جی کیوں چاہتا تھا کہ سامنے والے گیس کے آہنی کھمبے کے ساتھ چمٹ جائے اور اس کے سرد لوہے پر اپنے گال رکھ دے۔۔۔۔اپنے گرم گرم گال اور اس کی ساری سردی چوس لے۔

تھوڑی دیر کے لیے اسے ایسا محسوس ہوا کہ گیس کے اندھے لیمپ، لوہے کے کھمبے، فٹ پاتھ کے چوکور پتھر اور ہر وہ شے جو رات کے سناٹے میں اس کے آس پاس تھی ہمدردی کی نظروں سے اسے دیکھ رہی ہے اور اس کے اوپر جھکا ہوا آسمان بھی جو مٹیالے رنگ کی ایسی موٹی چادر معلوم ہوتا تھا جس میں بے شمار سوراخ ہو رہے ہوں۔ اس کی باتیں سمجھتا تھا اور سوگندھی کو بھی ایسا لگتا تھا کہ وہ تاروں کا ٹمٹمانا سمجھتی ہے۔۔۔۔لیکن اس کے اندر یہ کیا گڑبڑ تھی؟۔۔۔۔۔وہ کیوں اپنے اندر اس موسم کی فضا محسوس کرتی تھی جو بارش سے پہلے دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔۔۔۔اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے جسم کا ہر مسام کھل جائے اور جو کچھ اس کے اندر ابل رہا ہے ان کے رستے باہر نکل جائے۔ پر یہ کیسے ہو؟۔۔۔۔۔

سوگندھی گلی کی نکڑ پر خط ڈالنے والے لال بمبکے کے پاس کھڑی تھی۔۔۔۔۔ہوا کے تیز جھونکے سے اس بمبکے کی آہنی زبان جو اس کے کھلے ہوئے منہ میں لٹکتی رہتی ہے۔ لڑکھڑائی۔ ہوئی۔ سوگندھی کی نگاہیں یک بیک اس طرف اٹھیں، جدھر موٹر گئی تھی، مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔۔۔۔کتنی زبردست آرزو تھی کہ وہ موٹر پھر ایک بار آئے اور۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔

"نہ آئے۔۔۔۔۔ بلا سے۔۔۔۔ میں جان کیوں بیکار ہلکان کروں۔۔۔۔۔ گھر چلتے ہیں اور آرام سے لمبی تان کر سوتے ہیں۔ ان جھگڑوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ مفت کی دردسری ہی تو ہے۔ چل سوگندھی گھر چل۔۔۔۔ ٹھنڈے پانی کا ایک ڈونگا پی اور تھوڑا سا بام مل کر سو جا۔۔۔۔۔ فرسٹ کلاس نیند آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ سیٹھ اور اس کی موٹر کی ایسی کی تیسی۔"

یہ سوچتے ہوئے سوگندھی کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی ٹھنڈے تالاب سے نہا دھو کر باہر نکلی ہے جس طرح پوجا کرنے کے بعد اس کا جسم ہلکا ہو جاتا تھا اسی طرح اب بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف چلنے لگی تو خیالات کا بوجھ نہ ہونے کے باعث اس کے قدم کئی بار لڑکھڑائے۔

اپنے مکان کے پاس پہنچی تو ایک ٹیس کے ساتھ پھر تمام واقعہ اس کے دل میں اٹھا اور درد کی طرح اس کے روئیں روئیں پر چھا گیا۔۔۔۔ قدم پھر بوجھل ہو گئے اور وہ اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کرنے لگی کہ گھر سے بلا کر باہر بازار میں، منہ پر روشنی کا چانٹا مار کر ایک آدمی نے ابھی ابھی اس کی ہتک کی ہے۔ یہ خیال آیا تو اس نے اپنی پسلیوں پر کسی کے سخت انگوٹھے محسوس کئے جیسے کوئی اسے بھیڑ بکری کی طرح دبا دبا کر دیکھ رہا ہے کہ آیا گوشت بھی ہے یا بال ہی بال ہیں۔۔۔۔ اس سیٹھ نے۔۔۔۔ پرماتما کرے۔۔۔۔۔ سوگندھی نے چاہا کہ اس کو بددعا دے مگر سوچا بددعا دینے سے کیا بنے گا۔ مزا تو جب تھا کہ وہ سامنے ہوتا اور وہ اس کے وجود کے ہر ذرے پر اپنی لعنتیں لکھ دیتی۔۔۔۔۔ اس کے منہ پر کچھ ایسے الفاظ کہتی کہ زندگی بھر چین رہتا۔۔۔۔ کپڑے پھاڑ کر اس کے سامنے ننگی ہو جاتی اور کہتی "یہی لینے آیا تھا نہ تو؟۔۔۔۔ لے دام دیئے بنا لے جا اسے۔۔۔۔ پر جو کچھ میں ہوں، جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا ہے۔ وہ تو، تو کیا، تیرا باپ بھی نہیں خرید سکتا۔۔۔۔"

انتقام کے نئے نئے طریقے سوگندھی کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اگر اس سیٹھ سے ایک بار۔۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔۔۔ اس کی مڈبھیڑ ہو جائے تو وہ یہ کرے۔ نہیں۔ یہ نہیں یہ کرے۔۔۔۔ یوں اس سے انتقام لے، نہیں یوں نہیں یوں۔۔۔۔۔ لیکن جب سوگندھی سوچتی کہ سیٹھ سے اس کا دوبارہ ملنا محال ہے تو وہ اسے ایک چھوٹی سی گالی دینے ہی پر خود کو راضی کر لیتی۔۔۔۔ بس صرف ایک چھوٹی سے گالی جو اس کی ناک پر چپکو مکھی کی طرح بیٹھ جائے اور ہمیشہ وہیں جمی رہے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ دوسری منزل میں اپنی کھولی کے پاس پہنچ گئی۔

چولی میں سے چابی نکال کر تالا کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو چابی ہوا ہی میں گھوم کر رہ گئی۔ کنڈے میں تالا نہیں تھا۔ سوگندھی نے کواڑ اندر کی طرف دبائے تو ہلکی سی چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ اندر سے کسی

نے کنڈی کھولی اور دروازے نے جمائی لی۔سوگندھی اندر داخل ہوگئی۔

مادھو مونچھوں میں ہنسا اور دروازہ بند کر کے سوگندھی سے کہنے لگا۔''آج تو نے میرا کہا مان ہی لیا۔۔۔صبح کی سیر تندرستی کے لیے بڑی اچھی ہوتی ہے۔ ہر روز صبح اٹھ کر اس طرح گھومنے جایا کرے گی تو تیری ساری سستی دور ہو جائے گی اور وہ تیری کمر کا درد بھی غائب ہو جائے گا جس کی بابت تو آئے دن شکایت کیا کرتی ہے۔۔۔۔وکٹوریہ گارڈن تک تو ہو آئی ہو گی تو؟۔۔۔کیوں؟''

سوگندھی نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ مادھو نے جواب کی خواہش ظاہر کی۔ دراصل جب مادھو بات کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوا کرتا تھا کہ سوگندھی ضرور اس میں حصہ لے اور سوگندھی جب کوئی بات کیا کرتی تھی تو یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ مادھو اس میں حصہ لے۔ چونکہ کوئی بات کرنا ہوتی تھی' اس لیے وہ کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔

مادھو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت پر اس کے تیل سے چپڑے ہوئے سر نے میل کا بہت بڑا دھبہ بنا رکھا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

سوگندھی پلنگ پر بیٹھ گئی اور مادھو سے کہنے لگی۔''میں آج تیرا انتظار کر رہی تھی۔''

مادھو بڑا اسٹپٹایا۔''انتظار؟۔۔۔۔۔تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں آج آنے والا ہوں۔''

سوگندھی کے بھینچے ہوئے لب کھلے۔ان پر ایک پیلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''میں نے رات تجھے سپنے میں دیکھا تھا۔۔۔۔۔اٹھی تو کوئی نہ تھا۔سو جی نے کہا چلو کہیں باہر گھوم آئیں۔اور۔۔۔۔''

مادھو خوش ہو کر بولا۔۔۔''اور میں آ گیا۔۔۔بھئی بڑے لوگوں کی باتیں بڑی پکی ہوتی ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے۔دل کو دل سے راہ ہے۔۔۔تو نے یہ سپنا کب دیکھا تھا؟''

سوگندھی نے جواب دیا۔''چار بجے کے قریب ''

مادھو کرسی سے اٹھ کر سوگندھی کے پاس بیٹھ گیا۔''اور میں نے ٹھیک دو بجے سپنے میں دیکھا۔۔۔۔جیسے تو پھولوں والی ساڑھی۔۔۔۔ارے بالکل یہی ساڑھی پہنے میرے پاس کھڑی ہے۔ تیرے ہاتھوں میں۔۔۔۔کیا تھا۔تیرے ہاتھوں میں!۔۔۔ہاں تیرے ہاتھوں میں روپوں سے بھری ہوئی تھیلی تھی۔تو نے یہ تھیلی میری جھولی میں رکھ دی اور کہا۔''مادھو! تو چنتا کیوں کرتا ہے۔۔۔لے یہ تھیلی ارے تیرے میرے روپے کیا دو ہیں؟۔۔۔۔

سوگندھی تیری جان کی قسم فوراً اٹھا اور ٹکٹ کٹا کر ادھر کا رخ کیا۔۔۔کیا سناؤں بڑی پریشانی ہے!۔۔۔بیٹھے بٹھائے ایک کیس ہو گیا ہے۔اب بیس تیس روپے ہوں تو۔۔۔انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے

چھٹکارا ملے۔۔۔۔تھک تو نہیں گئی تو؟ لیٹ جا میں تیرے پیر دبا دوں۔ سیر کی عادت نہ ہو تو تھکن ہو ہی جایا کرتی ہے۔۔۔۔ادھر میری طرف پیر کر کے لیٹ جا۔"

سوگندھی لیٹ گئی۔ دونوں باہوں کا تکیہ بنا کر وہ ان پر سر رکھ کر لیٹ ہو گئی اور اس لہجے میں جو اسکا اپنا نہیں تھا۔ مادھو سے کہنے لگی۔"مادھو یہ کس موئے نے تجھ پر کیس کیا ہے؟۔۔۔۔جیل ویل کا ڈر ہو تو مجھ سے کہہ دے۔۔۔۔بیس تیس کیا سو پچاس بھی ایسے موقعوں پر پولیس کے ہاتھ تھما دیئے جائیں تو فائدہ اپنا ہی ہے۔۔۔ جان بچی لاکھوں پائے۔۔۔ بس بس اب جانے دے۔۔۔۔ تھکن کچھ زیادہ نہیں ہے۔۔۔۔ مٹھی چاپی چھوڑ اور مجھے ساری بات سنا۔۔۔۔کیس کا نام سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا ہے۔۔۔واپس کب جائے گا تو؟"

مادھو کو سوگندھی کے منہ سے شراب کی باس آئی۔ اس نے یہ موقع اچھا سمجھا اور جھٹ سے کہا۔ "دوپہر کی گاڑی سے واپس جانا پڑے گا۔۔۔۔۔اگر شام تک سب انسپکٹر کو سو پچاس نہ تھمائے تو۔۔۔۔ زیادہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں پچاس میں کام چل جائے گا۔"

"پچاس!" یہ کہہ کر سوگندھی بڑے آرام سے اٹھی اور ان چار تصویروں کے پاس آہستہ آہستہ گئی جو دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ بائیں طرف سے تیسرے فریم میں مادھو کی تصویر تھی۔ بڑے بڑے پھولوں والے پردے کے آگے کرسی پر وہ دونوں رانوں پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا۔ پاس ہی تپائی پر دو موٹی موٹی کتابیں دھری تھیں۔ تصویر اترواتے وقت تصویر اتروانے کا خیال مادھو پر اس قدر غالب تھا کہ اس کی ہر شے تصویر سے باہر نکل کر گویا پکار رہی تھی۔"ہمارا فوٹو اترے گا! ہمارا فوٹو اترے گا۔"

کیمرے کی طرف مادھو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوٹو اترواتے وقت اسے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

سوگندھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔اس کی ہنسی کچھ ایسی تیکھی اور نوکیلی تھی کہ مادھو کے سوئیاں سی چبھیں۔ پلنگ پر سے اٹھ کر وہ سوگندھی کے پاس گیا۔"کس کی تصویر دیکھ کر تو اس قدر زور سے ہنسی؟"

سوگندھی نے بائیں ہاتھ کی پہلی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو میونسپلٹی کے داروغہ صفائی کی تھی۔ "اس کی۔۔۔۔۔منشی پالٹی کے اس داروغہ کی۔۔۔۔ ذرا دیکھو تو اس کا تھوبڑا۔۔۔۔ کہتا تھا' ایک رانی مجھ پر عاشق ہو گئی تھی۔۔۔۔"ہونہہ! یہ منہ اور مسور کی دال۔" یہ کہہ کر سوگندھی نے فریم کو اس زور سے کھینچا کہ دیوار میں سے کیل بھی پلستر سمیت اکھڑ آئی۔

مادھو کی حیرت ابھی دور نہ ہوئی تھی کہ سوگندھی نے فریم کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ دو منزلوں

سے یہ فریم نیچے زمین پر گرا اور کانچ ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ ''رانی بھنگن کچرا اٹھانے آئے گی تو میرے اس راجہ کو بھی لے جائے گی۔''

ایک بار پھر اسی نوکیلی اور تیکھی ہنسی کی پھوار سوگندھی کے ہونٹوں سے گرنا شروع ہوئی جیسے وہ ان پر چاقو یا چھری کی دھار تیز کر رہی ہے۔ مادھو بڑی مشکل سے مسکرایا۔ پھر ہنسا۔ ''ہی ہی ہی۔۔۔۔۔''

ایک ہاتھ سے سوگندھی نے پگڑی والے کی تصویر اتاری اور دوسرا ہاتھ اس فریم کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں فریم کیل سمیت سوگندھی کے ہاتھ میں تھا۔

زور کا قہقہہ لگا کر اس نے ''ہونہہ'' کی اور دونوں فریم ایک ساتھ کھڑکی میں سے باہر پھینک دیئے۔ دو منزلوں سے جب فریم زمین پر گرے اور کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی تو مادھو کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے ہنس کر اتنا کہا۔۔۔۔ ''مجھے بھی یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔''

آہستہ آہستہ سوگندھی مادھو کے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ''تجھے یہ فوٹو پسند نہیں تھا۔۔۔۔ پر میں پوچھتی ہوں تجھ میں ہے کون سی ایسی چیز جو کسی کو پسند آ سکتی ہے۔۔۔۔۔ یہ تیری پکوڑا ایسی ناک' یہ تیرا بالوں بھرا ماتھا یہ تیرے سوجے ہوئے نتھنے' یہ تیرے مڑے ہوئے کان' یہ تیرے منہ کی باس' یہ تیرے بدن کا میل ؟۔۔۔۔ تجھے اپنا فوٹو پسند نہیں تھا ہونہہ۔۔۔۔۔ پسند کیوں ہوتا' تیرے عیب جو چھپائے رکھے تھے اس نے۔۔۔۔ آج کل زمانہ ہی ایسا ہے جو عیب چھپائے وہ ہی برا۔۔۔۔۔''

مادھو پیچھے ہٹتا گیا۔ آخر جب وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا تو اس نے اپنی آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔ ''دیکھ سوگندھی مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا ہے۔۔۔ اب تجھ سے آخری بار کہتا ہوں۔۔۔۔''

سوگندھی نے اس سے آگے مادھو کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اگر تو نے پھر سے اپنا دھندا شروع کیا تو بس تیری میری ٹوٹ جائے گی۔ اگر تو نے پھر کسی کو اپنے یہاں ٹھہرایا تو چٹیا سے پکڑ کر تجھے باہر نکال دوں گا۔ اس مہینے کا خرچ میں تجھے پونا پہنچتے ہی منی آرڈر کر دوں گا۔ ہاں کیا بھاڑا ہے اس کھولی کا؟'' سوگندھی نے کہنا شروع کیا۔ ''میں بتاتی ہوں۔۔۔۔۔ پندرہ روپیہ بھاڑا ہے اس کھولی کا۔۔۔۔۔ اور دس روپے بھاڑا ہے میرا۔۔۔۔۔ اور جیسا تجھے معلوم ہے ڈھائی روپے دلال کے۔ باقی رہے ساڑھے سات' رہے نہ ساڑھے سات! ان ساڑھے سات روپوں میں میں نے ایسی چیز دینے کا وچن دیا تھا جو میں دے ہی نہیں سکتی تھی اور تو ایسی چیز لینے آیا تھا جو تو لے ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔۔۔ تیرا میرا ناطہ ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ بس یہ دس روپے تیرے اور میرے بیچ میں بج رہے تھے۔ سو ہم دونوں نے مل کر ایسی بات کی کہ تجھے میری

ضرورت ہوئی اور مجھے تیری۔۔۔۔ پہلے میرے اور تیرے بیچ میں دس روپے بجتے تھے۔آج پچاس بج رہے ہیں۔تو بھی ان کا بجنا سن رہا ہے اور میں بھی ان کا بجنا سن رہی ہوں۔۔۔۔۔یہ تو نے اپنے بالوں کا کیا ستیاناس مار رکھا ہے؟''

یہ کہہ کر سوگندھی نے مادھو کی ٹوپی انگلی سے ایک طرف اڑا دی یہ حرکت مادھو کو بہت ناگوار گزری۔ اس نے بڑے کڑے لہجے میں کہا۔''سوگندھی!''

سوگندھی نے مادھو کی جیب سے رومال نکال کر سونگھا اور زمین پر پھینک دیا۔''یہ چیتھڑے یہ چندیاں۔۔۔اف کتنی بری باس آتی ہے اٹھا کر باہر پھینکو ان کو۔۔۔۔''

مادھو چلایا۔''سوگندھی!''

یہ کہہ کر سوگندھی نے تیز لہجے میں کہا۔''سوگندھی کے بچے تو آیا کس لیے ہے یہاں؟ تیری ماں رہتی ہے اس جگہ جو تجھے پچاس روپے دے گی؟ یا تو کوئی بڑا گبھرو جوان ہے جو میں تجھ پر عاشق ہو گئی ہوں۔۔۔کتے' کمینے' مجھ پر رعب گانٹھتا ہے؟۔۔۔میں تیری رکھیل ہوں کیا؟۔۔۔بھک منگے تو اپنے آپ کو سمجھ کیا بیٹھا ہے؟۔۔۔میں پوچھتی ہوں تو ہے کون؟۔۔۔چور یا گٹھ کترا؟۔۔۔اس وقت تو میرے مکان میں کرنے کیا آیا ہے؟۔۔۔۔بلاؤں پولیس کو؟۔۔۔۔پونے میں تجھ پر کیس ہو نہ ہو۔ یہاں تو تجھ پر ایک کیس کھڑا کر دوں۔۔۔۔''

مادھو سہم گیا۔''دبے لہجے میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا۔

''سوگندھی! تجھے کیا ہو گیا ہے؟''

''تیری ماں کا سر۔۔۔۔تو ہوتا کون ہے مجھ سے ایسے سوال کرنے والا۔۔۔بھاگ یہاں سے ورنہ''۔۔۔۔۔۔سوگندھی کی بلند آواز سن کر اس کا خارش زدہ کتا جو سوکھے ہوئے چپلوں میں منہ رکھے سو رہا تھا۔ہڑبڑا کر اٹھا اور مادھو کی طرف منہ اٹھا کر بھونکنا شروع کر دیا۔کتے کے بھونکنے کے ساتھ ہی سوگندھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

مادھو ڈر گیا۔گری ہوئی ٹوپی اٹھانے کے لیے وہ جھکا تو سوگندھی کی گرج سنائی دی۔''خبردار! ۔۔۔۔پڑی رہنے دے وہیں۔۔۔۔تو جا' تیرے پونا پہنچتے ہی اس کو منی آرڈر کر دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ اور زور سے ہنسی اور ہنستی ہنستی بید کی کرسی پر بیٹھ گئی۔اس کے خارش زدہ کتے نے بھونک بھونک کر مادھو کو کمرے سے باہر نکال دیا۔سیڑھیاں اتار کر جب کتا اپنی دم ہلاتا سوگندھی کے پاس واپس آیا اور اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا اور کان پھڑ پھڑانے لگا تو سوگندھی چونکی۔۔۔اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا

دیکھا۔۔۔۔۔ ایسا سناٹا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر شے خالی ہے۔۔۔۔ جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی اسٹیشنوں پر مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں بالکل بھیگی کھڑی ہے۔۔۔۔ یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا اسے بہت تکلیف دے رہا تھا اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حساب تھا۔ ادھر دماغ کو پر کرتی تھی۔ ادھر وہ خالی ہو جاتا تھا۔

بہت دیر تک وہ بید کی کرسی پر بیٹھی رہی۔ سوچ بچار کے بعد بھی جب اس کو اپنا دل پرچانے کا کوئی طریقہ نہ ملا تو اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو گود میں اٹھایا اور ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اسے پہلو میں لٹا کر سو گئی۔

عصمت چغتائی

مٹھی مالش

پولنگ بوتھ پر بڑی بھیڑ تھی جیسے کسی فلم کا پریمیر ہو۔ یہ لمبا کیو لگا تھا۔ پانچ سال پہلے بھی اسطرح ہم نے لمبے لمبے کیو لگائے تھے' جیسے ووٹ دینے نہیں سستا اناج لینے جا رہے ہوں۔ چہروں پر اس کی پرچھائیں تھیں۔ کیو لمبا سہی' پر کبھی تو اپنی باری آئے گی۔ پھر کیا ہے' وارے نیارے سمجھو' اپنے بھروسے کے آدمی ہیں۔ قسمت کی باگ ڈور اپنوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

''بائی' اے بائی اچھے تو ہو؟'' میلی سی کاشٹہ باندھے ایک عورت نے پیلے پیلے دانت نکال کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اوھو' گنگا بائی..........''۔

''رتی بائی' او گنگا بائی دوسری تھی' مر گئی بے چاری''۔

''ارے........ رے بے چاری.....'' زن سے میرا ذہن پانچ سال پیچھے قلابازی کھا گیا۔

''مالش کہ مٹھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مالش''۔ رتی بائی نے آنکھ ماری۔'' سالی کو بہت منع بولا پر نہیں سنا۔ تم کس کو دیں گا ووٹ بائی''۔

''تم کس کو دو گی'' ہم نے ایک دوسرے سے رسماً پوچھا۔

''ہمارا جات والا کو۔ اپن کے گاؤں کا ہے''۔

''پانچ سال ہوئے تب بھی تو تم نے اپنی جات والا کو دیا تھا ووٹ''۔

''ہاں بائی' پن وہ سالا کنڈم نکلا' کچھ نہیں کیا''۔ رتی بائی نے منہ بسور کر کہا۔

''اور یہ بھی تمہارا جات والا ہے''۔

ہاں' پن یہ ایک دم فرسٹ کلاس۔ ہاں' بائی' دیکھنا اپن کا کھیت چھوٹ جائے گا''۔

''پھر تم گاؤں جا کر دھان کوٹا کرو گی''۔

''ہاں بائی''۔ رتی بائی نے اپنی چندھی آنکھیں پٹ پٹائیں۔

پانچ سال ہوئے ہسپتال میں' جب میری منی پیدا ہوئی تو رتی بائی نے کہا تھا وہ اپنی جات والے کو ووٹ دینے

جا رہی ہیں۔ چوپاٹی پہ اس نے ان سے ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں وعدہ کیا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں طاقت آتے ہی کایا پلٹ جائے گی' دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی' زندگی میں سے شہد ٹپکنے لگے گا۔ آج' پانچ سال بعد' رتی بائی کی ساڑھی پہلے سے بوسیدہ تھی' بالوں پر سفیدی بڑھ گئی تھی' آنکھوں کی وحشت دوچند ہوگئی تھی۔ آج پھر چوپاٹی پر کئے ہوئے وعدوں کا سہارا لے کر وہ اپنا ووٹ دینے آئی تھی۔

''بائی تم اس چھنال سے کائیکو اتنا بات کرتا''۔ رتی بائی نے بیڈ پین سرکاتے ہوئے اپنی نصیحتوں کا دفتر کھول دیا۔

''کیوں؟ کیا برائی ہے؟'' میں نے بن کر پوچھا۔

''ہم تمہارے کو بولا ناؤ چھوکری ایک دم کھراب ہے۔ سالی پکی بدماس''۔ رتی بائی کی ڈیوٹی لگنے سے پہلے گنگا بائی نے بھی اپنی ڈیوٹی کے درمیان مجھے یہی رائے دی تھی کہ رتی بائی ایک دم لوفر ہے۔ اسپتال کی یہ دونوں آیائیں ہر وقت کچر کچر لڑا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی جھونٹم جھانٹا تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ مجھے ان سے باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

''کیا وہ سالا سنکر بھائی تھوڑی ہے' اس کا یار ہے۔ سنگ سوتی ہے''۔ گنگا بائی نے بتایا تھا رتی بائی کا میاں شولہ پور کے پاس ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ بس اسی سے چمٹا ہوا ہے۔ ساری فصل بیاج میں اٹھ جاتی ہے۔ تھوڑے سے روپے اور رہ گئے ہیں جو چند سالوں میں چک جائیں گے۔ پھر وہ اپنے بال بچوں کے پاس چلی جائے گی اور وہاں مزے سے دھان کوٹا کرے گی۔ گھر میں مزے سے دھان کوٹنے کے خواب دونوں ایسے دیکھا کرتی تھیں جیسے کوئی پیرس کے خواب دیکھتا ہو۔

''مگر رتی بائی تم بمبئی میں پیسہ کمانے کیوں آ گئیں؟ تمہارا میاں آ جاتا تو ایک بات بھی تھی''۔

''ارے بائی وہ کیسے آتا؟ کھیت جو چلا جاتا۔ میرے سے کھیتی باڑی نہ سنبھلتی۔''

''اور بچوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے''۔

''ہے ایک رانڈ مری۔'' رتی بائی نے دو چار گالیاں نکائیں۔

''دوسری شادی کر لی ہے تمہارے میاں نے؟''

''اینہ! سالا دوسری شادی کیا کرے گا' رکھیلی ہے۔''

''اور جو تمہارے پیچھے مالکن بن بیٹھی تو؟''

''کیسے بنے گی؟ مار مار بھوسا نہ بھر دیں گے! بیاج نمٹ جائے پیچھے چلے جائیں گے ہم۔''

معلوم ہوا رتی بائی خود اپنی پسند کی ایک لاوارث عورت میاں اور بچوں کی خبر گیری پر چھوڑ آئی

ہیں۔ جب کھیت چھوٹ جائے گا تو پھر گھر ہستن بن کر دھان کوٹنے چلی جائیں گی۔ رکھیلی کا کیا ہوگا؟ اسے کوئی دوسرا میاں مل جائے گا جس کی بیوی بمبئی میں پیسہ کمانے آئی ہوئی ہے اور بال بچے دیکھنے والا کوئی نہیں۔

''اس عورت کا میاں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہے نہیں تو۔''

''تو وہ اس کے پاس نہیں رہتی۔''

''اس کے کھیت خورد برد ہو گئے۔ اس کا میاں کسان مزدور ہے' مگر سال میں آٹھ مہینے چوری چکاری کرتا ہے یا بڑے شہروں کی طرف نکل جاتا ہے' بھیک مانگ کر دن بتا دیتا ہے۔''

''اور بچے؟''

''ہیں نہیں تو۔ چار بچے ہیں یا تھے۔ ایک تو بمبئی میں ہی کھیل رل گیا' کچھ پتا نہیں کہاں گیا' چھوکریاں بھاگ گئیں' چھوٹا بچہ ساتھ رہتا ہے۔''

''تم کتنا روپیہ گاؤں بھیجتی ہو رتی بائی؟''

''اکھا چالیس۔''

''تمہاری گزر کیسے ہوتی ہے پھر''

''ہمارا بھائی سنبھالتا ہے۔'' وہی بھائی جس کے بارے میں گنگا بائی کہہ رہی تھیں کہ ان کا فرینڈ ہے''۔

''تمہارے بھائی کے بال بچے۔''

''ہیں نہیں تو۔''

''ہاں؟ گاؤں میں؟''

''ہاں' پونا کے پاس ایک جگہ ہے۔ اس کا بڑا بھائی کھیتی سنبھالتا ہے۔''

''یعنی تمہارا بڑا بھائی۔'' میں نے چڑانے کو پوچھا۔

''دھت۔ او ہمارا' بھائی کاہے کو ہوتا۔ کیا بائی تم ہمارے کو سالا چھنال سمجھتا۔ ہم گنگا بائی سری نہیں ہے۔ معلوم مہینے میں چار دن سے جاستی کسی کے ساتھ نہیں بنی۔ ہاں کوئی پھٹا پرانا کپڑا ہو تو اس بدماس کو مت دینا' میرے کو دینا' ہاں!''

''رتی بائی''۔

''ہاں بائی''

''تمہارا'' بھائی'' تم کو مارتا ہے؟''

''سالا گنگا بائی بولا ہوئیں گا۔نہیں بائی جاستی نہیں مارتا۔کبھی کبھی پیے لا ہوتا تو مارتا۔سو بائی لاڈ بھی کرتا نا''۔

''لاڈ بھی کرتا ہے؟''۔

''کرتا نہیں تو''۔

''مگر رتی بائی تم اسے بھائی کیوں کہتی ہو کمبخت کو؟'' رتی بائی ہنسنے لگیں۔''بائی ہمارے میں ایسا بچ بولتے''۔

''مگر رتی بائی چالیس روپیہ پگار ملتی ہے تو پھر دھندا کاہے کو کرتی ہو؟''۔

''بن کیسے پورا پڑے۔ پانچ روپیہ کھولی کا بھاڑا لے تین روپیہ لالہ کے''۔

''یہ لالہ کو کاہے کے دیتی ہے؟''۔

''اکھا چالی کا عورت لوگ دیتا ہے نہیں تو نکال دیوے''۔

''دھندا جو کرتی ہو اس لیے؟''

''ہاں بائی''۔رتی بائی کچھ جھینپ گئیں۔

''اور تمہارا بھائی کیا کرتا ہے؟''۔

''بائی بولنے کا بات نہیں' ہاں۔دارو کا دھندا بڑا کھوٹا دھندا ہے۔جو پولیس کو پیسہ نہیں بھرے سو تڑی پار''۔

''یعنی' بمبئی سے شہر بدر''۔

''ہاں بائی''۔

اتنے میں نرس نے آ کر رتی بائی کو ڈانٹا'' کیا بیٹھی باتیں مٹھار رہی ہے۔چل جا نمبر 10 میں بیڈ پین پڑا ہے''۔ رتی بائی اپنے میلے دانت نکوستی بھاگیں۔

''آپ کیا ان لوفر عورتوں سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی ہیں۔آپ کو آرام کی ضرورت ہے ورنہ پھر بلیڈنگ شروع ہو جائے گی''۔نرس نے بچی کو پنگھوڑے سے نکال لیا اور چلی گئی۔

شام کو گنگا بائی کی ڈیوٹی تھی۔بغیر گھنٹی بجائے خود ہی آن دھمکیں۔

''بیڈ پین مانگتا بائی''۔

''نہیں گنگا بائی' بیٹھو''۔

''رانڈ ششٹر بوم مارے گی۔کیا بولتی تھی تمہارے کو؟''۔

''کون سسٹر؟ بولت تھی آرام کرو''۔

''ششٹر نہیں اورتی بائی''۔

''کہتی تھی پوپٹ لال گنگا بائی کو خوب مارتا ہے'' میں نے چھیڑا۔

''ارے او سالا ہمارے کو کیا مارے گا''۔ گنگا بائی میرے پاؤں پر ہولے ہولے مکیاں مارنے لگیں۔

''بائی میرے کو جونا چپل دینا کو بولا تھا دیو نا''۔

''لے جاؤ۔ مگر یہ تو بتاؤ تمہارے میاں کی چٹھی آئی؟''

''آئی نہیں تو''۔ گنگا بائی نے فوراً چپل پر ہاتھ مارا۔''سالا شششر نے دیکھ لیا تو بومابوم کرے گی۔ بوت کھٹ کھٹ کرتی ہے''۔

''گنگا بائی''۔

''ہاں بائی''۔

''تم اپنے گاؤں کب واپس جاؤ گی؟''۔

گنگا کی چمکیلی سیاہ آنکھیں دور کھیتوں کی ہریالی میں کھو گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور بڑی دھیمی آواز میں بولی''رام کرے اب کے فصل دھڑلے کی ہو جاوے۔ بس بائی پھر اپن چلا جائے گا۔ گئے سال باڑھ آ گئی سارا دھان کچرا ہو گیا''۔

''گنگا بائی تمہارے میاں کو تمہارے دوستوں کے بارے میں پتا ہے؟'' میں نے کریدا۔

''کیا بات کرتا تم بائی''۔ گنگا بائی گم سم سی ہو گئی۔ اسے کچھ جھینپ سی معلوم ہو رہی تھی۔ انہوں نے فوراً بات پلٹی۔

''بائی تمارے کو دو چھوکری ہو گیا' سیٹھ گسا کرے گا نا؟''

''کون سیٹھ؟'' میں نے چکرا کر پوچھا۔

''تمہارا اپنی دوسری سادی بنالے گا تو؟''

''وہ دوسرا شادی بنائے گا تو ہم بھی دوسرا شادی بنے لے گا''۔

''تمہارے لوگ میں ایسا ہوتا؟ ارے بائی ہم سمجھا تم کوئی اونچا جات کا ہے''۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گنگا بائی اونچا جات والا کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ میں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ گنگا بائی سمجھ جائیں مگر ان کا خیال تھا کہ دوسری لڑکی کی پیدائش پر ضرور میری شامت آئے گی۔ اگر سیٹھ میری ٹھکائی نہ کرے تو سخت تھرڈ کلاس سیٹھ ہے۔

اسپتال میں پڑے رہنا قید تنہائی سے کچھ کم نہیں۔ دو گھنٹے شام کو ملنے جلنے والے آ جاتے' اگر اسپتال میں یہ دونوں نہ ہوتیں تو شاید دم ٹوٹ جاتا۔ دونوں معمولی سی رشوت لیکر ایک دوسرے کے بارے میں

الٹی سیدھی باتیں بتایا کرتیں۔ ایک دن میں نے رتی بائی سے پوچھا۔

"اے رتی بائی تم مل میں کام کرتی تھیں، کیوں چھوڑ دیا؟"

"ارے بائی سالا مل میں بر الفڑ اتھا۔"

"کاہے کا لفڑا؟"

"اے بائی ایک تو کام ایک دم بھاری، یہ بھی چلتا، پر بائی دو مہینہ کے بعد چھٹی کر دیتے"۔

"کیوں؟"۔

"دوسرا بائی لوگ کو رکھتے"۔

"بھئی وہ کیوں"۔

"کارن یہ کہ اگر پکا چھ مہینہ ہو جاتے تو فیکٹری لا جولا گو ہو جاوے"۔

"اوہو سمجھی۔ یعنی ہر دوسرے تیسرے مہینے نیا سٹاف بدلتا رہتا ہے۔ اگر مستقل ہو جائے ایک کاریگر تو فیکٹری لا کے مطابق اسے بیماری کی چھٹی، زچگی کی چھٹی لینے کا حق مل جاتا ہے۔ اس لیے ہر دو مہینے کے بعد ادل بدل کر دی جاتی ہے۔ سال میں ایک مزدور کی مشکل سے چار مہینے آمدنی ہوتی۔ باقی کے دن گاؤں واپس لوٹ جاتی ہیں۔ جن کی اتنی حیثیت نہیں وہ دوسری ملوں کے چکر کاٹتی ہیں۔ بعض سڑی گلی بھاجی ترکاری کی ڈھیریاں لگا کر فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتی ہیں۔ فٹ پاتھ پہ اپنی اپنی جگہ کے لیے خوب گالی گلوچ ہوتی ہے۔ بغیر لائسنس کے بیچتی ہیں۔ اس لیے کچھ نکڑ کے سپاہی کو کھلانا پڑتا ہے اس پر بھی کبھی کوئی انجانا افسر آ جاتا ہے تو بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کچھ دکان جھولیوں میں سمیٹ کسی گلی میں سٹک جاتی ہیں، کچھ پکڑی جاتی ہیں اور واویلا کرتی ہیں۔ پولیس تھانہ لیجائی جاتی ہیں۔ مطلع صاف ہوتے ہی پھر چیتھڑا بچھا کر دکان سجا لیتی ہیں۔ کچھ اور بھی چالاک ہوتی ہیں۔ جھولی میں چار چھ نیبو، دو چار بھٹے پکڑے بازار میں ایسے گھومتی ہیں جیسے خود خریدار ہیں، مگر پاس گزرنے والے سے چپکے سے کہتی ہیں۔

"لو بھائی بھٹا لیو، ایک ایک آنہ"۔ اور بکری ہو جاتی ہے۔

ان سے ترکاری خریدنا گویا بیضے کی پڑیاں خریدنا ہے۔ جو ذرا کم خوش نصیب ہوتی ہیں وہ بھیک مانگنے لگتی ہیں۔ دوڑتے بھاگتے دھندا بھی کرتی جاتی ہیں۔ اپنی دانست میں سولہ سنگھار کئے منہ میں بیڑا دبائے یہ لوگ نیم تاریک ریلوے اسٹیشن کے آس پاس ٹہلا کرتی ہیں۔ گاہک آتا ہے، کچھ اشارے کنائے ہوتے ہیں، سودا پٹ جاتا ہے۔ یہ گاہک عموماً اتر دیش کے گھر چھوڑ کر آئے ہوئے دودھ والے یا بے گھر بے در مزدور ہوتے ہیں جن کی بیویاں گاؤں میں ہوتی ہیں یا ازلی کنوارے، جن کا گھربار یہی گندی گلیاں اور فٹ پاتھ ہیں۔

صبح گنگا بائی اور رتی بائی میں باقاعدہ برآمدے میں فری اسٹائل کشتی ٹھن گئی۔ رتی بائی نے گنگا بائی کا جوڑا کھسوٹ ڈالا اور اس کے جواب میں گنگا بائی نے رتی بائی کا منگل سوتر توڑ ڈالا۔ منگل سوتر' کالی پوتھ کا باریک سا کنٹھا رتی بائی کے سہاگ کی نشانی۔ رتی بائی ایسے بھوں بھوں کر کے روئیں جیسے انہیں بیوہ کر دیا ہو۔ لڑائی کی بنیاد روئی کے وہ ٹکڑے تھے جو مریضوں کے زخموں کی رطوبت پونچھ کر پھینکے جاتے ہیں۔ یا زچاؤں کے استعمال کی روئی۔ میونسپلٹی کا حکم ہے کہ یہ روئی احتیاط سے جلا دی جائے مگر معلوم ہوا رتی بائی اور گنگا بائی چپکے سے یہ روئی نکال کر' دھو کر' پوٹلی باندھ کر لے جایا کرتی تھیں۔ چونکہ آج کل تعلقات کچھ زیادہ کشیدہ تھے گنگا بائی نے ہیڈ سے شکایت کر دی۔ رتی بائی نے گالیاں دیں جو ہاتھا پائی میں تبدیل ہو گئیں۔ دونوں نکال دی جاتیں مگر ہاتھ پاؤں جوڑے تو ہیڈ نے بات دبا دی۔

رتی بائی ذرا عمر والی اور پھسپھسی سی تھیں۔ گنگا بائی نے ان کی خوب ٹھکائی کی۔ دوپہر کی سوجی ہوئی ناک لیے بیڈ پین رکھنے آئیں تو میں نے پوچھا۔

''رتی بائی اس گندی روئی کا کیا کرتی ہو؟''

''دھو کر سکھا لیتے ہیں۔ ایک دم صاف ہو جاتی ہے''۔

''پھر؟''

''پھر روئی والے کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں''۔

''کون لیتا ہے یہ جراثیم بھری دوائی؟''

''میٹرس والا' جو صاحب لوگ کا فرنیچر کا گدا بناتا ہے''۔

اف! میرے جسم پر سوئیاں کھڑی ہو گئیں۔ ایک دفعہ میں نے بید کے صوفے کی روئی دھنکوانے کو نکلوائی تو کالی سیاہ۔ تو وہ یہی زخموں کی روئی تھی۔ اللہ! میری بچی کا گدا بھی ایسی روئی کا ہے۔ میری پھول سی بچی اور یہ جراثیم کے ڈھیر۔ ہائے گنگا بائی' رتی بائی تمہیں خدا سمجھے!

آج چونکہ جوتا چلا تھا۔ رتی بائی بھری بیٹھی تھیں۔ گنگا بائی چونکہ ذرا نسبتاً جوان تھیں۔ رتی بائی انہیں اپنے سے زیادہ گناہگار سمجھتی تھیں۔ کچھ دن پہلے انہوں نے رتی بائی کا خاصہ مستقل گاہک بھی توڑ لیا تھا۔ وہ تمام پیٹ جو گنگا بائی وقتاً فوقتاً ضائع کراتی رہتی تھیں' نالے میں جو جیتا جاگتا بچہ چھوڑ آئی تھیں' جو آنول نال منہ پر ڈال دینے کے بعد بھی سسکتا رہا۔ صبح نالے کے پاس ایک خلقت جمع تھی۔ اگر رتی بائی چاہتی تو صاف پکڑا دیتی گنگا کو' مگر اس نے راز کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور گنگا بائی کا دیدہ دیکھو فٹ پاتھ پر بیٹھی کچے بیر اور امرود کی ڈھیر ماں بیچتی رہی۔

''رتی بائی کوئی گڑ بڑ سڑ بڑ ہو جاتی ہے اس دوستی میں تو تم اسپتال کیوں نہیں چلی جاتیں''۔

''کاہے کو جاوے اسپتال؟ ہمارے میں بہت بائی لوگ ہے' ڈاکٹر کا ما فک ایک دم فرسٹ کلاس''۔

''دوائی دیتی ہیں کوئی؟''

''اور کیا' فسٹ کلاس دوائی دیتی۔ مٹھی بھی چلتی ہے پن مالش ایک دم اچھی''۔

''یہ ''مٹھی'' اور ''مالش'' کیا بلا ہوتی ہے؟''۔

''بائی تم نہیں سمجھے گا''۔ رتی بائی ذرا شرما کر ہنسنے لگیں۔ میرے ڈسٹنگ پاؤڈر کے ڈبے پر وہ کئی دن سے منڈلا رہی تھیں۔ جب میرے لگاتیں ذرا سا ہتھیلی پر ڈال کر اپنے کلوں پر رگڑ لیتیں۔ میں نے سوچا ان کا منہ کھلوانے کے لیے یہ ڈبہ کافی ہو گا۔ میں نے ڈبہ پیش کیا تو بو کھلا گئیں۔

''نہیں بائی شششٹر مار ڈالے گی''۔

''نہیں مارے گی۔ میں اس سے کہہ دوں گی مجھے اس کی بو پسند نہیں''۔

''چہ۔ ارے کیا ایک دم فسٹ کلاس باس بولتا ہے۔ ارے بائی تمہارا تو متک پھریلا ہے''۔

بڑے اصرار کے بعد رتی بائی نے مجھے مالش اور مٹھی کی تفصیل بتائی ابتدائی دنوں میں تو مالش کارگر ہوتی ہے۔ فسٹ کلاس ڈاکٹر کا ما فک بائی مریضہ کو زمین پر لٹا کر چھت سے لٹکتی ہوئی رسی یا کسی لاٹھی کے سہارے اس کے پیٹ پر کھڑی ہو کر خوب کھوندتی ہے۔ یہاں تک کہ آپریشن ہو جاتا ہے۔ یا اسے دیوار کے سہارے کھڑا کر کے بائی پہلے اپنے سر میں خوب کنگھی کر کے کس کے جوڑہ باندھ لیتی ہے۔ پھر چلو بھر کڑوا تیل سر پر ڈال کر مریضہ کے پیروں کو مینڈھے کی طرح ٹکراتی ہے۔ سخت جان محنت مزدوری کرنے والی بعض نوجوان عورتوں پر اس کا بھی کبھی کبھی کچھ اثر نہیں ہوتا' تب مٹھی کی نوبت آتی ہے۔ بے دھلے گندے میل بھرے ناخن والے ہاتھ کو تیل میں ڈبو کر جسم میں سے دھڑکتی ہوئی جان کو توڑ کر نکال لیا جاتا ہے!

عموماً آپریشن پہلے وار میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بائی اناڑی ہو تو کبھی صرف ایک ہاتھ ٹوٹ کر آ جاتا ہے' کبھی گردن بچ جاتی ہے اور کبھی جسم کا وہ حصہ بھی گھسٹتا چلا آتا ہے جسے اندر ہی رہنا تھا۔

مالش سے بہت زیادہ موتیں نہیں ہوتیں۔ ہاں عموماً مریضہ مختلف امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔ جسم جگہ بے جگہ سے سوج جاتا ہے۔ مستقل گھاؤ بن جاتے ہیں جو رستے رہتے ہیں۔ بخار رہنے لگتا ہے اور پھر اللہ کی دی موت بھی آنے والے کو آ ہی جاتی ہے۔ مٹھی سخت نازک موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ جان پر کھیل کر اور عموماً بائی لوگ جان پر کھیل جاتی ہیں۔ جو بچ رہتی ہیں کچھ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہتیں' کچھ چند سال گھسٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

اور رتی بائی نے کہا یہی سزا ہے ان بدقماش عورتوں کی۔ مرنا تو چاہیے ان کو۔

مجھے بڑے زور سے قے ہوئی اور رتی بائی' جو چٹخارے لے لے کر سنا رہی تھیں' بوکھلا کر بھاگیں۔ سنسنان خاموش اسپتال میں مجھے وحشت ہونے لگی۔ یا خدا! انسان کو جنم دینے کی اتنی بھیانک سزا۔ میں نے غنودگی میں ڈوبتے ہوئے سوچا۔

خوف سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ رتی بائی کی کھینچی ہوئی تصویروں میں تخیل نے رنگ بھرا' پھر جان ڈال دی۔ کھڑکی کے پردے کا سایہ دیوار پر ہل رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سایہ گنگا بائی کی مالش زدہ' خون میں نہائی ہوئی لاش کی طرح تڑپنے لگا۔ ایک بھیانک میلے ناخنوں والا آہنی شکنجہ دماغ میں مٹھی بن کر اتر گیا۔ ایک وار میں ننھی ننھی انگلیاں' ڈھلکی ہوئی گردن خون میں غلطاں و پیچاں۔ میرا دل و دماغ میں نے چیخنا چاہا کسی کو پکارنا چاہا مگر حلق سے آواز نہ نکلی۔ میں نے گھنٹی کا سوئچ دبانے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر جنبش نہ ہوئی۔ خاموش چیخیں میرے سینے میں گھٹتی رہیں۔

اسپتال کی خاموش فضا میں جیسے کسی مقتول کی چیخیں یکا یک گونج اٹھیں۔ یہ چیخیں میرے کمرے سے آتی تھیں جنہیں میں نے نہیں سنا۔ میں نے وہ بھی نہیں سنا جو میری زبان سے انجانے میں نکل رہا تھا۔

''کوئی برا خواب دیکھا ہوگا''۔ نرس نے مجھے مارفیا کا انجکشن دے دیا۔ میں نے بہت کہنا چاہا ''نرس مجھے مارفیا نہ دو۔ وہ دیکھو سامنے گنگا بائی کی مالش زدہ' خون میں نہائی لاش صلیب پر چڑھی تڑپ رہی ہے۔ اس کی چیخیں میرے دماغ میں بیچ کس کی طرح دھنستی جا رہی ہیں۔ دور کہیں نالے میں دم توڑتے ہوئے بچے کی سسکیاں ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح میرے دل پر پڑ رہی ہیں۔ مرے اعصاب پر مارفیا کا پردہ نہ ڈالو۔ رتی بائی کو پولنگ بوتھ جانا ہے۔ نئے منسٹر اس کے جات والے ہیں۔ اب بیاج چک جائے گا اور گنگا بائی مزے سے دھان کوٹے گی۔ یہ نیند کی چادر میرے دماغ پر سے سرکا دو۔ مجھے جاگنے دو۔ گنگا بائی کے جیتے جیتے خون کے دھبے سفید چادر پر پھیلتے جا رہے ہیں۔ مجھے جاگنے دو''۔

میز کے سامنے بیٹھے ہوئے کلرک نما شخص نے میرے بائیں ہاتھ کی انگلی پر نیلی روشنائی کا ٹیکہ لگایا تو میں جاگ پڑی۔

''ہمارا جات والے کے ڈبے میں ڈالنا' ہاں''۔ رتی بائی نے مجھے ہدایت کی۔

رتی بائی کے جات والے کا ڈبہ ایک لحیم شحیم مٹھی بن کر میرے دل و دماغ سے ٹکرایا اور میں نے اپنی پرچی اس ڈبے میں نہیں ڈالی۔

غلام عباس

بھنور

اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کے لیے صوم وصلوۃ کا پابند ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مذہبی ولولے کی تسکین کے لیے اس سے کہیں سوا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ جس نور سے ان کا سینہ روشن ہے اس کی کرن دوسروں تک بھی پہنچے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت کے لیے خطرناک جگہوں پر بھی جانے سے نہیں گھبراتے۔ انہیں نہ جان کا خوف ہوتا ہے نہ جگ ہنسائی کا۔ بلکہ وہ اس کام کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

حاجی شفاعت احمد خاں ایسے ہی دینداروں میں سے تھے۔ پچاس کے لگ بھگ سن۔ بھاری بھرکم جسم مگر خوب گٹھا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں کبھی کسرت سے شوق رہا ہوگا۔ سرخ وسفید رنگ' چوڑا چہرہ' کڑ بڑی داڑھی مگر خوب بھری ہوئی۔ آنکھیں بڑی بڑی شربتی رنگ کی' جن میں ہر وقت سرخی جھلکتی رہتی۔ چہرے پر ایک جلالی کیفیت۔ لباس ان کا عموماً یہ ہوتا۔ خاکی رنگ کی شلوار خاکی رنگ کی قمیض' چارخانے کپڑے کا کوٹ' پاؤں میں نری کا جوتا جو ہمیشہ گرد سے اٹا رہتا۔ سر پر سفید صافہ کلاہ پر بندھا ہوا۔ ہاتھ میں موٹے بید کی چھڑی' غرض لباس اور شکل وصورت سے وہ اچھے خاصے مرد مجاہد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی صاحب صبح کو شہر کے ایک سرے سے جوگشت شروع کرتے تو شام ہوتے ہوتے پورے شہر کو جیسے کھنگال ڈالتے۔ ان کے جاننے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ قدم قدم پر علیک سلیک ہوتی رہتی۔ کبھی پاؤ پاؤ گھنٹے سڑک کے کنارے ہی تلقین وہدایت کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کوئی جان پہچان والا کسی ضرورت سے ساتھ لے جاتا مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ پھر گشت میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

وہ اپنی دین داری اور بزرگی کی وجہ سے بڑے بڑے ہر دل عزیز تھے۔ یہاں تک کہ شہر کے حکام بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ کبھی محلے کا کوئی آوارہ مزاج لڑکا جواء کھیلنے یا کسی اور فعل شنیعہ کے الزام میں پکڑا جاتا تو اس کا باپ حاجی صاحب ہی کی پناہ لیتا۔

حضور! اس نالائق کے ہاتھوں سخت عاجز آ گیا ہوں۔ میں نے تو کبھی کا عاق کر دیا ہوتا مگر اس کی بدنصیب

ماں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ جب سے سنا ہے کہ حوالات میں بند ہے سر پیٹ پیٹ کر برا حال کر لیا ہے۔

اور حاجی صاحب کی سفارش پر تھانے دار معمولی سی تنبیہہ کے بعد لڑکے کو رہا کر دیتا۔

ان کے رسوخ کی ایک وجہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی شہر کے اہل کاروں میں سے تھے۔ شروع ہی سے وہ نیک دل اور منکسر المزاج تھے۔ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہر مہینے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ جب انہیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔ اس فریضہ سے فراغت پا کر ہنسی خوشی وطن لوٹے تھے کہ اچانک ایک المناک حادثہ ان پر گزرا۔ ان کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی' ہیضے کا شکار ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا اور پھر اس کے دو ہی دن بعد اس کی ماں بھی جسے بیٹے کی تیمارداری میں چھوت لگ گئی تھی' اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس واقعہ کا ان کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے علائق دنیوی سے منہ پھیر لیا اور باقی عمر ہدایت اور تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

اسی زمانے میں ان کے سر میں یہ دھن سمائی کہ رنڈیوں کی صلاح کی جائے بھلا قحبہ خانوں سے بڑھ کر معصیت کے اڈے اور کون سے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دستور تھا کہ ہر جمعرات کی شام وہ قرآن مجید سبز جزدان میں رکھ' سینے سے لگا رنڈیوں کے بازار کا رخ کرتے اور انہیں گناہوں سے توبہ کرنے اور نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ رفتہ رفتہ ان عورتوں کے گھروں میں ان کی آمد و رفت ایک معمول بن گئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی گانا بجانا بند کر دیا جاتا اور ان کے پند و نصائح کو خاموشی سے سنا جاتا اس کے بعد گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا نائکہ ایسے لہجہ میں، جو ہوتا تو نرم مگر طعن سے خالی نہ ہوتا' کہتی:

''حضرت اپنے شوق سے تو ہم یہ گناہ کرتے نہیں۔ یہ دوزخ جو لگا ہے اس کو بھی تو بھرنا ہے۔ آپ ہماری گزر بسر کا انتظام کر دیجئے۔ ہم آج ہی اس پیشے کو چھوڑے دیتے ہیں' مگر انتظام معقول ہونا چاہیے۔ ماما گیری تو ہم کرنے سے رہے۔''

اور یوں انہیں وقتی طور پر ٹال دیا جاتا۔

مگر کبھی کبھی ان گھروں میں حاجی صاحب کی تحقیر بھی خوب ہوتی اور انہیں گناہ اور بے حیائی کے ایسے ایسے منظر دیکھنے پڑتے کہ شرم سے نظریں جھکا لینی پڑتیں۔ ایک دفعہ ایک کوٹھے پر کسی ضیافت کا اہتمام تھا۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ قحبہ نے جس کے منہ سے شراب کے نشے میں رال ٹپک رہی تھی' لپک کے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور ان کی لمبی ڈاڑھی کے پے در پے بوسے لینے شروع کر دیئے' پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی:

"اے میرے مجازی خدا مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے پاؤں دابوں گی۔ تیرے سر میں تیل ڈالوں گی۔ تیری ڈاڑھی میں کنگھی کروں گی"

اور جتنی قحبائیں اور ان کے آشنا اس کوٹھے پر جمع تھے' یہ منظر دیکھ مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

ایسے موقعوں پر وہ پیغمبروں اور ولیوں کے قصے یاد کرتے کہ کیسی کیسی ذلتیں اور ایذائیں انہیں راہ حق میں اٹھانی پڑیں اور اس طرح اپنے دل کو تقویت دے کر وہ پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتے۔

رفتہ رفتہ وہ اس محلے میں خاصے بدنام ہو گئے۔ بعض دفعہ آوارہ لڑکوں اور اوباش لفنگوں کی ٹولی ان کے پیچھے ہو لیتی۔ یہ لوگ بالا خانوں میں بیٹھی ہوئی بیسواؤں کی طرف ہاتھوں سے طرح طرح کے اشارے کرتے' فحش آوازے کستے اور حاجی صاحب کو اپنا لیڈر بنا کر مضحک نعرے لگاتے۔ ان ہی باتوں سے اکثر لوگ حاجی صاحب کو مجذوب یا سودائی سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کی توضیح بھی کرتے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے ان کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔

ایک دن حاجی صاحب کے پاس ایک شخص خبر لایا کہ بازار میں دو نئی رنڈیاں آئی ہیں۔ ایک کا نام گل ہے اور دوسری کا بہار۔ دونوں بہنیں ہیں۔ ایک ناچتی ہے دوسری گاتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے فن میں ماہر ہیں۔ حسن بھی دونوں کا قیامت کا ہے' چند ہی روز میں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح گر رہے ہیں۔ سنا ہے بنک کا ایک ملازم ان کو رام کرنے کے لیے بنک سے بہت سا روپیہ اڑا لایا مگر پولیس موقع پر ان بیسواؤں کے گھر پہنچ گئی اور اس شخص کو نوٹوں کی گڈیوں سمیت پکڑ لیا گیا۔ ایک نوابزادے نے جو قلاش ہو گیا تھا' اپنی محرومی پر ان کے مکان کی سیڑھیوں میں پستول سے خودکشی کر لی۔ غرض وہ وہ ہنگامے ہوئے کہ ایک مدت سے سننے میں نہیں آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوسری زہرہ اور مشتری ہیں جن کے سحر حسن سے انسان تو کیا فرشتے بھی محفوظ نہیں۔

حاجی صاحب نے مصلحتاً کچھ دنوں سے اس بازار میں جانا چھوڑ رکھا تھا' مگر اس نئے فتنے کا حال سنا تو فوراً ان کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ انہوں نے دل میں کہا کہ ان عورتوں کو جلد سے جلد راہ راست پر لانا چاہیے' ورنہ خدا معلوم یہ کتنے گھروں کو تباہ اور کتنے لوگوں کے ایمان کو غارت کر دیں گی۔

انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی' قرآن شریف سینے سے لگایا اور پتہ پوچھتے پوچھتے گل اور بہار کے بالا خانے پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رات بھر جاگنے کے بعد صبح کو جو سوئی تھیں تو اب سہ پہر کے قریب جا کر بیدار ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ایک بوڑھی خادمہ کے سوا گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے سرخ

سرخ آنکھوں والے ایک مجذوب پٹھان کو جو دیکھا تو ڈر کے مارے ان کی گھگھی بندھ گئی۔

حاجی صاحب چند لمحوں تک حیرت سے ان کے حسن و جمال کو دیکھتے رہے پھر وہ پرشفقت لہجہ میں ان سے مخاطب ہوئے۔

''میری بیٹیو! مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں کسی بری نیت سے نہیں آیا۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری عیش و عشرت کی یہ زندگی ایک دھوکا ہے اور یہ دھوکا صرف اسی وقت تک قائم ہے جب تک تمہارے گالوں میں خون کی یہ چند بوندیں ہیں۔ ان کی تروتازگی آخر کب تک باقی رہے گی۔ پانچ سال، سات سال، حد سے حد دس سال۔ اس کے بعد تم ایک قابل نفرت چیز بن جاؤ گی۔ اپنے عشاق کی نظروں ہی میں نہیں، اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کی نظروں میں بھی۔ یہاں تک کہ تمہاری اولاد کو بھی تم سے گھن آئے گی۔ اس لیے کہ تمہارا وجود ان کے لیے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔

میری بچیو! ذرا غور کرو۔ تمہاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے۔ دن رات تمہارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی، قدم قدم پر جان کا خوف، ہر وقت پولیس کا دھڑکا، عدالت میں پیشیاں، یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ میری بیٹیو، تمہاری جگہ یہ بالا خانہ نہیں ہے بلکہ کسی شریف گھر کی چار دیواری ہے جہاں تم ملکہ بن کر رہو۔ جہاں تمہارا شوہر نگہبان اور محافظ ہو، تمہارے ناز اٹھائے اور تمہارے پسینے کی جگہ خون بہائے اور جہاں تمہاری اولاد کے لیے تمہارے قدموں کے نیچے جنت ہو۔'' یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز رقت سے بھر آئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

دونوں بہنوں پر سے خوف و ہراس تو دور ہو گیا تھا مگر ان باتوں کو سن کر وہ گم سم رہ گئی تھیں۔ آخر بڑی بہن گل نے کہا۔

''حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور!''

حاجی صاحب نے اس دن ان سے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر ان کو دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اپنا باپ سمجھو اور جب کبھی کوئی مشکل پڑے یا میری ضرورت ہو تو اس پتہ پر مجھے خبر کر دو۔

اس واقعہ کو آٹھ روز بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح ایک تانگہ ان کے مکان کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا۔ تانگے میں دو ایک ٹرنک اور کچھ چھوٹی چھوٹی بقچیاں بھی تھیں۔ حاجی صاحب اس عورت کو اپنے مکان میں لے گئے اور اس کا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔

یہ بہار تھی جو سچ مچ تائب ہو کر آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے وہ روتی رہی ہے اور اب بھی اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

"جس دن آپ آئے تھے"۔ اس نے حاجی صاحب کو بتلایا۔ "اسی دن سے ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا کیونکہ اب میں پل بھر کے لیے بھی بازار میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر آج صبح میں اس سے علیحدہ ہو گئی ہوں۔"

اپنی اس کامیابی پر جو بازاری عورتوں کے اصلاحی کام کے سلسلے میں ان کی پہلی فتح تھی، حاجی صاحب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شاید بیٹے کے جی اٹھنے پر بھی نہ ہوتی۔ انہوں نے فوراً کپڑے بدلے اور سودا سلف لینے بازار چلے گئے۔ ان کے پیچھے بہار نے جھاڑو لے کر سارے گھر کی صفائی کی۔ چولہا مدت سے راکھ سے بھرا تھا، اس کو صاف کیا۔ باورچی خانے کے فرش کو دھویا پونچھا اور اپنے سگھڑ پن سے ظاہر کر دیا کہ حسن و جمال، علم اور شستہ لب و لہجے کے ساتھ ساتھ وہ امور خانہ داری سے بھی ناواقف نہیں۔

چند ہی دنوں میں بہار نے جس کا نام حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا اپنی خدمت گزاریوں سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدردان مل گیا تو ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔ حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ الفت ہو گئی۔ جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے۔ ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتی۔ اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لیے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتے تھے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے۔

سرکاری ملازمت کے دوران میں حاجی صاحب کا ایک رفیق کار رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ وہ حاجی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ بھی اس سے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی مر چکا تھا مگر اس کے لڑکے انور نے حال ہی میں انجنیئری کا امتحان پاس کیا تھا اور اسے ایک معقول سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ انور حاجی صاحب کو تایا ابو کہا کرتا اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے کہ وہ اپنی اس کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلقیس کے رشتے کے سلسلے میں ان کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ وہ اس کے دفتر پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر بلایا۔ ادھر گھر آ کر انہوں نے بلقیس سے کہا۔

"بیٹی! آج شام ایک مہمان آ رہا ہے۔ وہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی نشانی ہے۔ تم یہ میلے کپڑے اتار کر کوئی اچھا سا لباس پہن لینا، وہ میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ اس سے پردہ نہیں کرنا ہو گا۔"

شام کو انور کھانے پر آیا تو بلقیس کے حسن اس کی شائستگی اور حیا کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اس کو بلقیس کی بپتا سنائی اور اس سے کوئی بات چھپا نہ رکھی۔ دوسرے دن وہ پھر آیا، پھر تیسرے دن، پھر دن میں دو دو مرتبہ آنے لگا اور آخر مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

انور اور بلقیس کی خوب گزر ہونے لگی۔ وہ دونوں اکثر حاجی صاحب سے ملنے آیا کرتے۔ انور اپنی بیوی کو فریفتگی کی حد تک چاہتا تھا ادھر بلقیس بھی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ حاجی صاحب سے بھی ایسی الفت کرنے لگی گویا وہ سچ مچ باپ ہیں اور پھر یہی تو تھے جن کے طفیل وہ گمراہی کے گڑھے سے نکلی تھی۔

جب ایک سال گزر گیا تو انور کی تبدیلی کسی اور شہر ہو گئی۔ حاجی صاحب ان میاں بیوی کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تو جدائی کے خیال سے روتے روتے بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔ حاجی صاحب نے بڑی تسلیاں دے کر اسے رخصت کیا۔

وہ باقاعدگی سے ہر مہینے حاجی صاحب کو خط لکھتی جس میں اس کی اور انور کی خیریت اور گھر کے حالات تفصیل سے لکھے ہوتے۔ اس کے ان خطوں میں ایک بلبل کی سی چہچہاہٹ تھی۔ ان خطوں کا سلسلہ کوئی دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد جو خطوط آئے ان کا لہجہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ حاجی صاحب نے اس تبدیلی کو بلقیس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔ آخر تیسرے سال ایک خط آیا جسے پڑھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ لکھا تھا۔

> ابا جان! تسلیم! مجھے افسوس ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ کو صدمہ پہنچے گا۔ میں نے عرصے تک اس معاملے کو آپ سے چھپائے رکھا تاکہ آپ کو دکھ نہ ہو لیکن اب بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کا چھپانا ممکن نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے شوہر انور کا کچھ قصور نہیں۔ اس کی تمام ذمہ داری ان کے رشتہ داروں پر ہے جو ہر روز آ آ کر ان کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح میری پچھلی زندگی کا حال معلوم ہو گیا ہے اور وہ مجھ سے سخت نفرت کرنے لگے ہیں اور برملا طعنے دیتے ہیں۔ چونکہ بدقسمتی سے اس عرصے میں میرے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی جو شاید انور کو مجھ سے قریب تر کر دیتی۔ اس لیے یہ لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ انور میاں سے مجھے طلاق دلوا دیں۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کو وہ ان کے پلے باندھنا چاہتے ہیں۔ اچھی شریف لڑکی ہے، بے چاری شکل کی بھی بری نہیں۔ اب میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مجھے دھکے دے

کر نکال دیں آپ خود آئیں اور مجھے طلاق دلوا کر لے جائیں۔

آپ کی پیاری بیٹی

بلقیس

اس خط کی عبارت نے حاجی صاحب کو سخت بے چین کر دیا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ اسٹیشن پہنچے اور پہلی گاڑی سے اس شہر کو روانہ ہو گئے جہاں انور ملازم تھا۔ رات بھر وہ غم اور غصے سے کھولتے رہے۔ ان کا جی چاہتا کہ وہ جاتے ہی انور کا منہ نوچ لیں۔ راستے بھر وہ قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے رہے۔

مصالحت کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ جب دلوں میں فرق پڑ جائے تو زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ انور سے حق مہر حاصل کریں اور وہ تمام زیورات اور کپڑے بھی جو انور نے اب تک بلقیس کو بنوا کر دیے تھے۔

انور اور اس کے رشتہ داروں نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ انور کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد بلقیس سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اسے کسی قدر رنج بھی ہوا کیونکہ ابھی تک اس کے دل میں بلقیس کی کچھ کچھ محبت باقی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ حاجی صاحب بلقیس کو ساتھ لے دو تانگوں میں اسباب لدوا اسی رات اسٹیشن پہنچے اور دوسرے دن گھر آ گئے۔

بلقیس اب پھر حاجی صاحب کے پاس رہنے لگی۔ حاجی صاحب کو اب پھر اس کے رشتے کی فکر ہوئی اور ابھی تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ انہوں نے اس کے لیے ایک اور شوہر تلاش کر لیا۔ اب کے جو آدمی چنا گیا وہ انور کی طرح نہ تو کم عمر تھا اور نہ زیادہ تعلیم یافتہ اور نہ اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے تھا۔ وہ میوے کا کاروبار کرتا تھا۔ آئے دن دساور سے میوے کی بھری ہوئی لاریاں اس کے یہاں آتی رہتی تھیں۔ شہر کے میوہ فروشوں میں اس کی بڑی ساکھ تھی۔

یہ میوہ فروش جس کا نام ربانی تھا رنڈوا تھا اور کسی نیک بیوہ سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے حق مہر کے طور پر پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک مکان بلقیس کے نام لکھوانے کی شرط پیش کی جسے اس نے بلا حیل و حجت منظور کر لیا دراصل یہ میوہ فروش بہار کے پرانے مگر ناکام عشاق میں سے تھا۔ جب بہار بازار سے غائب ہوئی تھی تو وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ پھر کچھ دن بعد جب اس نے سنا کہ حاجی صاحب نے اسے کسی انجینئر سے بیاہ دیا ہے تو وہ ایک آہ سرد بھر کے رہ گیا تھا۔ اب جو اسے اس طلاق کا حال معلوم ہوا تو اس کے دل میں پھر بہار کی آرزو تازہ ہو گئی اور اس نے جلد ہی منت خوشامد سے حاجی صاحب کو اس رشتے پر آمادہ کر لیا مگر حاجی

صاحب نے جب تک پورا حق مہر وصول نہ کر لیا میوہ فروش کو بلقیس کی شکل تک نہ دیکھنے دی۔

بلقیس نے ایک اطاعت مند بیٹی کی طرح حاجی صاحب کے تجویز کیے ہوئے رشتے کو صبر شکر سے قبول کر لیا اور دونوں کی خاصی گزر ہونے لگی' یہاں تک کہ ایک سال ہنسی خوشی میں گزر گیا' مگر یہ میوہ فروش طبعاً عیاش واقع ہوا تھا' شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا مگر جلد ہی اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی اور وہ اس سے ایسا سلوک کرنے لگا گویا وہ اس کی داشتہ ہو وہ مصر تھا کہ بلقیس رات رات بھر اس کے ساتھ جاگے اور شراب نوشی میں شریک ہو۔ پھر وہ اس کا بھی متمنی تھا کہ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوں اور بلقیس ساقی مہمانی گری کی خدمت سرانجام دے اور وہ دوستوں سے فخریہ یہ کہہ سکے۔

''یہی تھا وہ لعل بے بہا جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی اور اب میں تنہا اس کی قسمت کا مالک ہوں۔''

مگر بلقیس نے اس کی ان خواہشوں کو سختی کے ساتھ رد کر دیا' وہ اس کے دوستوں کی ضیافتوں اور ان کی مے خواری سے تو تعرض نہ کرتی مگر خود کبھی ان کے سامنے نہ آتی۔

رفتہ رفتہ میوہ فروش کا دل گھر سے اچاٹ رہنے لگا اور یہ محفلیں اب اوروں کے ہاں منعقد ہونے لگیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے۔ کئی مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ آخر ایک دن میوہ فروش نے شراب کے نشے میں بلقیس کو اس قدر پیٹا کہ وہ کئی دن تک بستر سے نہ اٹھ سکی۔

حاجی صاحب کو میاں بیوی کی ناچاقی کا علم تھا مگر جب انہیں اس مار پیٹ کی خبر ہوئی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ اسی وقت میوہ فروش کے گھر پہنچے اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ میوہ فروش نے معافی مانگی' منت سماجت کی مگر حاجی صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا۔

''اگر تم نے فوراً طلاق نہ دی تو میں تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا۔''

میوہ فروش حاجی صاحب کے اثر و رسوخ کو بخوبی جانتا تھا۔ مقدمہ بازی سے خائف ہو کر ناچار طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔

اب کے بلقیس سال بھر تک حاجی صاحب کے گھر پر رہی۔ جب کبھی حاجی صاحب اس کے رشتے کا سوال اٹھاتے تو وہ تنک کر کہتی۔

''ابا جان آپ کو میری کیوں فکر رہتی ہے۔ میں آپ پر بھاری ہوں کیا؟''

مگر ایک دور اندیش باپ کی طرح حاجی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بلقیس زیادہ عرصے گھر میں بیٹھی رہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اصلاحی کام میں ناکام رہے۔ ان کا منصوبہ ناقابل عمل

ثابت ہوا مگر ایک مرتبہ فتح حاصل کر کے اب وہ کسی طرح اس شکست کے لیے تیار نہ تھے چنانچہ انہیں پھر اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی اور بلقیس کچھ تو حاجی صاحب کے اصرار سے اور کچھ اپنے مستقبل کے خیال سے تیسری مرتبہ پھر شادی پر رضامند ہو گئی۔

اب کے حاجی صاحب نے شوہر کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا اور مہینوں اس کے مزاج اور چال چلن کے بارے میں تفتیش کرتے رہے۔

یہ ایک نوعمر شخص تھا جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔ حد درجہ کم سخن، بھولا بھالا ناک نقشہ بھی اچھا تھا' البتہ ہاتھ پاؤں کا ذرا دبلا تھا۔ سارا دفتر اس کی سادگی مزاج اور اطاعت گزاری کا معترف تھا۔ ایسے داماد کو پا کر حاجی صاحب مطمئن ہو گئے۔ ادھر بلقیس نے بھی خوشی خوشی اسے قبول کر لیا' البتہ اس بات کی ذرا خلش تھی کہ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی۔

اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا' بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں' گھر کا سامان' زیور' کپڑا لتا پہلے ہی وافر تھا۔ اس کلرک کا نام منیر تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ کچھ دور کے رشتہ دار تھے مگر وہ اس کے خرچ کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہ تھے اور اس نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔

بلقیس اور منیر خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ محبت کے بندھنوں نے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔ بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ جو خوشی انور سے علیحدگی کے بعد اس سے چھن گئی تھی وہ اسے پھر مل گئی ہے۔ ادھر منیر بھی آٹھوں پہر اسی کا دم بھرتا تھا۔ وہ ایسا صالح نوجوان تھا کہ کسی قسم کا نشہ یا لت اس کو نہ تھی۔ دفتر سے چھٹی ملتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا اور پھر بیوی کی قربت میں ایسا کھو جاتا کہ دوسرے دن دفتر جانے کے وقت ہی گھر سے نکلتا۔

دن پر دن گزرتے گئے' ہفتے' مہینے اور پھر سال دونوں کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب حاجی صاحب بھی بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ تبلیغ اور ہدایت کا وہ پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں رہا تھا۔ گھر سے کم ہی باہر نکلتے مگر ان کو اطمینان تھا کہ بالآخر ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے اس دوران میں منیر کو نوکری کے سلسلے میں کئی جگہ تبدیل ہو کر جانا پڑا مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے بلقیس حاجی صاحب کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیتی رہتی۔

ایک دن حاجی صاحب کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر اچانک ایک مرتبہ پھر دنیا ان کی آنکھوں میں

اندھیر گئی۔ بات یہ تھی کہ منیر کی صحت پچھلے سال سے دھیرے دھیرے گرنی شروع ہوگئی تھی۔ منیر کا ہر وقت گھر میں پڑے رہنا، کھیل تفریح میں حصہ نہ لینا اس کی تندرستی کے لیے ضرر رساں ثابت ہوا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی کھانسی بھی اٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ ابتدائی دق کے آثار ہیں اور انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ دفتر سے طویل رخصت لے لی جائے اور اسے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر رکھا جائے۔ خط کی آخری سطور یہ تھیں۔

لیکن میرے پیارے ابا جان! آپ اس خبر سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ منیر میاں سال بھر باقاعدہ علاج کرانے سے تندرست ہو جائیں گے۔ میں خود ان کی تیمارداری کروں گی اور جس صحت افزا مقام پر وہ رہیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی۔ شفا تو اللہ نے چاہا انہیں ضرور ہو جائے گی مگر اس میں تین چار سو روپیہ ماہوار اٹھے گا، سو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ جو میرے نام کا مکان ہے اسے فروخت کر دیں آخر جائداد اسی قسم کی ضرورتوں ہی کے لیے تو ہوتی ہے، جان ہے تو جہان ہے۔ امید ہے کہ آپ ان تمام باتوں کا جواب مفصل لکھیں گے یا خود تشریف لائیں گے۔

آپ کے دیدار کی طالب

بلقیس

اس خط کو پڑھ کر حاجی صاحب گم سم ہو کر رہ گئے۔ اچانک دل میں ایسا ضعف محسوس ہوا، گویا ان کا آخری وقت آ پہنچا ہو۔۔۔ دو دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ تیسرے دن جب طبیعت سنبھلی تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور جائداد کی فروخت کے سلسلے میں کسی دلال کی تلاش میں نکلے۔ قدم گھر سے باہر رکھا ہی تھا کہ ایک تانگا ان کے دروازے کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی ساتھ کچھ سامان تھا، دو تین ٹرنک، ایک اٹیچی کیس۔

حاجی صاحب ٹھہر گئے، ان کی صورت دیکھ کر اس خاتون نے چہرے سے نقاب اٹھا دی۔ اس کا سن تیس پینتیس برس سے کسی طرح کم نہ ہوگا مگر اس کے حسن میں ابھی تک غضب کی شادابی تھی۔

''میں بہار کی بہن گل ہوں'' اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ ''دس سال ہوئے جیسے حضور نے میری بہن کو دین اور آخرت کی راہ دکھائی تھی ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کی نظر ہو جائے.............''

قدرت اللہ شہاب

تلاش

مایوس' غم دیدہ' بیزار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گوراں فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے۔ جانے دو۔ اس کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ جس طرح میرا کوٹ' میرا اپنا کوٹ ہے۔ میں اس کوٹ کو سنبھال کے رکھوں یا پھاڑ ڈالوں' خود پہنوں یا بیچ دوں یا کسی راہگیر کی جھولی میں ڈال دوں۔۔۔۔۔ مجھے کون روک سکتا ہے۔ میں اپنے کوٹ کا مالک ہوں۔ گوراں اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا راہرو اسے خرید لے گا۔ خریدنے دو' مجھے پشیمانی کا احساس بھی کیوں ہو؟ دنیا کا نظام کاروباری لین دین پر تو قائم ہے اور پھر گوراں کا جسم اس کا اپنا جسم ہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ جب چاہے اور جس قیمت پر چاہے اسے بیچ دے۔ اپنی چیز ہے۔ اپنی چیز پر سب قادر ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا اس میں ٹانگ کیوں اڑائے خواہ مخواہ!

سڑک پر بجلی کے کھمبوں کے نیچے روشنی کے بڑے بڑے دھبے ہیں۔ کھمبوں کے درمیان سنسان اندھیرا ہے۔ گوراں کی زندگی میں بھی تاریک اور اجلے سائے ہیں۔ وہ سڑک کے کالے اور سفید دھبوں کی طرح ساکن اور منجمد نہیں۔ زندگی کے سائے چلتے پھرتے نشان ہیں۔ تمتمائے ہوئے سورج کے سامنے آوارہ بدلیاں آ جائیں تو زمین پر ایک مدوّر سایہ چھا جاتا ہے۔ تھکا ہوا مسافر بے قراری سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ بے وقوف آدمی! جوں جوں وہ سایہ اس کے قریب آتا جائے گا' چھاؤں بکھیرنے والے ابر پارے اس سے دور ہوتے جائیں گے' مجھے اس کا تجربہ ہے۔ میں نے کہا''گوراں تم میری منزل ہو۔ مجھے اپنی منزل تک آنے دو۔''

گوراں نے کہا''آ جاؤ! میں بھی اپنی منزل کے لیے بھٹک رہی ہوں''۔ جوں جوں میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا' میری منزل مجھ سے دور ہوتی گئی جیسے سراب کی طرف بھاگنے والا پیاسا مسافر بھاگتا جائے' بھاگتا جائے اور انجام کار پانی کی ٹھنڈی لہروں کی جگہ ریت کے گرم گرم تودوں میں اٹک کے رہ جائے۔ میں گوراں کی طرف بڑھتا گیا بڑھتا گیا اور جب میں نے گوراں کو قریب قریب پا لیا' وہ گوراں نہ تھی۔ وہ اس کا جسم تھا۔ خوب صورت' مرمریں' ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا' جھنجھناتا ہوا جسم۔ عورت کی کائنات اس کا

جسم ہی تو ہے۔ شاید گوراں کا مرمریں بدن سڑک کے اگلے موڑ پر بک گیا ہو۔ بکنے دو مجھے ہمدردی کا احساس بھی کیوں ہو؟ وہ اپنے خوب صورت جسم کی مالک ہے۔ بالکل مختار جیسے مجھے اپنے کوٹ پر اختیار ہے۔

ظہیر میری باتوں پر ہنستا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ ہم برسوں ہم جماعت رہے تھے۔ اب قسمت کی ستم ظریفی نے ہم دونوں کو ایک ہی دفتر میں اکٹھا کر دیا ہے۔ میں ساڑھے بارہ سو پاتا ہوں۔ ظہیر کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار ہے۔ جب ہم کہیں اکیلے ہوتے ہیں تو وہ بے تکلفی سے میرے سر پر چانٹا مار کر گرجنے لگتا ہے۔

''ابے او صاحب کے بچے! تم روز بروز سڑی ہوتے جا رہے ہو۔ تلاش، فرار، فلسفہ۔۔۔ میں کہتا ہوں سب بکواس ہے۔ تم کیا جانو عورت کس چیز کا نام ہے؟ میری طرف دیکھو۔ جب میری جیب میں ساڑھے پانچ آنے کے پیسے ہوتے ہیں تو میں صبح سویرے سیدھا علم دین سبزی والے کی دکان پر پہنچتا ہوں، آدھ سیر پالک لیتا ہوں، ڈیڑھ پاؤں آلو، دو پیسے کے ٹماٹر اور کسی کو یہ شکایت نہیں ہوتی کہ مجھے سبزی خریدنے کا ڈھنگ نہیں آتا! لیکن اگر کسی روز کوئی حرام زادہ ضرورت سے زیادہ مٹھی گرم کر دے اور میری جیب میں دو ایک روپے کھنکتے ہوں تو میں سبزی منڈی میں جا کے اٹک جاتا ہوں اور دل ہی دل میں سوچتا ہوں کہ علم دین کی دکان بھی کوئی دوکان ہے بھلا؟ باسی مال، سڑے ہوئے پتے، گندی ٹوکریاں، میں ہربھدیال کی دکان پر جھانکتا ہوں۔ کرتار سنگھ کے خوب صورت سٹال کا جائزہ لیتا ہوں اور دل ہی دل میں گوبھی، مٹر، چقندر، سلاد اور انناس کے وٹامنز اے، بی، سی کا تجزیہ کرتا ہوں۔ لیکن حساب ٹھیک نہیں جمتا۔ کبھی وٹامنز کے اجزا میرے دو روپوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ کبھی میرے دو روپے وٹامنز کی قیمت پر بھاری نظر آتے ہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں ساڑھے دس بج جاتے ہیں۔ میں جلدی جلدی کسی چھابڑی والے سے گلی سڑی سبزی تلوا کر بھاگم بھاگ واپس آتا ہوں۔ بیوی ناک بھوں چڑھاتی ہے۔ خالی پیٹ دفتر جاتا ہوں اور وہ حرام زادہ آفس سپرنٹنڈنٹ میرے لیٹ آنے پر آنکھیں نکالتا ہے۔۔۔۔ کیا سمجھے بیٹا؟۔۔۔۔۔۔۔ میرے چالیس روپوں پر دو لڑکیوں کے باپ ریجھے۔ میں نے ایک کو پھانس لیا۔۔۔۔ تمہارے ساڑھے بارہ سو پر بہت سی لڑکیاں اور ان کی مائیں بھنبھنا رہی ہیں۔ ورا ایک کو پھانسو اور عیش کرو۔۔۔۔ ورنہ لٹکے رہو گے بچو۔ جس طرح میں کرتار سنگھ کے سٹال پر لٹک جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔''

ظہیر کی زبان پر عورت کا نام ایک لذیذ چٹخارے کی صورت میں آتا ہے۔ کالج کے دنوں میں اسے چاٹ کا شوق تھا۔ جب کبھی املی کے پانی سے بھرے ہوئے گول گپے منہ میں ڈالتا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے چار چار انگلی لمبی رال ٹپک پڑتی تھی اور وہ کسی خوشگوار لذت سے بلبلا اٹھتا۔۔۔ ہائے ہائے کیا مزہ گول گپا

ہے۔۔۔۔جیسے مس کلیانی کے لال لال ہونٹ پگھل رہے ہوں۔"

چاٹ کے ہر تازہ لقمے کے ساتھ وہ اپنے کالج کی لڑکیوں کا کوئی نا کوئی حسین حصہ نگل جاتا تھا۔ مس کلیانی کے ہونٹ' خالدہ کے دہکتے ہوئے گال' زرینہ کی حنائی انگلیاں۔۔۔ظہیر کہتا ہے' عورت شہد کی مکھی ہے' وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس بھرتی ہے۔ اس کے زہریلے ڈنک پر نہ جاؤ' اس کی رسیلی مٹھاس دیکھو۔ تم نے نیلما کو دیکھا ہے؟ اندر سین ڈسپیچر کی خوب صورت بیوی۔ وہ پاجی اسی دفتر میں گمنام سا امیدوار تھا' لیکن نیلم کی رعنائیوں نے دفتر کی شاہراہ پر رنگین جال بچھا دیئے۔ آفس کا ایک دل پھینک ناخدا زیر دام آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندر چوبیس امیدواروں کے اوپر سے پھلانگتا ہوا ڈسپیچری کی کرسی سنبھال بیٹھا۔۔۔۔۔ہائے عورت کی نگاہ؟ میرے بھائی! اس کی نگاہ سے زنجیریں کٹ جاتی ہیں' تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ نگاہ مرد مومن کی تلاش کون کرے' ذوق یقین کا سودائی کون بنے۔ دنیا ہے تو عورت کی گود میں' عقبیٰ ہے تو اس کی مسکراہٹ میں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اب اندر سین ہیڈ کلرکی کے خواب دیکھ رہا ہے' نیلما کی بلوری گردن میں اب پر لطیف خم پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا کی قسم تم اس سنہری گرداب میں بے تکلف کود جاؤ۔ ایک بیچاری ہیڈ کلرکی کیا چیز ہے؟ تم میری مانو تو اس مرمریں گردن کے ایک حلقے پر ساری کائنات اندر سین کو سونپ دو۔۔۔۔۔ہائے کیا لوچ ہے ظالم کی گردن میں۔ جیسے عمر خیام کی رباعی تھرک تھرک کر ناچ رہی ہو۔۔۔۔"

ظہیر میں ایک یہی بڑا عیب ہے وہ عورت میں عورت کو نہیں دیکھتا' وہ عورت میں اس کا جسم ٹٹولتا ہے اور پھر جسم میں بلوری گردنوں' ناچتی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے سینوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسی پر بس نہیں' وہ جسم کی ہر رعنائی' حسن کے ہر پیچ' سینے کے ہر نشیب و فراز کو بیوپاری نظر سے ناپ تول کر ان پر قیمتوں کے لیبل لگا دیتا ہے۔ نیلما کے گردن کے خم کی قیمت میرے دفتر کی ہیڈ کلرکی ہے۔ صادقہ اس کی بیوی ہے' لیکن ظہیر کہتا ہے کہ صادقہ کی گھنی اور گھنگھریالی زلفوں کی قیمت چالیس روپے ماہوار ہے۔

چنانچہ پہلی تاریخ کو وہ اپنی ساری تنخواہ صادقہ کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ جب کبھی دفتر میں اس کی مٹھی معمول سے زیادہ گرم ہو جائے تو وہ اپنا غبار ہلکا کرنے کے لیے چھمی جان یا گلزار بیگم یا رتنا بائی کے کوٹھے میں پناہ لیتا ہے۔ چھمی جان تین روپے۔۔۔گلزار بیگم پانچ روپے۔۔۔۔رتنا بائی دس روپے۔۔۔۔ کیونکہ اس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا تل ہے اور اس کے عنابی ہونٹوں میں پکے ہوئے انگوروں کا رس چھلکتا ہے۔ ایک دن وہ گوراں کے چوبارے میں گیا۔ اس کی جیب آسودہ تھی' اس نے ایک ایک روپے کے بیس نوٹ گوراں کے سامنے بچھا دیئے۔

گوراں نے کہا ''آپ یہ نوٹ اپنے ہی پاس رکھیں۔آپ میری قیمت نہیں دے سکتے''

ظہیر نے سوچا وہ بن رہی ہے۔اس نے گوراں کو اسی قیمت پر چکایا تھا۔اس نے اپنا بٹوہ نکال کر ہوا میں اچھالا اور فخر سے بولا ''مانگو کیا مانگتی ہو جان تمنا۔آج تمہارا ظہیر خوشحال ہے۔''

گوراں نے ایک تھکی ہوئی انگڑائی لی ''ظہیر صاحب' میں روز روپیہ کماتی ہوں' آپ روز روپیہ لٹاتے ہیں۔لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ آج ایک لمحہ کے لیے' آپ مجھے گوراں نہ سمجھیں ایک عورت سمجھیں۔۔۔۔ایک لمحہ کے لیے' آپ گاہک نہ بنیں ایک مرد بن جائیں۔بس ایک دو بے لوث لمحے میری حیات کو جاوید کر دیں گے۔''

ظہیر ہنسنے لگا۔وہ الو کا پٹھا کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔وہ گوراں کے کھوئے کھوئے اضطراب کو سراہتا رہا۔اس نے زبردستی اسے بیس روپے دیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ازل سے گوراں کی تعمیر میرے لیے ہوئی تھی۔کائنات میں اس کا وجود میرے وجود کا عکس تھا۔لیکن جب ہم ملے تو ہمارے درمیان ایک وسیع اور بھیانک خلا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

وہ اپنے چھبیسویں سال میں ہے۔پچھلے تیرہ برس سے وہ ہر روز بکری کے گوشت کی طرح ترازو میں تل تل کر بکتی رہی ہے۔سینکڑوں' ہزاروں انسان اپنی پشت ہا پشت کی کیچڑ اس پر اچھال چکے ہیں۔بنی نوع انسان کی صدیوں کا سیہ کار زہر گوراں کی رگ رگ میں سمویا ہوا ہے۔ایک قاتل بیماری کے انگارے اس کے خون میں چٹک رہے ہیں۔اس کی گلاب کی پتیوں جیسی ملائم اور مشک بار جلد کے نیچے بڑے بڑے گھاؤ ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے کہ محبت کے دو بے لوث لمحے' اس کی حیات کو جاوید کر دیں گے۔ میں نے کہا ''گوراں! اگر تو کائنات کے آخری کنارے پر بھی ہوتی' تو میں ارض و سما کی وسعتیں پھاند کر تیرے پاس پہنچ جاتا۔''

اس کا جسم بے داغ جسم نہیں۔اس کا جسم پامال جسم ہے۔پھول کی طرح پامال نہیں جو پاؤں کے ایک ہی دباؤ سے ٹوٹ کر مرجھا جاتا ہے بلکہ سڑک کی طرح جس کی چھاتی پر بھک بھک کرتا ہوا اسٹیم رولر ادھر سے اُدھر اُدھر سے اِدھر ریلتا جائے' پیدل چلنے والے جوتیاں چٹخاتے گزرتے جائیں۔ٹم ٹم اور تانگے چخ چخ کرتے نکلتے جائیں' موٹریں گرد اڑاتی بھاگتی جائیں' سڑک گھستی جائے' پتھر ٹوٹتے جائیں' لیکن گذرنے والے گزرتے رہیں' چلنے والے چلتے رہیں اور پھر میونسپلٹی کا سٹیم رولر بھک بھک کرتا ہوا آئے۔۔۔۔

گوراں میں یہ بات تھی کہ وہ اپنے خوبصورت جسم کو میونسپل کمیٹی کی پختہ سڑک کی طرح بچھا کر آپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی تھی۔ پیدل چلنے والوں کی طرح' تھکے ہوئے کلرک' موٹر کی طرح سبک رفتار چھوکرے' اسٹیم رولر کی طرح بھبکتے ہوئے موٹے موٹے سیٹھ۔۔۔۔۔یہ آئے وہ گئے! یہ گرے وہ پھسلے! یہ بیٹھے وہ بھاگے

۔۔۔اور گوراں کنارے کھڑی مسکراتی رہتی تھی۔ گوراں اور گوراں کے جسم کے درمیان ایک زبردست دیوار چین حائل تھی۔ اس دیوار کی بنیاد ایک ننھی سی آرزو پر قائم تھی۔ وہ آرزو دنیا کے خزانوں سے موتی یا ہیرے یا ریشم کے انبار نہیں مانگتی۔ وہ زندگی کے نام پر دو بے لوث لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحوں کی خیرات چاہتی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے دھڑکتے ہوئے لمحے جو اس کی کھڑ کھڑ چلتی ہوئی پن چکی کو جاودانی سکون دے سکتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔

ظہیر کہتا ہے "عورت شہد کی مکھی ہے۔ وہ زندگی کے خشک اور بے کار چھتے میں رس ٹپکاتی ہے" ظہیر بکتا ہے، وہ رتنا بائی کے ہونٹوں کی مٹھاس پر اپنا فلسفہ جماتا ہے۔ صادقہ کی موسیقار آنکھوں سے اپنے مقولے چراتا ہے، سو رکہیں کا۔ ان دو سوتیلی بہنوں کے سستے ایثار نے اس کو اندھا کر دیا ہے۔ اور وہ ایسی مکھیوں کے چھتے نہیں دیکھ سکتا جو رس دیتی ہیں، رس لیتی ہیں، رس چوستی ہیں، رس چراتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ بیگم ستار کی طرح جو بھری محفل میں اپنی جوان چھوکری کو ننگا کر کے بٹھا دیتی ہے "آہا بیٹا' میری ثروت سے ملو، ثروت بڑی شرمیلی لڑکی ہے" اور پھر وہ قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان، اشاروں ہی اشاروں میں شرمیلی ثروت کی ریشمی ساڑھی اور پتلا بلاؤز اتار کر رکھ دیتی ہے۔ یہ ثروت کی صراحی دار گردن ہے۔ یہ رہے ثروت کے مرمریں پستان، یہ ہے ثروت کی لچکیلی کمر۔۔۔۔۔ کوئی دل ہی دل میں بول دیتا ہے شرمیلی ثروت' ایک' شرمیلی ثروت دو شرمیلی ثروت تین۔۔۔۔۔ قیمت ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار۔۔۔۔۔۔۔ گوراں بھی یوں ہی بکتی آئی ہے۔ لیکن گوراں کا نام سنتے ہی بیگم ستار کو غش آ جائے گا' حاجی عثمان کی بھنویں تن جائیں گی' ڈاکٹر رحیم کے ہونٹ بھنچ جائیں گے اور غالباً انہیں وہ امید افزا لمحے بھی یاد نہ رہیں گے جب وہ انشورنس پالیسی بیچنے والوں کی طرح شادی کا بیمہ کر کے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو مکلف شبستانوں کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ ثروت' مجیدہ' زہرہ' خورشید' نجمی' عفت۔۔۔۔۔۔۔ سب خوش گوار لڑکیاں ہیں' حسین' بے حد حسین ستاروں کے جھرمٹ کی طرح' جو نیلے آسمان کے درمیان جگمگا رہے ہوں۔ ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسم۔۔۔۔۔ اوہ میرے خدایا! ان کے مہکتے ہوئے لچکیلے جسموں میں چاند' سورج اور کہکشاں نے اپنا سرمایہ لٹا کر رکھ دیا ہے۔ ان کی نشیلی اور بلیغ آنکھوں میں بڑے بڑے خوش آئند پیام چھلکتے ہیں۔ لیکن ان کی تمناؤں کی معراج مستقبل کے سہانے سپنوں میں ہے۔ وہ آنے والی کل کا انتظار کر رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنے ہوشربا حسن کا خراج وصول کرنا ہے۔ آراستہ بنگلے' چمکیلی گاڑیاں' بھڑکیلے لباس۔ میں ڈرتا ہوں کہ شاید وہ اپنے مصروف لمحوں میں سے ایک بے لوث لمحے کی زکوۃ دے سکیں گی۔

میں نے ظہیر کی خوشامد کی کہ "دوست! تم گوراں کی زندگی کو جاوید نہیں کر سکتے۔ خدا کے لیے اسے

میرے پاس لے آؤ۔ دنیا کی ساری آبادی میں ایک وہ میری مقدس امانت ہے" مقدس؟ ارے توبہ!" ظہیر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔" تم نہیں جانتے گوراں کو اس کے جسم میں اتنے اتنے لمبے جراثیم ہیں۔ گلتے ہوئے زہریلے مہلک کیڑے۔۔۔۔۔۔۔۔تم مقدس کہتے ہو اس سڑتی ہوئی لاش کو۔۔۔۔۔"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ظہیر کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ اس کے نچلے جبڑے کا ایک دانت کٹاک سے ٹوٹ کر قالین پر جا گرا' ظہیر نے گرم گرم' سرخ سرخ خون کی ایک کلی غٹ سے نگل لی۔۔۔۔۔۔۔اور اگلے روز گوراں کو لے کر آیا۔ وہ آئی جھجکتی ہوئی' ہچکچاتی ہوئی' لجائی لجائی سی' جیسے زندگی کے طوفان میں کہیں دور افقی لکیر پر ایک روشنی کا مینار آہستہ آہستہ ابھر رہا ہو۔

ایک دن میں نے کہا" گوراں' تمہارا چوبارہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ تم اپنے بالا خانے کے پٹ مقفل کر دو۔"

گوراں حیران سی ہوگئی۔ اس کے خوش نما ہونٹ تعجب سے کھل گئے۔" کیوں" وہ بولی

میں نے کہا۔" گوراں' تمہارا وجود معمولی سطحوں سے بہت بلند ہے۔ تم بالا خانے کی کھڑکی میں بیٹھنے والی گوراں نہیں ہو۔ تم کسی کے خوابوں میں بسنے والی عروسانہ تکمیل ہو۔ اگلے مہینے ہم دونوں نیلگری کی شاداب پہاڑیوں پر جانے والے ہیں۔ میں تم کو کوہ نور کے سینی ٹوریم میں داخل کروا دوں گا۔ سینی ٹوریم کا بڈھا سپرنٹنڈنٹ میرا دوست ہے۔ وہ تمہارے خون کے قطرے قطرے کو زہریلی چنگاریوں سے پاک کر دے گا۔ تمہاری نس نس میں جو دہکتے ہوئے گھاؤ ہیں وہ بھر جائیں گے۔ تمہارے جیون کو جو گھن کھا رہا ہے' وہ مٹ جائے گا۔۔۔۔۔۔"

"تم سچ کہتے ہو۔" گوراں نے کہا" لیکن' میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے بالا خانے کے پٹ میری روزی کا راستہ ہیں۔ میں انہیں کیسے بند کر سکتی ہوں بھلا؟"

مجھے گوراں کی جہالت پر غصہ آ گیا۔ میں نے اس کی گھنی زلفوں کا گچھا بنا کر اس کے منہ پر بہت سے کوڑے مارے۔" تم اپنے بالا خانے سے اپنی روزی کا سہارا نہ لو' گوراں' کیا سچ مچ تم سمجھتی ہو کہ میں ساڑھے بارہ سو مہینہ صرف اپنے لیے کما رہا ہوں؟"۔

گوراں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں تیز تیز شعاعیں پھیلیں اور بکھر گئیں۔ اس کا اوپر والا دانت کھچ سے نچلے ہونٹ میں دھنس گیا اور پھر یکا یک دو چار وحشی جھٹکوں کے ساتھ اس نے اپنی احمری ساڑھی کو تار تار کر کے رکھ دیا۔ پلک جھپکتے میں میرے سامنے گوراں نہ تھی' اس کا جسم تھا' خوب صورت' مرمریں ستار کے تاروں کی طرح کسا ہوا' جھنجھناتا ہوا جسم۔

''تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔'' وہ میرے ساتھ لپٹ کر مجھے ہاتھوں سے نوچنے لگی۔
''گوراں کی قیمت بیس ٹکے رات تھی۔ تم اسے ساڑھے بارہ سو مہینے پر چکار رہے ہو۔ تم میرے سب سے بڑے گاہک ہو۔ مجھے اپنا شکریہ ادا کرنے دو۔'' اس کے لانبے لانبے سرخ ناخن کئی جگہ میرے جسم میں کھب گئے۔
ایک خون آشام نظر اس نے چاروں طرف دوڑائی۔ میز کے اگالدان کو اٹھا کر زور سے پٹخ دیا۔ اپنی ساڑھی کے الجھے ہوئے ٹکڑوں کو سمیٹا اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ جیسے دور سے جھلکنے والا روشنی کا مینار سمندر کی لہروں میں تحلیل ہو جائے۔ گوراں کی سسکیوں میں لپٹی ہوئی ایک آواز رو رہی تھی۔ ''تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو' تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔ تم میرے سب سے بڑے خریدار ہو' تم بھی مجھے زندگی کا ایک بے لوث لمحہ نہ دے سکے۔''

مایوس' غم دیدہ' بیزار گوراں' فٹ پاتھ پر ہولے ہولے جا رہی ہے' جانے دو۔ وہ اپنے جسم کی مالک ہے۔ شاید اگلے موڑ پر کوئی گزرتا ہوا راہ رو اسے خرید لے گا۔۔۔۔۔ خریدنے دو' مجھے اس پر کوئی اختیار تو نہیں۔۔۔۔۔۔۔

کرشن چندر

ایک طوائف کا خط

پنڈت جواہر لال نہرو اور قائداعظم جناح کے نام

مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے آپ کو کسی طوائف کا خط نہ ملا ہوگا۔ یہ بھی امید کرتی ہوں کہ آج تک آپ نے میری اور اس قماش کی دوسری عورتوں کی صورت بھی نہ دیکھی ہوگی۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو میرا خط لکھنا کس قدر معیوب ہے اور وہ بھی ایسا کھلا خط۔ مگر کیا کروں۔ حالات کچھ ایسے ہیں اور ان دونوں لڑکیوں کا تقاضہ اتنا شدید ہے کہ میں یہ خط لکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ خط میں نہیں لکھ رہی ہوں۔ یہ خط مجھ سے بیلا اور بتول لکھوا رہی ہیں اس لیے مجھے معاف کیجئے گا۔ ایک گری ہوئی عورت آپکو اس بے باکی سے خط لکھ رہی ہے۔ میں صدق دل سے معافی چاہتی ہوں۔ اگر میرے خط میں کوئی فقرہ آپ کو ناگوار گزرے۔ اسے میری مجبوری پر محمول کیجئے گا۔

بیلا اور بتول مجھ سے یہ خط کیوں لکھوا رہی ہیں۔ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں اور ان کا تقاضہ اس قدر شدید کیوں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے سے پہلے میں آپکو اپنے متعلق کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ گھبرایئے نہیں۔ میں آپ کو اپنی گھناؤنی زندگی کی تاریخ سے آگاہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ میں کب اور کن حالات میں طوائف بنی۔ میں کسی شریفانہ جذبے کا سہارا لے کر آپ سے کسی جھوٹے رحم کی درخواست کرنے نہیں آئی ہوں' میں آپ کے دردمند دل کو پہچان کر اپنی صفائی میں جھوٹا افسانہ محبت نہیں گھڑنا چاہتی۔ اس خط کے لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو طوائفیت کے اسرار و رموز سے آگاہ کروں۔ مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں صرف اپنے متعلق چند ایسی باتیں بتانا چاہتی ہوں جن کا آگے چل کر بیلا اور بتول کی زندگی پر اثر پڑ سکتا ہے۔

آپ لوگ کئی بار بمبئی آئے ہوں گے۔ جناح صاحب۔ نے تو بمبئی کو بہت دیکھا ہے۔ مگر آپ

نے ہمارا بازار کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ جس بازار میں میں رہتی ہوں۔ وہ فارس روڈ کہلاتا ہے۔ فارس روڈ' گرانٹ روڈ اور مدن پورہ کے بیچ میں واقع ہے۔ گرانٹ روڈ کے اس پار لمنگٹن روڈ اور اوپیرا ہاؤس اور چوپاٹی۔ میرین ڈرائیو اور فورٹ کے علاقے ہیں جہاں بمبئی کے شرفا رہتے ہیں۔ مدن پورہ میں اس طرف غریبوں کی بستی ہے۔ فارس روڈ ان دونوں کے بیچ میں ہے تا کہ امیر اور غریب اس سے یکساں مستفید ہو سکیں۔ گو فارس روڈ پھر بھی مدن پورہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ ناداری میں اور طوائفیت میں ہمیشہ بہت کم فاصلہ رہتا ہے۔

یہ بازار بہت خوبصورت نہیں ہے۔ اس کے مکین بھی خوبصورت نہیں ہیں۔ اس کے بیچوں بیچ ٹرام کی گڑگڑاہٹ شب و روز جاری رہتی ہے جہان بھر کے آوارہ کتے اور لونڈے اور شہدے اور بے کار اور جرائم پیشہ مخلوق اس کی گلیوں کا طواف کرتی نظر آتی ہے۔ لنگڑے' لولے' اوباش' مدقوق تماش بین' آتشک و سوزاک کے مارے ہوئے کانے' گنجے' کوکین باز اور جیب کترے اس بازار میں سینہ تان کر چلتے ہیں۔ غلیظ ہوٹل' سیلے ہوئے فٹ پاتھ پر میلے کے ڈھیروں پر بھنبھناتی ہوئی لاکھوں مکھیاں' لکڑیوں اور کوئلوں کے افسردہ گودام' پیشہ ور دلال اور باسی ہار بیچنے والے' سینما کی تصویروں کی گلی سڑی کتابیں بیچنے والے' کوک شاستر اور ننگی تصویروں کے دکان دار' چینی حجام اور اسلامی حجام' اور لنگوٹے کس کر گالیاں بکنے والے پہلوان ہماری سماجی زندگی کا سارا کوڑا کرکٹ آپ کو فارس روڈ پر ملتا ہے۔ ظاہر ہے آپ یہاں کیوں آئیں گے۔ کوئی شریف آدمی ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ شریف آدمی جتنے ہیں وہ سب گرانٹ روڈ کے اس پار رہتے ہیں اور جو بہت ہی شریف ہیں وہ ملبار ہل پر قیام کرتے ہیں۔ میں ایک بار جناح صاحب کی کوٹھی کے سامنے سے گزری تھی اور وہاں میں نے جھک کر سلام بھی کیا تھا۔ بتول بھی میرے ساتھ تھی۔ بتول کو آپ سے (جناح صاحب) جس قدر عقیدت ہے اس کو میں کبھی ٹھیک طرح سے بیان نہ کر سکوں گی۔ خدا اور رسول کے بعد دنیا میں وہ اگر کسی کو چاہتی ہے تو وہ صرف آپ ہیں۔ اس نے آپ کی تصویر لاکٹ میں لگا کر اپنے سینہ سے لگا رکھی ہے۔ کسی بری نیت سے نہیں۔ بتول کی عمر ابھی گیارہ برس کی ہے۔ چھوٹی سی لڑکی ہی تو ہے وہ۔ گو فارس روڈ والے ابھی سے اس کے متعلق بڑے برے ارادے کر رہے ہیں مگر خیر وہ کبھی پھر آپ کو بتاؤں گی۔

تو یہ ہے فارس روڈ جہاں میں رہتی ہوں۔ فارس روڈ کے مغربی سرے پر جہاں چینی حجام کی دکان ہے۔ اس کے قریب ایک اندھیری گلی کے موڑ پر میری دکان ہے لوگ تو اسے دکان نہیں کہتے۔
مگر خیر آپ دانا ہیں آپ سے کیا چھپاؤں گی۔ یہی کہوں گی۔ وہاں پر میری دکان ہے اور وہاں پر میں اسی طرح بیوپار کرتی ہوں جس طرح بنیا' سبزی والا' پھل والا' ہوٹل والا' موٹر والا' سینما والا' کپڑے والا یا کوئی اور دکان دار بیوپار کرتا ہے۔ اور ہر بیوپار میں گاہک کو خوش کرنے کے علاوہ اپنے فائدہ کی بھی سوچتا ہے۔ میرا

بیوپار بھی اسی طرح کا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ میں بلیک مارکیٹ نہیں کرتی اور مجھ میں اور دوسرے بیوپاریوں میں کوئی فرق نہیں۔

یہ دکان اچھی جگہ پر واقع نہیں ہے یہاں رات تو کجا دن کو بھی لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اس اندھیری گلی میں لوگ اپنی جیبیں خالی کر کے جاتے ہیں۔ شراب پی کر قے کرتے ہیں۔ جہان بھر کی گالیاں بکتے ہیں۔ یہاں بات بات پر چھرا زنی ہوتی ہے۔ دو ایک خون دوسرے تیسرے روز ہوتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہر وقت جان ضیق میں رہتی ہے اور پھر میں کوئی بہت اچھی طوائف نہیں ہوں کہ پون پل پر جا کے رہوں یا ورلی پر سمندر کے کنارے ایک کوٹھی لے سکوں۔ میں ایک بہت ہی معمولی درجے کی طوائف ہوں اور گو میں نے سارا ہندوستان دیکھا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور ہر طرح کے لوگوں کی صحبت میں بیٹھی ہوں۔ لیکن اب دس سال سے اسی شہر بمبئی میں اسی فارس روڈ پر اسی دکان میں بیٹھی ہوں اور اب تو مجھے اس دکان کی پگڑی بھی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔ حالانکہ یہ جگہ کوئی اتنی اچھی نہیں۔ فضا متعفن ہے۔ کیچڑ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے گندگی کے انبار لگے ہیں اور خارش زدہ کتے گھبرائے ہوئے گاہکوں کی طرف کاٹ کھانے کو لپکتے ہیں پھر بھی مجھے اس جگہ کی پگڑی چھ ہزار روپے تک ملتی ہے۔

اس جگہ میری دکان ایک منزلہ مکان میں ہے اس کے دو کمرے ہیں۔ سامنے کا کمرہ میری بیٹھک ہے۔ یہاں میں گاتی ہوں' ناچتی ہوں' گاہکوں کو رجھاتی ہوں' پیچھے کا کمرہ باورچی خانے اور غسل خانے اور سونے کے کمرے کا کام دیتا ہے۔ یہاں ایک طرف نل ہے۔ ایک طرف ہنڈیا ہے اور ایک طرف ایک بڑا سا پلنگ ہے جس کے نیچے ایک اور چھوٹا سا پلنگ ہے اور اس کے نیچے میرے کپڑوں کے صندوق ہیں' باہر والے کمرے میں بجلی کی روشنی ہے لیکن اندر والے کمرے میں بالکل اندھیرا ہے' مالک مکان نے برسوں سے قلعی نہیں کرائی' نہ وہ کرائے گا۔ اتنی فرصت کسے ہے میں تو رات بھر ناچتی گاتی ہوں اور دن کو وہیں گاؤ تکیے سے سر ٹیک کر سو جاتی ہوں۔ بیلا اور بتول کو پیچھے کا کمرہ دے رکھا ہے۔ اکثر گاہک جب اس طرف منہ ہاتھ دھونے کے لیے جاتے ہیں تو بیلا اور بتول پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگ جاتی ہیں۔ جو کچھ ان کی نگاہیں کہتی ہیں میرا یہ یہ خط بھی کہتا ہے۔ اگر وہ میرے پاس اس وقت نہ ہوتیں تو یہ گناہگار بندی آپ کی خدمت میں یہ گستاخی نہ کرتی۔ جانتی ہوں دنیا مجھ پر تھوتھو کرے گی۔ جانتی ہوں شاید آپ تک میرا یہ خط بھی نہ پہنچے گا پھر بھی مجبور ہوں۔ یہ خط لکھ کے ہی رہوں گی کہ بیلا اور بتول کی مرضی یہی ہے۔

شاید آپ قیاس کر رہے ہوں گے کہ بیلا اور بتول میری لڑکیاں ہیں' نہیں یہ غلط ہے۔ میری کوئی لڑکی نہیں ہے۔ ان دونوں لڑکیوں کو میں نے بازار سے خریدا ہے۔ جن دنوں ہندو مسلم فساد زوروں پر تھا اور

گرانٹ روڈ اور فارس روڈ اور مدن پورہ پر انسانی خون پانی کی طرح بہایا جارہا تھا۔ ان دنوں میں نے بیلا کو ایک مسلمان دلال سے تین سو روپے کے عوض خریدا تھا۔ یہ مسلمان دلال اس لڑکی کو دہلی سے لایا تھا۔ جہاں اسے ایک اور مسلمان دلال راولپنڈی سے لایا تھا۔ جہاں بیلا کے ماں باپ رہتے تھے۔ بیلا کے ماں باپ راولپنڈی میں راجہ بازار کے عقب میں پونچھ ہاؤس کے سامنے کی گلی میں رہتے تھے' متوسط طبقے کا گھرانہ تھا' شرافت اور سادگی گھٹی میں پڑی تھی۔ بیلا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور جب راولپنڈی میں مسلمانوں نے ہندوکو تہ تیغ کرنا شروع کیا اس اس وقت چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ یہ بارہ جولائی کا واقعہ ہے بیلا اپنے اسکول سے پڑھ کے گھر آرہی تھی کہ اس نے اپنے گھر کے سامنے اور دوسرے ہندوؤں کے گھروں کے سامنے ایک جم غفیر دیکھا۔ یہ لوگ مسلح تھے اور گھروں کو آگ لگا رہے تھے اور لوگوں کو اور ان کے بچوں کو اور ان کی عورتوں کو گھر سے باہر نکال کر انہیں قتل کررہے تھے۔ ساتھ ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ بھی بلند کرتے جاتے تھے۔ بیلا نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا۔ وحشی مسلمانوں نے اس کے پستان کاٹ کے پھینک دیئے تھے' وہ پستان جن سے ایک ماں' کوئی ماں' ہندو ماں یا مسلمان ماں' عیسائی ماں یا یہودی ماں۔ اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے اور انسانوں کی زندگی میں اور کائنات کی وسعت میں تخلیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے۔ وہ دودھ بھرے پستان اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ کاٹ ڈالے گئے۔ کسی نے تخلیق کے ساتھ اتنا ظلم کیا تھا کسی ظالم اندھیرے نے ان کی روحوں میں یہ سیاہی بھردی تھی۔ میں نے قرآن پڑھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ راولپنڈی میں بیلا کے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسلام نہیں تھا۔ وہ انسانیت نہ تھی۔ وہ دشمنی بھی نہ تھی۔ وہ انتقام بھی نہ تھا۔ وہ ایک ایسی شقاوت' بے رحمی' بزدلی اور شیطنت تھی جو تاریکی کے سینے سے پھوٹتی ہے اور نور کی آخری کرن کو بھی داغدار کرجاتی ہے۔

بیلا اب میرے پاس ہے۔ مجھ سے پہلے وہ داڑھی والے مسلمان دلال کے پاس تھی اور اس سے پہلے وہ دہلی والے مسلمان دلال کے پاس تھی۔ بیلا کی عمر بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی جب وہ چوتھی میں پڑھتی تھی اپنے گھر میں ہوتی تو آج پانچویں جماعت میں داخل ہورہی ہوتی۔ پھر بڑی ہوتی تو اس کے ماں باپ اس کا بیاہ کسی شریف گھرانے کے غریب سے لڑکے سے کردیتے۔ وہ اپنا چھوٹا سا گھر بساتی۔ اپنے خاوند سے' اپنے ننھے ننھے بچوں سے۔ اپنی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے۔ لیکن اس نازک سی کلی کو بے وقت خزاں آگئی۔ اب بیلا بارہ برس کی نہیں معلوم ہوتی۔ اس کی عمر تھوڑی ہے لیکن اس کی زندگی بہت بوڑھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو ڈر ہے' انسانیت کی جو تلخی ہے یاس کا جو لہو ہے' موت کی جو پیاس ہے' قائداعظم

صاحب شاید اگر آپ اسے دیکھ سکیں تو اس کا اندازہ کر سکیں۔ ان بے آسرا آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر سکیں۔ آپ تو شریف آدمی ہیں۔ آپ نے شریف گھرانوں کی معصوم لڑکیوں کو دیکھا ہوگا۔ ہندو لڑکیوں کو، مسلمان لڑکیوں کو، شاید آپ سمجھ جاتے کہ معصومیت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ ساری انسانیت کی امانت ہے۔ ساری دنیا کی میراث ہے جو اسے مٹاتا ہے اسے دنیا کے کسی مذہب کا کوئی خدا معاف نہیں کر سکتا۔

بتول اور بیلا دونوں سگی بہنوں کی طرح میرے ہاں رہتی ہیں۔ بتول اور بیلا سگی بہنیں نہیں ہیں۔ بتول مسلمان لڑکی ہے۔ بیلا نے ہندو گھر میں جنم لیا ہے۔ آج دونوں فارس روڈ پر ایک رنڈی کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ اگر بیلا راولپنڈی سے آئی ہے تو بتول جالندھر کے ایک گاؤں کھیم کرن کے ایک پٹھان کی بیٹی ہے۔ بتول کے باپ کی سات بیٹیاں تھیں۔ تین شادی شدہ اور چار کنواریاں۔ بتول کا باپ کھیم کرن میں ایک معمولی کاشتکار تھا۔ غریب پٹھان لیکن غیور پٹھان جو صدیوں سے کھیم کرن میں آکر بس گیا تھا۔ جاٹوں کے اس گاؤں میں یہی تین چار گھر پٹھانوں کے تھے۔ یہ لوگ جس حلم و آشتی سے رہتے تھے شاید اس کا اندازہ پنڈت جی آپ کو اس امر سے ہوگا کہ مسلمان ہونے پر بھی ان لوگوں کو اپنے گاؤں میں مسجد بنانے کی اجازت نہ تھی۔ یہ لوگ گھر میں چپ چاپ اپنی نماز ادا کرتے، صدیوں سے جب سے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے عنان حکومت سنبھالی تھی کسی مومن نے اس گاؤں میں اذان نہ دی تھی، ان کا دل عرفان سے روشن تھا لیکن دنیاوی مجبوریاں اس قدر شدید تھیں اور پھر رواداری کا خیال اس قدر غالب تھا کہ لب وا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

بتول اپنے باپ کی چہیتی لڑکی تھی۔ ساتوں میں سب سے چھوٹی، سب سے پیاری، سب سے حسین۔ بتول اس قدر حسین ہے کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی ہے۔ پنڈت جی آپ تو خود کشمیری النسل ہیں اور فن کار ہو کر یہ بھی جانتے ہیں کہ خوبصورتی کسے کہتے ہیں۔ یہ خوبصورتی آج میری گندگی کے ڈھیر میں گڈمڈ ہو کر اس طرح پڑی ہے کہ اس کی پرکھ کرنے والا کوئی شریف آدمی اب مشکل سے ملے گا۔ اس گندگی میں گلے سڑے مارواڑی، گھنی مونچھوں والے ٹھیکیدار، ناپاک نگاہوں والے چور بازاری ہی نظر آتے ہیں۔ بتول بالکل ان پڑھ ہے اس نے صرف جناح صاحب کا نام سنا تھا۔ پاکستان کے نعرے لگائے تھے۔ جیسے تین چار برس کے ننھے بچے گھر میں ''انقلاب جندہ باد'' کرتے پھرتے ہیں۔ گیارہ برس ہی کی تو وہ ہے۔

ان پڑھ بتول۔ وہ چند دن ہی ہوئے میرے پاس آئی ہے۔ ایک ہندو دلال اسے میرے پاس لایا تھا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے میں خرید لیا۔ یہ ہندو دلال اسے لدھیانے سے لایا تھا۔ ایک جاٹ دلال سے۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھی، یہ میں نہیں کہہ سکتی۔ ہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے بہت کچھ کہا ہے کہ اگر آپ اسے سن لیں تو شاید پاگل ہو جائیں۔ بتول بھی اب نیم پاگل ہے۔ اس باپ کو جاٹوں نے اس بیدردی سے

مارا ہے کہ ہندو تہذیب کے پچھلے چھ ہزار برس کے چھلکے اتر گئے ہیں اور انسانی بربریت اپنے وحشی ننگے روپ میں سب کے سامنے آ گئی ہے پہلے تو جاٹوں نے اس کی آنکھیں نکال لیں پھر اس کے منہ میں پیشاب کیا۔ پھر اس کے حلق کو چیر کے اس کی آنتیں تک نکال ڈالیں۔ پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی منہ کالا کیا۔ اسی وقت ان کے باپ کی لاش کے سامنے ریحانہ‘ گل‘ درخشاں‘ مرجانہ‘ سوسن‘ بیگم‘ ایک ایک کر کے وحشی انسان نے اپنے مندر کی مورتیوں کو ناپاک کیا۔ جس نے انہیں زندگی عطا کی‘ جس نے انہیں لوریاں سنائی تھیں‘ جس نے ان کے سامنے شرم سے عجز سے‘ پاکیزگی سے سر جھکایا تھا۔ ان تمام بہنوں‘ بہوؤں اور ماؤں کے ساتھ زنا کیا۔ ہندو دھرم نے اپنی عزت کھو دی تھی۔ اپنی رواداری تباہ کر دی تھی۔ اپنی عظمت مٹا ڈالی تھی۔ آج رگ وید کا ہر منتر خاموش تھا۔ آج گرنتھ صاحب کا ہر دوہا شرمندہ تھا۔ آج گیتا کا ہر اشلوک زخمی تھا۔ کون ہے جو میرے سامنے اجنتا کی مصوری کا نام لے سکتا ہے۔ اشوک کے کتبے سنا سکتا ہے‘ ایلورا کے غم زاروں کے گن گا سکتا ہے۔ بتول کے بے بس بھینچے ہوئے ہونٹوں‘ اس کی بانہوں پر وحشی درندوں کے دانتوں کے نشان اور اسکی پھری ہوئی ٹانگوں کی ناہمواری میں تمہاری اجنتا کی موت ہے۔ تمہارے ایلورا کا جنازہ ہے۔ تمہاری تہذیب کا کفن ہے۔ آؤ‘ آؤ میں تمہیں اس خوبصورتی کو دکھاؤں جو کبھی بتول تھی۔ اس متعفن لاش کو دکھاؤں جو آج بتول ہے۔

جذبے کی رو میں بہہ کر میں بہت کچھ کہہ گئی۔ شاید یہ سب کچھ مجھے نہ کہنا چاہیے تھا۔ شاید اس میں آپ کی ہتک ہے۔ شاید اس سے زیادہ ناگوار باتیں آپ سے اب تک کسی نے نہ کہی ہوں گی۔ نہ سنائی ہوں گی۔ شاید آپ یہ سب کچھ محسوس کرتے ہوں گے۔ لیکن کچھ نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ میں دیکھ رہی ہوں آپ لوگ پنڈت جی‘ جناح صاحب بہت کچھ نہیں کر سکتے بلکہ شاید تھوڑا بہت بھی نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ہمارے ملک میں آزادی آ گئی ہے ہندوستان میں اور پاکستان میں اور شاید ایک طوائف کو بھی اپنے رہنماؤں سے پوچھنے کا یہ حق ضرور ہے کہ اب بیلا اور بتول کا کیا ہو گا۔؟

بیلا اور بتول دو لڑکیاں ہیں۔ دو قومیں ہیں‘ دو تہذیبیں ہیں دو مندر اور مسجد ہیں۔ بیلا اور بتول آج کل فارس روڈ میں ایک رنڈی کے ہاں رہتی ہیں جو چینی حجام کی بغل میں اپنی دکان کا دھندا چلاتی ہے۔ بیلا اور بتول کو یہ دھندا پسند نہیں۔ میں نے انھیں خریدا ہے۔ میں چاہوں تو ان سے یہ کام لے سکتی ہوں۔ لیکن میں سوچتی ہوں میں یہ کام نہیں کروں گی جو راولپنڈی اور جالندھر نے ان سے کیا ہے۔ میں نے انہیں اب تک دنیا فارس روڈ کی دنیا سے الگ تھلگ رکھا ہے۔ پھر بھی جب میرے گاہک پچھلے کمرے میں جا کر اپنا منہ ہاتھ دھونے لگتے ہیں۔ اس وقت بیلا اور بتول کی نگاہیں مجھ سے کچھ کہنے لگتی ہیں۔ میں ان نگاہوں کی تاب

نہیں لاسکتی۔ میں ٹھیک طرح سے ان کا سندیسہ بھی آپ تک نہیں پہنچا سکتی۔ آپ کیوں نہ خود ان نگاہوں کا پیغام پڑھ لیں۔ پنڈت جی میں چاہتی ہوں کہ آپ بتول کو اپنی بیٹی بنالیں۔ جناح صاحب میں چاہتی ہوں کہ آپ بیلا کو اپنی دختر نیک اختر سمجھیں۔ ذرا ایک دفعہ انہیں اس فارس روڈ کے چنگل سے چھڑا کے اپنے گھر میں رکھئے اور ان لاکھوں روحوں کا نوحہ سنئے۔ یہ نوحہ جو نواکھالی سے راولپنڈی تک اور بھرت پور سے بمبئی تک گونج رہا ہے۔ کیا صرف گورنمنٹ ہاؤس میں اس کی آواز سنائی نہیں دیتی' یہ آواز سنیں گے آپ؟

آپ کی مخلص

فارس روڈ کی ایک طوائف

ممتاز مفتی

سمے کا بندھن

آپی کہا کرتی تھی "سنہرے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے' اپنا اثر ہوتا ہے۔ اپنا سمے پہچان۔ سنہرے اپنے سمکے سے باہر نہ نکل۔ جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔"

اب سمجھ میں آئی آپی کی بات۔ جب سمجھ لیتی تو رستے سے نہ بھٹکتی۔ آ لنے سے نہ گرتی۔ سمجھ تو گئی پر کتنی قیمت دینی پڑی سمجھنے کی۔ آپی مجھے سنہرے کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ کہتی تھی "تیرے پنڈے کی جھال سنہری ہے۔ جب رس آئے گا تو سونا بن جائے گی۔ کٹھالی میں پڑے رہنا۔ پھر یہ جھال کپڑوں سے نکل نکل کر جھانکے گی۔"

پتا نہیں میرا نام کیا تھا۔ پتا نہیں میں کس کی تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ کون لایا تھا۔ بال پن ہی میں آپی کے ہاتھ بیچ گیا تھا۔ اسی کی گود میں پلی۔ اسی کی سر تال بھری بیٹھک کے جھو لنے میں جھول جھول کو جوان ہوئی۔ پھر سنہرا اللہ اللہ آیا چھپائے نہ چھپتا۔ آپی بولی "نہ جیے۔ چھپا نہ۔ جو چھپائے نہ چھپے اسے کیا چھپانا۔"

کبھی کھڑکی سے جھانکتی تو آپی ٹوکتی "یہ کیا کر رہی ہو بیٹی؟ سیانے کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجھے۔ تیرا کام دکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن' منظر بن اور جو دیکھے بھی تو' تو دکھنے کا گھونگھٹ نکال کر اس کی اوٹ سے دیکھ۔ پھر سے دیکھ۔ سنہرے ابھی تو شام ہے۔ یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے۔ دکھ کا سمے ہے۔ شام بھئی گمنشام نہ آئے۔" آپی گنگنانے لگی۔ "یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے۔ تیرا آنے کے سمے ہے۔ پگلی ذرا رک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے۔ پھر تیرا ہی سمے ہوگا پچھلے پہر تک۔"

ایک دن آپی کا جی اچھا نہ تھا۔ مجھے بلایا۔ گئی۔ لیٹی ہوئی تھی۔ سرہانے تپائی پر سوڈے کی بوتل دھری تھی۔ ساتھ نمک دانی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے' جب سوڈے کی بوتل کے گلے میں شیشے کا گولا پھنسا ہوتا تھا۔ ٹھا کر کے کھلتا تھا۔

بولی۔ "سنہرے بوتل کھول۔ گلاس میں ڈال چٹکی بھر نمک گھول کر مجھے پلا دے۔" میں نے نمک ڈالا تو جھاگ اٹھا۔ بلبلے ہی بلبلے۔ آپی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی "دیکھ لڑکی۔ یہ ہمارا سمے ہے۔ ہمارا سمے وہ

ہے جب جھاگ اٹھے۔ ہم میں نہیں، دوجے میں اٹھے۔ دوجے میں جھاگ اٹھانا۔ یہی ہمارا کام ہے۔ خود شانت، دوجا بلبلے ہی بلبلے۔ جب تک جھاگ اٹھتا رہے۔ ہمارا سمے۔ جب کہ دوجا شانت ہو جائے، ہمارا سمے بیت گیا اور جب سے بیت جائے تو دھیرج پاؤں ٹھمک نہ کرنا۔ ٹھمک کا سمے گیا۔ چمک نہ مارنا۔ چمک کا سمے گیا۔ پائل نہ جھنکارنا۔ پائل جھنکار بیرن بھئی۔"

پھر وہ لیٹ گئی۔ بولی "سنہرے۔ میری باتیں پھینک نہ دینا۔ دل میں رکھنا۔ یہ بھیتر کی باتیں ہیں۔ اوپر کی نہیں۔ سنی سنائی نہیں۔ پڑھی پڑھائی نہیں۔ وہ سب چھلکے ہوتی ہیں۔ بادام نہیں ہوتیں۔ جان لے بٹی بات وہ جو بھیتر کی ہو۔ گری ہو، چھلکا نہ ہو۔ جو بیتی ہو، جگ بیتی نہیں۔ آپ بیتی ہو۔ ہڈ بیتی نہیں۔ باقی سب جھوٹ۔ دکھلاوا۔ بہلاوا۔"

آج مجھے باتیں یاد آ رہی ہیں۔ بیتی باتیں۔ بسری باتیں۔ سانپ گزر گئے۔ لکیریں رہ گئیں۔ لکیریں ہی لکیریں۔ سانپ تو صرف ڈراتے ہیں۔ پھنکارتے ہیں۔ لکیریں کاٹتی ہیں۔ ڈستی ہیں۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لکیروں نے مجھے چھلنی کر رکھا ہے۔ چلتی ہیں، چلے جاتی ہیں جیسے دھار چلتی ہے۔ ایک ختم ہوتی ہے، دوجی شروع ہو جاتی ہے۔

آپی کی بیٹھک میں ہم تین تھیں۔ پیلی، روپی اور میں۔ پیلی بڑی "روپہ منجھلی اور میں چھوٹی۔ پیلی میں بڑی آن تھی پر مان نہ تھا۔ اس آن میں چھب تھی۔ سندرتا بھرا ٹھہراؤ تھا۔ یوں رعب سے بھری رہتی جیسے ٹھیار رس سے بھری رہتی ہے۔ گردن اٹھی رہتی مورتی سمان۔

روپہ سر ہی سر تھی۔ شدھ سرتاروں سے بنی تھی۔ اس کے بند بند میں تار لگے تھے۔ سرتیاں سمرتیاں اور وہ گونجتے مدھم میں گونجتے اور پھر سننے والوں کے دلوں کو جھلا دیتے۔ تیجی میں تھی۔ آپی کہتی تھی۔ "سنہرے۔ تجھ میں دکھ کی بھیگ ہے۔ تو بھگو دیتی ہے۔ خود بھی ڈوب جاتی ہے۔ دوجے کو بھی ڈبو دیتی ہے۔ پگلی دوجے کو ڈبویا کر۔ خود نہ ڈوبا کر۔ مجھے تجھ سے ڈر لگتا ہے سنہرے۔ کسی دن تو ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔"

آپی کی بیٹھک کوئی عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا، منہ اٹھایا چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے۔ وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولتیے آتے تھے پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہیں چلتی تھیں۔ اس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو بڑے اچھالیں۔ لڑکیو نہ اچھلنا۔ جو نگاہوں پر اچھل جاتی ہیں، وہ منہ کے بل گرتی ہیں اور جو گر گئی۔ وہ سمجھو نظروں سے گر گئی۔ پھر نہ اپنے جوگی

رہی نہ دوسروں جوگی۔"

آپی کی بیٹھک میں جسم نہیں چلتے تھے' آواز چلتی تھی۔ دل دھڑکتے تھے۔ وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ تماشا ہوتا نہ تماش بین۔

مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب وہاں ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تھی۔ دو مہینے میں ایک بار ضرور لگتی تھی۔ ٹھاکر کی بیٹھک لگتی تو کوئی دوجا نہیں آ سکتا تھا۔ صرف ٹھاکر کے سنگی ساتھی۔

ٹھاکر بھی تو عجیب تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ۔ طاقت سے بھرا ہوا اور جھانکو تو بچہ۔ نرم نرم' گرم گرم۔ ویسے تھا آن بھرا۔ سنگیت کا رسیا۔ یوں لگتا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو۔ دھونی رمی ہو۔ آرتی بجی ہو۔

ٹھاکر کی ہمارے ہاں بڑی قدر تھی۔ آپی عزت کرتی تھی۔ بھروسا کرتی تھی۔ ٹھاکر نے بھی کبھی نظر اچھالی نہ تھی۔ جھکائے رکھا۔ پیتا ضرور تھا پر ایسی کہ جوں جوں پیتا جاتا۔ الٹا مدھم پڑتا جاتا۔ آنکھ کی چمک گل ہو جاتی۔ آواز کی کڑک بھیگ جاتی۔ اس کا نشہ ہی انوکھا تھا۔ جیسے بوتل کا منہ ہو' بھیتر کا ہو۔ بوتل اک بہانہ ہو۔ بوتل چابی ہو بھیتر کے پٹ کھولنے کی۔

"ڈرو سکھیو ڈرو۔ بھیتر کے نشے سے ڈرو۔ بھیتر کے نشے کے سامنے بوتل کا نشہ ہاتھ جوڑے کھڑا ہے جیسے راجا کے روبرو پنچ کھڑا ہو۔ بوتل کا تو خالی سر چکراتا ہے۔ بھیتر کا من کا جھولنا جھلا دیتا ہے۔ بھیتر کا کسی جوگا نہیں چھوڑتا۔ خود جوگا بھی نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ٹھاکر کے نشے کا ریلا مجھے بھی لے ڈوبے گا۔"

ہاں تو اس روز ٹھاکر کی بیٹھک ہو رہی تھی۔ بول تھے" گانٹھری میں کون جتن کر کھولوں۔ مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی۔" گیت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا تھا کہ ٹھاکر جھوم جھوم رہا تھا۔" پھر کہو۔ پھر بولو۔" کا جاپ کئے جا رہا تھا۔ نہ جانے کس گرہ کو کھولن کی آرزو جاگی تھی۔ اپنے من یا محبوب کے من کے' سے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی سدھ بدھ نہ رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں' کہاں ہیں' کیا کر رہے ہیں۔ کسی بات کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی۔ بولی۔" شما کرو ٹھاکر جی۔ معافی مانگتی ہوں۔ ہمارا سمے بیت گیا۔ اب بیٹھک ختم کرو۔"

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا۔" نہ آپی۔" وہ بولا' ابھی تو رات بھیگی ہے۔" آپی بولی۔" ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہے۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔ جو ہمارے پر بھیگ گئے تو اڈاری نہ رہے گی۔ فن کار میں اڈاری نہ رہے تو باقی کیا رہا؟" ٹھاکر نے بڑی منتیں کیں۔ آپی نہ مانی۔

محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہو گئیں۔" آپی یہ سمے کا گورکھ دھندہ کیا ہے؟"

آپی بولی۔ ''لڑکیو سے بڑی چیز ہے۔ ہر کام کا الگ سے بنا ہے۔ رات کو گاؤ بجاؤ۔ پیو پلاؤ۔ ملو ملاؤ۔ موج اڑاؤ۔ تین بجے تک' پھر بھور سے اس کا سے ہے۔ اس کا نام جپو۔ اسے پکارو' فریاد کرو' دعائیں مانگو۔ سجدے کرو۔ اس سے میں تم عیش نہیں کر سکتے۔ گناہ نہیں کر سکتے۔ قتل نہیں کر سکتے۔ یہ دھندا جو ہمارا ہے' اس کے سے میں نہیں چل سکتا۔ اس کے سے میں پاؤں نہ دھرنا۔ اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی۔ جو اچھا مانا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو۔ اس کے سمے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا۔ ڈرتے رہنا۔ کہیں وہ تمہاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔''

پھر وہ دن آ گیا جب میں نے ان جانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا۔ اس روز ٹھاکر آئے۔ آپی سے بولے۔ ''بائی کل خواجہ کا دن ہے۔ خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہو گی۔ ادھر حویلی میں صرف اپنے ہوں گے گھر کے لوگ۔ تجھے لینے آیا ہوں۔ چل میرے ساتھ میرے گاؤں۔''

آپی سوچ میں پڑ گئی۔ ''روپا ماندی ہے وہ تو نہیں جا سکے گی کسی اور دن رکھ لینا نذر نیاز۔''

''خواجہ کا دن میں کیسے بدلوں؟'' وہ بولا

''تو کسی اور کی منڈلی کو لے جا۔''

''اونہوں'' ٹھاکر نے منہ بنا لیا۔ ''خواجہ کی بات نہ ہوتی تو لے جاتا۔ ان کا نام لینے کے لائق مکھ تو ہو۔''

''میں کس لائق ہوں جوان کا نام منہ پر لاؤ۔''

''بس اک تیری بیٹھک ہے جہاں پوتر تا ہے۔ جسم کا نہیں' من کا ٹھکانا ہے۔''

آپی مجبور ہو گئی۔ اس نے روپا کا دھیان رکھنے کے لیے پیلی کو وہاں چھوڑا اور مجھے لے کر ٹھاکر کے گاؤں چلی گئی۔

رات بھر حویلی میں خواجہ کی محفل لگی۔ وہ تو گھریلو محفل تھی۔ ٹھاکر کی بہنیں' بہویں' بیٹیاں' ٹھاکرانی سب بیٹھے تھے۔ وہ تو سمجھو بھجن منڈلی تھی۔ ''خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار'' سے شروع ہوئی تھی۔

آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈولے۔ آپی کا من ڈوب ہی گیا۔ ٹھاکر اسے محفل سے اٹھا کر اندر لے گیا۔ شربت شیرا پلانے کو۔ پھر وہیں لٹا دیا۔

پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھی بھیگ گئی۔ آنکھیں پھر بھر آئیں۔ میں حیران۔ میں تو کچھ مانگ نہیں رہی۔ میں تو التجا نہیں کر رہی۔ میں تو اک تاجر ہوں۔ پیسہ کمانے کے لیے آئی ہوں۔ میری آنکھیں بھر بھر آئی رہیں۔ دل کو کچھ کچھ ہوتا رہا۔ پر میں بھیگ بھیگ کر رہ تی گئی۔ سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ

کہ میں اس کے سے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔ آپی تھی نہیں جو مجھے ٹوکتی۔

اور پھر مجھے کیا پتہ کہ خواجہ کون ہے۔ میں نے تو صرف نام سن رکھا تھا۔ اس کے گیت یاد کر رکھے تھے۔ میں تو صرف یہ جانتی تھی کہ وہ غریب نواز ہے۔ میں تو غریب نہ تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ مجھے بھی نواز دے گا۔ خواہ مخواہ۔ زبردستی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اس میں اتنی بھی سدھ بدھ نہیں کہ کون پکار رہا ہے۔ کون گا رہا ہے۔ کون منگتا ہے۔ کون خالی جھولی پھیلا رہا ہے۔ کون بھری جھولی سمیٹ رہا ہے۔ میں تو یہی سنتی آئی تھی کہ دکھی لوگ پکار پکار کر ہار جاتے ہیں۔ پر کوئی سنتا نہیں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا دیالو ہے۔ اتنا نیڑے ہے۔ اتنے کان کھڑے رکھتا ہے۔

پھر اٹھا کر بولا۔ ''سنہرے بائی۔ بس اک آخری فرمائش۔ خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا۔ ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے۔ دھو بیا دھوئے جائے ساری عمریا۔''

پھر مجھے سدھ بدھ نہ رہی۔ ایس رنگ پچکاری چلی کہ میں بھیگ بھیگ گئی اور میں ہی نہیں، محفل رنگ رنگ ہو گئی۔ انگ انگ بھیگا۔ خواجہ نے رنگ گھاٹ بنا دیا۔

گھر پہنچی تو گویا میں میں نہ تھی۔ دل رویا رویا۔ دھیان کھویا کھویا۔ کسی بات میں چت نہ لگتا۔ بے گانہ دکھتی۔ ساز میں طرب نہ رہا۔ سارنگی روئے جاتی۔ استاد نکو خان بجاتے پر وہ روئے جاتی۔ طبلہ پیٹتا۔ گھنگھرو کہتے پاؤں میں ڈال اور بن کو نکل جا۔ وہاں اس کا جھومر ناچ جو پتے ڈال ڈال سے جھانک رہا ہے۔

روز دن میں تین چار بار ایسی رقت طاری ہوتی کہ بھیں بھیں کر کے روتی۔ پھر حال کھیلنے لگتی۔ پہلی حیران، روپہ کا منہ کھلا، آپی چپ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب آٹھ دن یہی حالت رہی بلکہ اور بگڑ گئی تو آپی بولی۔ ''بس پتر۔ تیرا اس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانہ پانی ختم ہو گیا۔ تو نے اس کے سے میں پاؤں دھر دیا۔ اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اس دھندے جوگی نہیں رہی۔''

''پر کہاں جاؤں آپی؟ اس بیٹھک سے باہر پاؤں دھرنے کی کوئی جگہ بھی ہو میرے لیے۔''

''جس نے بلایا ہے اس کے دربار میں جا۔'' روپہ بولی۔

''اس بھیٹر میں جائے۔ آپی بولی'' یہ لڑکی جائے جس کا سنہری پنڈا کپڑوں سے باہر جھانکتا ہے۔ نہیں۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔ اسی کوٹھڑی میں رہے گی۔ بیٹھک میں پاؤں نہیں دھرے گی۔''

پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ رقت ختم ہو گئی۔ دل میں ایک جنون اٹھا کہ کسی کی ہو جاؤں۔ کسی ایک کی تن من دھن سے اسی کی ہو جاؤں۔ ہو رہوں۔ وہ آئے تو اس کے جوتے اتاروں۔ پنکھا کروں۔ پاؤں دابوں۔ سر میں تیل مالش کروں۔ اس کے لیے پکاؤں۔ میز لگاؤں۔ برتن رکھوں۔ اس کی بنیائیں دھوؤں۔ کپڑے

استری کروں۔ آرسی کا کول بناؤں۔ پھر سرہانے کھڑی رہوں کہ کب جاگے۔ کب پانی مانگے۔

ایک دن آپی بولی ''اب کیا حال ہے دھیئے؟'' میں نے رورو کے ساری بات کہہ دی کہ کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔

بولی۔'' وہ کون ہے؟ کوئی نظر میں ہے کیا؟''

''اونہوں۔ کوئی نظر میں نہیں۔''

''ناک نقشہ دکھتا ہے کبھی؟''

''نہیں آپی''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ بولی۔ ''جو کھونٹی پر لٹکانا مقصود ہے تو آپ کھونٹی بھیجے گا۔؟''

دس ایک دن کے بعد جب بیٹھک راگ رنگ سے بھری ہوئی تھی تو میری کوٹھڑی کا دروازہ بجا۔ آپی داخل ہوئی۔ بولی۔ ''خواجہ نے کھونٹی بھیج دی۔ اب بول کیا کہتی ہے؟''

''کون ہے؟''

''کوئی زمیندار ہے۔ ادھیڑ عمر کا ہے۔ کہتا ہے بس ایک بار بیٹھک میں آیا تھا۔ سنہری بائی کو سنا تھا۔ جب سے اب تک اس کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ دل کو بہت سمجھایا۔ توجہ ہٹانے کے بہت جتن کئے۔ کوئی پیش نہیں گئی۔ اب ہار کے تیرے در پر آیا ہوں۔ بول کیا کہتی ہے۔ منہ مانگا دوں گا۔ چاہے ایک مہینے کے لیے دے دے۔ ایک سال کے لیے یا ہمیشہ کے لیے بخش دے۔ جیسے تیری مرضی۔'' آپی ہنسنے لگی۔ بولی۔ ''چل بیٹھک میں اسے دیکھ لے ایک نظر۔''

''اونہوں۔'' میں نے سر ہلا دیا۔ ''نہیں آپی انہوں نے بھیجا ہے تو ٹھیک ہے۔ دیکھنے کا مطلب؟''

''کتنی دیر کے لیے مانوں؟''

''جیون بھر کے لیے۔''

''سوچ لے۔ جو اوباش نکلا تو؟''

''پڑا نکلے۔ کیسا بھی ہے' جیسا بھی نکلے۔''

اگلے دن بیٹھک میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ زمیندار نے پیسے کا ڈھیر لگا دیا۔ آپی نے رد کر دیا۔ بولی۔ ''سودا نہیں کر رہی۔ دھی وداع کر رہی ہوں اور یاد رکھ یہ خواجہ کی امانت ہے۔ سنبھال کر رکھیو۔''

حویلی یوں اجڑی اجڑی تھی جیسے دیو پھر گیا ہو۔

ویسے تو سبھی کچھ تھا۔ سازوسامان تھا۔ آرائش تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے۔ صوفے لگے ہوئے تھے۔ قد آدم آئینے، جھاڑ فانوس۔ سبھی کچھ پھر بھی حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔

برآمدے میں آرام کرسی پر چھوٹی چودھرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ سامنے تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے مگر اسے خبر ہی نہ تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اسے تو خود کی سدھ بدھ نہ تھی کہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ کیوں ہے۔

اوپر سے شام آ رہی تھی۔ بے کوسے سے ٹکراتی۔ اداسیوں کے جھنڈے گاڑتی۔ یادوں کے دیئے جلاتی۔ بیتی باتوں کے الاپ گنگناتی۔ دبے پاؤں۔ مدھم یوں جیسے پائل کی جھنکار بیر نیا ہو۔

دور اس کوارٹر کے باہر کھاٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار کی نظریں چھوٹی چودھرانی پر جمی ہوئی تھیں۔ حقے کا سوٹا لگاتا اور پھر سے چھوٹی چودھرانی کو دیکھنے لگتا یوں جیسے اسے دیکھ دیکھ کر دکھی ہوا جا رہا ہو۔

دوسری جانب گھاس کے پلاٹ کے کونے پر بوڑھا مالی پودوں کی تراش خراش میں لگا ہوا تھا۔ ہر دو گھڑی کے بعد سر اٹھاتا اور چھوٹی چودھرانی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتا پھر چونک کر لمبی ٹھنڈی سانس بھرتا اور پھر سے کانٹ چھانٹ میں لگ جاتا۔

جنت بی بی' چودھرانی کا کھانا پکاتی تھی۔ دو تین بار برآمدے کے پرے کنارے پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ گئی تھی۔ جب دیکھتی تو اس کی آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی تھیں۔ پلو سے پونچھتی پھر لوٹ جاتی۔

سارے نوکر کمیں چھوٹی چودھرانی پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کے غم میں گھلے جا رہے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس پر سخت ناراض بھی تھے۔ اس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی کیوں ماری تھی؟ کیوں خود کو دوجوں کا محتاج بنالیا تھا؟ اپنی اولاد ہوتی تو پھر بھی سہارا ہوتا۔ اپنی اولاد تو تھی نہیں۔

جب چودھری مرنے سے پہلے بقائمی ہوش و حواس اپنی آدھی غیر منقولہ جائیداد چھوٹی چودھرانی کے نام گفٹ کر گیا تھا تو اسے کیا حق تھا کہ اپنا تمام حصہ بڑی چودھرانی کے دونوں بیٹوں میں تقسیم کر دے۔ اگر ایک دن بڑی چودھرانی نے اسے حویلی سے نکال باہر کیا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کا در دیکھے گی۔

ایک طرف اتنی بے نیازی کہ اتنی جائیداد اپنے ہاتھ سے بانٹ دی۔ اور دوسری طرف یوں سوچوں میں گم تصویر بن کر بیٹھی رہتی ہے۔ سارے ہی نوکر حیران تھے کہ چھوٹی چودھرانی کس سوچ میں کھوئی رہتی ہے۔ چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ جب سے یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی ہے اور پھر ٹوٹتی رات سے اس کے کمرے سے گنگنانے کی آواز کیوں آتی ہے؟ کس خواجہ پیا کو بلاتی ہے؟ خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔ کون خبر لے؟ کیسی خبر لے؟ چھوٹی چودھرانی پر انہیں پیار ضرور آتا تھا پر اس کی باتیں سمجھ میں

نہیں آتی تھیں۔ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس سوچ میں پڑی رہتی ہے۔

چھوٹی چودھرانی کو صرف ایک سوچ لگی تھی۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی۔ بول تیرا جیون کس کام آیا؟ وہ سوچ سوچ ہار جاتی۔ پر اس سوال کا جواب ذہن میں نہ آتا۔ الجھے الجھے خیال الجھاتے۔ مجھے چمن سے اکھیڑا۔ بیل بنا کر اک درخت کے گرد گھما دیا اور اس درخت کو اکھیڑ پھینکا۔ بیل مٹی میں مل گئی۔ اب یہ کس کے گرد گھومے؟ بول میرا جیون کس کام آیا؟

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے روبرو کھڑا ہے۔ سر اٹھایا سامنے گاؤں کا پٹواری کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' وہ بولی۔

'میں ہوں پٹواری۔ چودھرانی جی۔''

''تو جا۔۔۔ جا کر بڑی چودھرانی سے مل۔ مجھ سے تیرا کیا کام؟''

''آپ ہی سے کام ہے۔'' وہ بولا۔

''تو بول' کیا کہتا ہے؟''

''گاؤں میں دو درویش آئے ہیں۔ گاؤں والے چاہتے ہیں انہیں چند دن یہاں روکا جائے۔ جو آپ اجازت دیں تو آپ کے مہمان خانے پر ٹھہرا دیں۔''

''ٹھہرادو'' وہ بولی۔

''نوکر چاکر بندوبست۔۔۔۔۔'' وہ رک گیا۔

''سب ہو جائے گا۔''

پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتا نہیں کیوں اس نے سرسری طور پر پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہیں؟''

پٹواری بولا۔ ''اجمیر شریف سے آئے ہیں۔ خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔'' اک دھماکا ہوا۔ چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں اچھلیں۔

اگلی شام چھوٹی چودھرانی نے جنت بی بی سے پوچھا۔ ''جنت۔ یہ جو درویش ٹھہرے ہوئے ہیں یہاں ان کے پاس گاؤں والے آتے ہیں کیا؟''

جنت بولی۔ ''لو چھوٹی چودھرانی۔ وہاں تو سارا دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ جو منہ سے کہتے ہیں' ہو جاتا ہے۔''

''تو تیار ہو جنت۔ ہم بھی جائیں گے۔ تو اور میں۔''

''چودھرانی جی وہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔''

''تو چل تو سہی۔'' چودھرانی نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''اور دیکھ وہاں مجھے چودھرانی کہہ کر نہ بلانا۔خبردار۔۔۔۔۔!''

جب وہ مہمان خانے پہنچیں تو دروازہ بند تھا۔ جنت نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی۔ جنت نے پھر دستک دی۔ سفید ریش بوڑھے خادم نے دروازہ کھولا۔ جنت زبردستی اندر داخل ہو گئی۔ پیچھے پیچھے چودھرانی تھی۔ سفید ریش گھبرا گیا۔ بولا ''سائیں بادشاہ مغرب کے بعد کسی سے نہیں ملتے۔ وہ اس کمرے میں مشغول ہیں۔''

''ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔'' چھوٹی چودھرانی بولی۔

''تو پھر؟'' سفید ریش گھبرا گیا۔

''ایک سوال پوچھنا ہے۔'' چودھرانی نے کہا۔

''سائیں بابا اس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔''

''سائیں بابا نے جواب نہیں دینا' انہوں نے پوچھنا ہے'' وہ بولی۔

''کس سے پوچھنا ہے؟'' خادم بولا۔

''اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالکے ہیں۔'' یہ سن کر سفید ریش خادم کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

''ان سے پوچھو'' چھوٹی چودھرانی نے کہا۔ ''ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اے غریب نواز بتا کہ میرا جیون کس کام آیا؟''

کمرے پر منوں بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔

چھوٹی چودھرانی بولی۔ ''کہو وہ عورت پوچھتی ہے۔ تو نے بیٹھک کے گملے سے اک بوٹا اکھیڑا۔ اسے بیل بنا کر درخت کے گرد لپیٹ دیا کہ جا اس پر نثار ہوتی رہ۔'' وہ رک گئی۔ کمرے کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔ ''اب تو نے اس درخت کو اکھیڑ پھینکا ہے۔ بیل مٹی میں رل گئی۔ وہ بیل پوچھتی ہے۔ بول میرا جیون کس کام آیا؟'' یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔

''تیرا جیون کس کام آیا۔ تیرا جیون کس کام آیا۔'' سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ''تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟'' وہ رک گیا۔ کمرے کی خاموشی اتنی بوجھل ہوگئی کہ سہاری نہیں جاتی تھی۔

''میری طرف دیکھ۔'' سفید ریش خادم نے کہا' ''سنہری بائی۔ میری طرف دیکھ کہ تیرا جیون کس کام آیا۔ مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ میں کیا تھا' کیا ہو گیا۔''

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے چیخ نکلی۔ ''استاد جی آپ۔۔۔۔۔؟'' وہ استاد کے چرن چھونے کے لیے آگے بڑھی۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھرکم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

''سنہری بی بی۔'' وہ بولا۔ ''مجھ سے پوچھ۔ تیرا جیون کس کام آیا۔''

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا۔ ''ٹھاکر۔۔۔۔۔۔۔'' وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا۔ ''اب ہمیں پتہ چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔'' اس نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ بولا۔ ''بی بی۔ ہمیں آشیرباد دے۔''

نیلم احمد بشیر

شریف

''ایکسکیوزمی! آپ کہیں کمیڈ تو نہیں؟''

سمکی نے اپنی لانبی، حسین گردن کو ہولے سے خم دے کر سوال کرنے والے کی طرف دیکھا۔

بہت شاندار مرد تھا۔ گرے سوٹ، سرخ سلک شرٹ، گلے میں نفیس پولکا ڈاٹ سکارف، اس پر خوب جچ رہا تھا۔

شاید نیا آیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے سمکی نے اسے کسی پارٹی میں نہیں دیکھا تھا۔ لانبیا قد، متوازن، صحتمند جسم، عمر کوئی پنتالیس کے قریب رہی ہوگی لیکن کم عمر دکھتا تھا۔ سمکی بھی کچھ کم پرکشش نہ تھی۔

یوں تو پارٹی میں ایک سے ایک خوبصورت عورت موجود تھی، لیکن سمکی کی چھب تو سب سے نرالی تھی۔ وہ مشرق اور مغرب کا ایک حسین امتزاج تھی۔

جدید طرز کے باب کٹ میں ترشے ہوئے بال، لوری آل کی امپورٹڈ ہیر ڈائی میں بہت پرکشش دکھائی دے رہے تھے۔

اس کا لباس بھی مکمل طور پر ماڈرن سٹائل کا تھا۔ بہت سی کلیوں والا کرتہ یوں تو بہت کھلا تھا لیکن کمر کے پاس جا کر خود بخود تنگ ہو جاتا تھا۔ خوبصورت سیاہ، چست پاجامے میں اس کی ٹانگیں جہاں اپنا سڈول پن بھرپور انداز میں نمایاں کر رہی تھیں، وہیں اس کے سندھی کھسے اور سواتی چاندی کے زیورات سے اپنی ایک علیحدہ انفرادیت عطا کر رہے تھے۔ وہ اپنے شوہر نعیم حسن کے ساتھ اپنی دوست شیریں کے گھر نیو ائیر کی پارٹی اٹینڈ کرنے آئی ہوئی تھی۔ وہاں آئے سب لوگ ایک دوسرے کے جاننے والے، دوست یار، ملنے جلنے والے تھے۔

آپس میں بے تکلفیاں، دوستیاں، یارانے تھے۔ اچھا وقت گزارنا ان کا مشغلہ اور مقصد حیات تھا۔ ہیونگ اے گڈ ٹائم ان کی زندگی کا ماٹو تھا۔

نیا سال صرف ایک گھنٹہ دور تھا۔ مہمان موسیقی سے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ' ملنے ملانے' پینے پلانے میں مصروف و مشغول تھے۔

سمکی نے ایک کونے میں کھڑے اپنے شوہر نعیم پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ کسی دوست خاتون سے ڈانس کی درخواست کر رہا تھا۔

''ہیلو!'' نووارد نے کھنکار کر سمکی کی توجہ چاہی۔

''کمٹ مینٹس توڑی بھی جا سکتی ہیں!'' سمکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''ارے ارے! میں بھلا آپ کو کمٹ مینٹس توڑنے کی پریشانی میں ڈالنے کی جسارت کیوں کرنے لگا! کبھی کبھار کمٹ مینٹس بدل لینے سے بھی تو کام چلایا جا سکتا ہے نا!''

اس نے مشروب کو لبوں سے لگا کر اور سمکی کے سراپا کو آنکھوں سے پی کر شوخی سے جواب دیا اور سمکی کی طرف تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ سمکی ہنس پڑی۔ اس کا نقرئی قہقہہ ماحول کو ایک مضراب کی طرح چھو کر جلترنگ بنا گیا۔

''مجھے وحید قریشی کہتے ہیں!'' مرد نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔۔۔۔۔۔ ''میں سمکی ہوں؟''

''صرف سمکی؟''

''صرف سمکی!'' اس نے اپنی کڑھائی والی چادر بڑے سٹائل سے کھسکائی۔ اس کا چاندی کا زیور جھنجھنا اٹھا اور وحید قریشی اس کی خوبصورت کالر بون کو تعریفی نظروں سے دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ جس کی وجہ سے اس کی گردن بہت پروقار لگ رہی تھی۔

''لگتا ہے آپ دونوں مل چکے ہیں۔ ویری گڈ' آپ نے اچھا کیا۔ جو یہ کام خود ہی کر لیا۔ اب مجھے آپ دونوں کو متعارف کروانے کے تکلفات پورے نہیں کرنے پڑیں گے۔ ویسے یہ ضرور بتا دوں وحید جی! کہ سمکی میری بڑی خاص دوست ہے اور آپ تو خاص چیزوں اور خاص بندوں میں ہی دلچسپی رکھتے ہیں نا!''

زریں نے خوشدلی سے کہا۔

''بھئی سمکی' یہ وحید صاحب احسن کے پرانے دوست ہیں۔ بہت عرصے سے ان سے رابطہ نہ تھا۔ اب انہوں نے ہمیں خود ہی ڈھونڈ نکالا ہے۔ معمولی آدمی نہیں' بہت بڑے آرکی آلوجسٹ ہیں ہمارے!''

''او رواقعی! آرکیالوجی سے تو مجھے بھی بہت دلچسپی ہے! ہاؤ نائس!'' سمکی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

چند ہی لمحوں میں وہ بے تکلف ہو گئے۔ وحید اسے لاہور کے تاریخی مقامات' عجائب گھر' نوادرات کے بارے میں معلومات دینے لگا۔ سمکی اس کی قابلیت اور ذہانت سے تو متاثر ہو ہی رہی تھی مگر خود کو وحید کی اس کی

ذات میں دلچسپی لینے سے خوش ہونے سے بھی بہت مسرور و مطمئن پا رہی تھی۔

''گریٹ پارٹی یار!'' کرنل حفیظ کسی بات پر اونچے اونچے قہقہے لگا تا جا رہا تھا۔ ابھی تو پینے کا ایک گھنٹہ اور باقی تھا۔ اسے تو ہلکا سا نشہ بھی ہو جاتا تو معمولی معمولی باتوں پہ اتنی زور زور سے ہنستا کہ اس پر شکسپئیر کے فول ہونے کا گمان ہونے لگتا۔

''اور آپ کیا کرتی ہیں؟ میرا مطلب ہے' خوبصورت لگنے کے علاوہ؟''

وحید قریشی کی سمکی کی ذات میں دلچسپی بڑھنے لگی۔

سمکی ہنس دی۔ وہی نقرئی قہقہہ' وہی جلترنگ کا سا سماں۔

''میں بہت مصروف رہتی ہوں۔ کئی سوشل ویلفیر اداروں سے میرا تعلق ہے اور پھر میں اپنی بوتیک ''می اینڈ یو'' کے نام سے بھی چلا رہی ہوں۔ گھر' شوہر' بچے' یونو زندگی بہت مصروف گزرتی ہے۔''

''یہ تو ہے۔ اسی لیے آج کل کی زندگی میں تو جو لمحہ خوشی کا میسر آ جائے اسی کو غنیمت جانیے۔ میں بھی دن بھر آرکی آلوجی اور ریسرچ ورک میں کبھی کبھار تو خود کو بھی کوئی آثار قدیمہ لگنے لگتا ہوں۔ لیکن شام کو جم خانہ میں سوئمنگ یا ٹینس کھیلی اور میرا سسٹم ریلیکس ہو گیا۔''

''اور رات کو!''

''رات ہمیں تنہائیوں کا احساس دلانے کو ہر چوبیس گھنٹے بعد ہی چلی آتی ہے۔ کیا کریں؟ چاند اور میں ہمیشہ سے اکیلے ہیں!''

''آپ کی مسز؟'' سمکی نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اور میں علیحدہ علیحدہ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ان کو رات کو پونے نو بجے ہی نیند آ جاتی ہے' وہ ڈاکٹر ہیں ہسپتال میں کام کر کر کے تھک جاتی ہیں۔ ویسے بھی۔۔۔۔۔۔۔۔!'' وہ خلاؤں میں گھورنے لگا۔

''آئی انڈرسٹینڈ! دراصل ذہنی ہم آہنگی ہونا بہت ضروری ہے!''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے!'' وہ جلدی سے بولا۔

''اور وہ تو قسمت سے ہی ملتی ہے! لیکن زندگی ضائع کرنے کی چیز تو نہیں نا' میں تو خود ایسا ہی سوچتی ہوں ورنہ میں تو ڈپریشن کی اس سٹیج پر پہنچ جاؤں کہ ویلیئم کی ملی گرامز ہر رات ہی بڑھانی پڑ جائیں!''

یکا یک میوزک تیز ہو گیا۔ ''I Wanna live Forever..

نغمہ بھی ہیجان خیز تھا۔ ڈیک کا والیوم ناچتے ہوئے جوڑوں کو دیوانہ بنائے دے رہا تھا۔

لائٹنگ والوں نے سٹروب لائٹس کا بڑی خوبصورتی سے استعمال شروع کر دیا تھا۔ سٹروب لائٹس

کلا نیلا نیلا رنگ جب ٹکڑوں میں ناچتے ہوئے جوڑوں پر پڑتا تو یوں محسوس ہوتا گویا جسموں کے نیلے نیلے ٹکڑے فضا میں پتھرا کر رہ گئے ہوں' چند لمحوں کے لیے منجمد ہو کر سانس لینا بھول چکے ہوں۔ نیلا رنگ نیزہ بن کران کے متحرک جسموں کو بار بار چھلنی کیے دے رہا تھا اور نیلے رنگ کے خون میں تڑپتے جسم اذیت کی لذت میں ڈوبے ''اور'' ''اور'' چیخ رہے تھے۔

یہ ہجوم زندہ اور زندہ دل لوگوں کا تھا۔ غم' فکر اگر ان کی زندگی میں تھے بھی تو دور کسی طاق میں' کسی مناسب وقت کے لیے انہوں نے سنبھال رکھے تھے۔ خوشیاں البتہ انہیں عزیز تھیں' اتنی کہ وہ ان کے حصول کے لیے چاہے وہ چند لمحوں کی ہی کیوں نہ ہوں' کچھ بھی کرنے کو تیار تھے۔

زریں کی دوست پونی بھی نیو ائیر پارٹی میں اپنے نئے ساتھی کے ساتھ موجود تھی۔ پونی امریکہ میں پندرہ سال گزارنے کے بعد پاکستان دوبارہ آ کر سیٹل ہوئی تھی۔ اس کا میاں پاکستان کو رہنے کے قابل نہیں سمجھتا تھا اور مصر تھا کہ پونی واپس چلی چلے لیکن پونی امریکہ کی مشینی زندگی اور مادی لذتوں سے بور ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اس کا خیال تھا کہ بچوں کو امریکہ کے آزادانہ معاشرے سے بچانے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے وہ امریکہ کو چھوڑ آئی تھی۔ اس کا میاں سال میں ایک دو چکر لگا لیتا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ امریکہ ہو آتی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ شادی کو گھسیٹا جا رہا تھا حالانکہ اس کے بے جان جسم میں اب جا بجا تکلیف دہ پھوڑے اور پھنسیاں نکلنا شروع ہو چکی تھیں۔

فاصلے صرف جغرافیائی نہیں رہے تھے۔

مزاجوں کے تضاد کا بہت بڑا سا بحر اوقیانوس' طرز زندگی کے فرق کا ٹھنڈا ٹھار آئس لینڈ' دلچسپیوں اور ضروریات کی تبدیلیوں کا' رنگ برنگے ٹکڑوں پہ مشتمل یورپ' راستے میں حائل ہو چکا تھا۔ مگر پونی مشکلات کا مقابلہ کرنا جانتی تھی۔ اس لیے ڈٹی ہوئی تھی۔ ''ہائے بلی! ادھر آؤ میں تمہیں وحید قریشی دی گریٹ آرکی آلو جسٹ سے ملاؤں۔''

سمکی نے بلی کا بازو کھینچا۔ بلی بھی اس کی بے تکلف دوست تھی۔ میوزک کافی تیز تھا۔ اس لیے بلی نے اشارہ کیا اور تینوں کمرے سے ملحقہ ٹیریس پہ چلے آئے۔ بلی بھی بڑی دیر سے اس ہینڈسم سے آدمی کے بارے میں دل ہی دل میں متجسس ہو رہی تھی۔ اب سمکی نے اس کا تعارف کروایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

''خلیل آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ آج کل وہ سیاچن پر ایکسر سائز کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ بے چارے سردی میں تنہا وہاں ہیں اور میں یہاں۔ آج تو نیو ائیر کے شروع ہونے پر میں انہیں بہت مس کر رہی ہوں! کاش وہ یہاں ہوتے!''۔۔۔۔۔ وہ سچ مچ اداس ہو گئی۔

بلی کا خاوند خلیل چٹھہ فوج میں کرنل تھا۔ بلی اور خلیل کا جوڑا' ان بہت خوش نصیب اور نادر جوڑوں میں سے ایک تھا جن کی شادی شدہ زندگی ابھی تک خوشگوار کہلائی جا سکتی تھی' کیونکہ شادی کے کچھ ہی سال بعد اکثر میاں بیوی ایک دوسرے سے بے گانہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سمجھوتوں کی رسی سے بنے ہچکولے کھاتے' خطرناک پل پر احتیاط سے قدم جمائے' ایک پل سے دوسرے پل کا سفر کرتے دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ خیریت ہو' خیریت رہے۔

''انہیں بھلا سیاچن جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کالا گلاب تو ان کے پاس تھا!''

ڈاکٹر وحید نے بلی کی سانولی سلونی رنگت کی تعریف کر کے اس کا تو من ہی لوٹ لیا۔

''ہائے اللہ! واٹ اے جنٹلمین یو آر! ہاؤ سیٹ! آئی لائک یو! سناسمکی تم نے!''

بلی کے چہرے پر بتیاں روشن ہو گئیں' اداسی کا غبار یکا یک چھٹ گیا۔

''چلیں اچھا ہے! آپ کچھ چیر اپ تو ہوئیں ورنہ کرنل صاحب کی فرقت کا غم دور کرنے کے لیے تو ہم سمجھنے لگے تھے کہ ہمیں سیاچن جا کر انہیں خود ہی آپ کے لیے لانا ہو گا۔!'' وحید شوخ ہوتا جا رہا تھا۔

بلی سانولی سلونی مگر تیکھے نقوش والی لڑکی تھی۔ اوپر سے سخت اور کھردری مگر اندر سے تازہ بھنی ہوئی مونگ پھلی کی طرح نرم اور خستہ تھی۔ کرنل صاحب جونہی ایکسر سائز پر شہر سے باہر جاتے' وہ اداس ہو کر اپنی سہیلیوں کو ملنے چلی آتی۔ اس کی سہیلیوں کا حلقہ اسے روز روز پارٹیوں' گیٹ ٹو گیدرز میں مصروف رکھتا اور وہ اپنا دل بہلانے میں کامیاب ہو جاتی۔ وہ اپنی سہیلوں میں گروپ لیڈر کی سی حیثیت رکھتی تھی۔

بلی زیادہ تر ٹیلی فون فرینڈ شپ میں یقین رکھتی تھی۔ اس نے اپنی سہیلیوں کے لیے کچھ ان لکھے قانون بھی بنا رکھے تھے جن پر وہ ان سب کو سختی سے عمل کرواتی تھی۔ اس کا سب سے ضروری قانون یہ تھا کہ کوئی سہیلی کسی بھی مرد دوست سے سنجیدگی سے انوالو نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی جذباتی وابستگی کا شکار ہونے لگتی یا دوسری طرف سے اسے ایسا خدشہ محسوس ہونے لگتا کہ دوست حضرت زیادہ ہی ملکیت کا حق جتانے لگے ہیں تو بلی فوراً ہی ایک کانفرنس بلاتی۔ مجرم کو سمجھایا بجھایا جاتا۔ رولز آف دی گیم بتائے جاتے حتیٰ کہ گروپ میں سے نکال دیئے جانے کا بھی ڈراوا دیا جاتا۔

وہ کہتی تھی' ہم سب لوگ خوشیوں کی تلاش میں رہتے ہیں اس لیے سرسری سی' بے ضرر' میل ملاپ کی دوستیاں تو کر سکتے ہیں' سنجیدہ افیئرز چلانے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اگر ہم لوگ ایسا نہ کریں تو بہت بھاری نقصان ہوتا ہے۔ گھر بار' بچے' ساری زندگی اپ سیٹ ہو جاتی ہے اور ایسا ہونے دینا تو کوئی عقلمندی نہیں۔ مناسب یہی ہے کہ صرف لمحے کی مسرت کے تعاقب اور حصول میں ہی جیو۔ اس کے بعد اپنے اپنے محفوظ

ٹھکانوں‘ عزت دار گھرانوں کو لوٹ جاؤ۔

یوں تو سب سہیلیاں اس کی اس بات سے متفق ہو جایا کرتی تھیں لیکن ڈولی ہر بار ایک مسئلہ کھڑا کر دیتی تھی۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس میں جذباتی ناپختگی ابھی تک موجود تھی۔ کسی مرد دوست نے دو تین ٹیلی فون اور اس کے حسن و جمال‘ کپڑوں کے سٹائل کی تعریف کی نہیں کہ ڈولی صاحبہ چاند کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنا شروع ہو گئیں۔ ببلی اور فرینڈز نے اس کا نام ’ٹین ایجر‘ رکھ چھوڑا تھا۔

جیسے ہی ڈولی کو کسی نئی محبت کا عارضہ لاحق ہوتا۔ جھٹ سے کانفرس کے ارکان اپنی اپنی کرسیاں سنبھال لیتے۔ ببلی اپنے عہدے کا پورا پورا فائدہ اٹھاتی۔

’’ڈولی ڈارلنگ! ہم یہ نہیں چاہتے کہ تم زندگی کو انجوائے نہ کرو۔ بھئی ہم ظالم نہیں ہیں لیکن تمہارے دشمن بھی نہیں ہیں۔ تمہیں سمجھانا ہمارا فرض بنتا ہے۔ دیکھو فون پہ گپ شپ کرو۔ لانگ ڈرائیوز پر جاؤ۔ تحفے قبول کرو۔ پرفیومز اور بوتیک شاپس کے کپڑے لے کر دیتا ہے تو لو۔ ہم کب منع کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے بندہ وانٹڈ محسوس کرے تو اس کی انا کی تسکین ہوتی رہتی ہے مگر اس سے آگے جانا غلط ہے۔ پھر ممنوعہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر پارٹی میں سے ایک ساتھی بھی اکیلا اپنے خود متعین کردہ راستے پر چل نکلا تو وہ یقینی طور پر گھنے جنگل میں بھٹک کر رہ جائے گا اور کان کھول کر سن لو۔ پھر کوئی سرچ پارٹی اس کی تلاش میں اس کے پیچھے نہیں جائے گی۔ ہاں اور ویسے بھی ہم انسان نہیں کوئی سارس تو نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان تو اشرف المخلوقات ہے اسے زندہ رہنے کے لیے ہر حال میں سروائیو کرنا ہوتا ہے۔ صرف سارس ہی ایسا جاندار ہے جو اپنی پوری زندگی میں صرف ایک بار اپنا جوڑ کسی دوسرے سارس سے بناتا ہے۔ اگر اس کا ساتھی مر جائے تو زندگی بھر اکیلا رہتا ہے مگر دوسرا ساتھی نہیں بناتا مگر ہم سارس نہیں ہیں‘ ہمیں انسانوں کی‘ ساتھ کی ضرورت رہتی ہے۔‘‘

ڈولی یہ سب باتیں عقل سے تسلیم کرتی تھی مگر اپنی طبعی نرم دلی کے ہاتھوں ہر بار مجبور ہو جایا کرتی تھی۔

بارہ بجنے میں چند لمحے باقی رہ گئے تھے۔ کاؤنٹ ڈاؤن شروع ہو گیا۔ ایک دو تین۔۔۔۔ بارہ بجتے ہی ہر طرف شور بپا ہو گیا۔ ہیپی نیو ائیر! ہیپی نیو ائیر! جام ٹکرانے لگے۔ رنگ برنگ غبارے کمرے میں ادھر ادھر تیرنے لگے۔ خاوند بیویاں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ کچھ خاوند اور کچھ بیویاں ذہنی طور پر کسی اور سے بغلگیر ہو رہے تھے۔ کچھ یونہی نظروں سے سلام‘ پیام‘ نئے سال کی مبارکباد اور تنہائی میں گلے ملنے کے وعدے لے کر کام چلا رہے تھے۔ سب لوگ بہت خوش تھے۔

کھانے کا انتظام ہو چکا تھا‘ اس لیے رقص و موسیقی فی الحال روک دی گئی تھی۔

’’کھانا لگ گیا ہے! پلیز اپنی مدد آپ کیجیے۔ کوئی تکلف نہ کیجیے۔‘‘

زریں کے شوہر نے اعلان کیا۔اس نیو ائیر پارٹی میں کھانے کو بہت کچھ تھا۔ تکّے' کباب' روسٹ' چرغے' سلاد' پھل اور منہ کا مزا بدلنے کے لیے طرح طرح کی مٹھائیاں بھی۔

زریں اور اس کا شوہر مہمانوں کو کھانے کا بار بار پوچھنے کے ساتھ ساتھ انکا ایک دوسرے سے تعارف بھی کرواتے جا رہے تھے۔

شہر کے سب سے مہنگے اور اونچی کلاس کے ہوٹل کے مالک سعید گردیزی اور اس کی بیوی شالیزا' ملتان روڈ پر واقع ٹی شرٹ ایکسپورٹ فیکٹری کا مالک ناصر خان اور اس کی بیوی حمیرا بھی وہاں موجود تھے۔

حمیرا اپنے ساتھ اپنا نیا نیا لندن ریٹرن بھائی ٹونی بھی لے آئی تھی۔ٹونی بہت کھلنڈرا اور من چلا تھا۔بیس سال یورپ میں گزار لینے کے بعد اب اس کا دل گوری چمڑی سے اکتا گیا تھا۔حمیرا اور اس کی سہیلیاں اکثر اسے اس کی یورپین بیوی کے پھیکے پھا کے حسن کی وجہ سے چھیڑا کرتی تھیں اور وہ علی الاعلان اپنی اس بیوقوفی کا اعتراف کرلیا کرتا تھا۔اب اسے اپنے دیس کے سانولے سلونے مشرقی حسن کی قدر آئی تھی اور اب تو ہر نمکین گندمی رنگ اور کالی زلفوں والی لڑکی اسے دیوانہ بنا دیتی تھی اور لڑکی دیکھتے ہی کتے کی طرح دم ہلاتا' رال ٹپکاتا' اس کے گرد بھنورے کی طرح منڈلانے لگتا۔

ڈولی' بیلی' سمکی' حمیرا' زریں سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو جاتا اور اس کا خوب بھری محفل میں مذاق اڑایا جاتا۔بہت لطف رہتا۔

پارٹی چل رہی تھی۔رات لحہ لحہ رنگ بدل رہی تھی۔کچھ ساتھی بدلے کچھ پرانے قائم رہے۔نئے ٹیلیفون نمبرز کا تبادلہ ہوا' کچھ نے صرف معنی خیز نظروں کے تبادلے پر ہی اکتفا کی۔کچھ محتاط رہے اور کچھ کی احتیاطوں کے خون میں مشروب کی آمیزش نے فلتے اڑا کر رکھ دیئے۔

صبح چار بجے کے قریب پارٹی ختم ہوئی۔سب لوگ ایک دوسرے کو نئے سال کی بار بار مبارک باد دیتے رخصت ہونے لگے۔

''بھابی! واپسی پر آپ ڈرائیو کر رہی ہیں نا!'' ٹونی نے ایک مہمان کو ڈولتے' ڈگمگاتے قدموں سے چلتے دیکھ کر کہا۔

''جب پتہ ہے زیادہ ڈرنک ہینڈل نہیں کر سکتے' تو پھر اپنی حد کیوں پار کر جاتے ہیں۔؟''

بھابی مصنوعی غصے سے بولیں۔

''ڈونٹ مائنڈ اٹ بھابی! آخر نیو ائیر ہے۔سیلی بریٹ تو کرنا تھا نا! ویسے آپ بھی ذرا احتیاط سے ہی گاڑی چلایئے گا' آپ بھی مجھے!''

اس نے مسکرا کر بات بیچ میں چھوڑ دی۔

''جی نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے حواس میں ہوں۔ میں نے تو بس لائٹ سا ہی لیا تھا۔ ڈونٹ وری! ویسے مشورے کا شکریہ' آپ اپنی بیگم کی خبر لیں۔ ہماری فکر چھوڑیں۔''۔۔۔ وہ بھی مسکرا دی۔

سمکی اور اس کا شوہر جب ملگجے اندھیرے میں گھر پہنچے تو ان کے بچے سو رہے تھے۔ وہ دونوں دبے قدموں ان کے کمرے میں گئے۔ ان کی معصوم جبینوں پہ پیار کیا' انہیں ہیپی نیو ائیر وش کیا اور اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے چلے گئے۔

سمکی سکون سے دوپہر کے 2 بجے تک سوتی رہی۔ اس کی ملازمہ شیداں نے اس کے بچوں کو ناشتہ' کھانا وغیرہ دے دیا تھا۔ گھر کی صفائی بھی کروائی تھی۔ بچوں کو اور اسے بھی پتہ تھا کہ جب بیگم صاحبہ پارٹی سے رات دیر کو لوٹیں تو انہیں ڈسٹرب نہیں کرنا۔ ان کے اپس اسی وقت جانا ہے جب وہ خود اٹھ جائیں۔ بچے سمجھدار تھے' اپنے آپ کو خود محفوظ رکھنے کے طریقے انہیں بخوبی آتے تھے۔ وی سی آر لگا لیا یا کامک بکس پڑھ لیں' زیادہ بور ہوتے تو فرینڈز کو فون کر لیا یا ڈرائیور کے ساتھ کسی فرینڈ کے گھر ہو آئے۔ ان کا وقت اسی طرح گزر جایا کرتا تھا۔

سہ پہر کے تین بجے تک سمکی اور نعیم نہا دھو' ناشتہ کر کے تازہ دم ہو چکے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر بچوں کے ساتھ گپ شپ کی' ٹی وی دیکھا اور آرام کیا۔

شام ہوئی تو نعیم نے جم خانہ جا کر سوئمنگ اور ٹینس کھیلنے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ آج اس کا کور کمانڈر آفندی سے ڈبلز کھیلنے کا پروگرام بنا ہوا تھا' اس لیے وہ تو اپنا بیگ اٹھا کر جلدی جلدی نکل گیا اور سمکی بچوں کو ہوم ورک کرتا چھوڑ کر لاؤنج میں چلی آئی۔

فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو! ہائے مائی ڈیئر۔ ہیپی نیو ائیر!''

''ہیلو جی! آپکو بھی نئے سال کی بھرپور مبارکباد!'' سمکی نے جواباً کہا۔

''سوری میری چھمو رانی! میں رات پارٹی میں نہیں آسکا۔ مجھے پتہ ہے تم مجھ سے بہت ناراض ہو گی لیکن کیا کرتا؟ کیسے آتا؟ عین وقت پر بیگم صاحبہ کی ڈسک سلپ ہو گئی۔ لو بھلا بتاؤ' یہ بھی کوئی وقت تھا ڈسک سلپ کرنے کا؟ قسم سے بہت بور کیا اس نے ساری رات پڑی ہائے ہائے کرتی رہی۔ نیو ائیر کی حسین رات غارت ہو کر رہ گئی۔ اچھا خیر تم سناؤ۔ میری رانی نے مجھے بہت مس کیا ہو گا۔ ہے نا؟ اور میرا پریذنٹ کیا ہوا سوٹ پہن کر تو تم یقیناً مغلیہ شہزادی لگ رہی ہو گی۔ کاش میں تمہیں ان کپڑوں میں دیکھ سکتا۔!''

وہ بغیر رکے بولتا چلا گیا۔

''ہاں! تم تو آئے نہیں۔ میرا دل پارٹی میں کیسے لگ سکتا تھا!'' سمکی نے فون والے کو خفگی سے جواب دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ہینڈسم ڈاکٹر وحید کا تصور کرنے لگی۔ کتنی توجہ دے رہا تھا وہ اس پر۔ اس کا ڈریسنگ سٹائل' اس کا دھیما دھیما رومانوی انداز گفتگو' کتنا متاثر کن تھا سب کچھ۔

''میرے بغیر جو بوریت تمہیں ہوئی اس کے لیے' غلام معافی کا خواستگار ہے۔ معاف کر دو جان من!''

''جاؤ کر دیا!'' سمکی کو اس وقت اس کی لمبی چوڑی وضاحتوں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک نیا شگوفہ پھوٹ چکا تھا اور وہ اس نئی تبدیلی سے بہت خوش تھی۔

''آئی انڈرسٹینڈ! آخر تم صوفیہ کو تکلیف میں چھوڑ کر کیسے آ سکتے تھے! کوئی بات نہیں میں نے مائنڈ نہیں کیا!''

''کیا کہا؟ تم نے مائنڈ نہیں کیا؟ سیوٹ ہارٹ یہ تم ہی بول رہی ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کا تو خیال تھا سمکی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لے گی۔ اس سے جھگڑا کرے گی۔ رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لے گی مگر سمکی اس وقت بڑی انڈرسٹینڈنگ بنی ہوئی تھی۔ اسے سمکی سے اور زیادہ پیار ہونے لگا تھا۔ کتنی اچھی تھی وہ۔ اسی لیے تو وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے۔ وہ اس کا اتنا خیال جو رکھتی تھی۔ اس کے مسائل کو سمجھتی تھی۔

''اچھا دیکھو اس وقت میں لمبی بات نہیں کر سکتی میں نے ڈرائیوروے میں نعیم کی گاڑی آتے دیکھ لی ہے! او کے؟ بائے!''

سمکی نے ہاتھ میں پکڑی چٹ پہ لکھے نمبر کو غور سے دیکھا جو اس نے ابھی ابھی اپنے رات والے پرس میں سے نکالا تھا۔ نعیم تو ابھی بمشکل جم خانہ پہنچا ہوگا' مگر سمکی کا دل نئے نمبر پر بات کرنے کو چاہ رہا تھا اسی لیے اس نے بہانہ بنا دیا۔

''او کے بائے جھمو رانی! جلدی فون کرنا' جیسے ہی موقعہ ملے۔''

فون بند ہو گیا۔

سمکی نے نمبر ڈائل کیا۔ فون وحید نے ہی اٹھایا۔

''آج کیسی ہیں آپ؟ مائی فیئر لیڈی؟ بھئی آپ نے تو بہت ظلم ڈھایا!''

''کیوں کیا ہوا؟''

''دل لوٹ لیا' اور کیا ہونا تھا۔ جناب رات سے ہی اس بندہ ناچیز کے ہوش حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔اب کیا ہوگا ہمارا! ظالم کچھ رحم کھا!'' سمکی ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی۔ وہی ہنسی جیسے جلترنگ سے نغمے پھوٹ نکلے ہوں۔

''کمال کرتے ہیں آپ!اب اتنا بھی نہ بنایئے!''

''سچ کہتا ہوں۔نگر نگر' قریہ قریہ گھوما ہوں' امریکہ' افریقہ' یورپ۔ ساری دنیا دیکھی ہے لیکن آپ کی شخصیت کا سا جادو کسی میں نہیں دیکھا۔ پاکستان جیسا حسن کہیں نہیں ملا۔''

''اوہ واقعی؟'' وہی کھلکھلاہٹ' غنچوں کے چٹکنے کی نرم آواز۔

''اور میں پاکستان کا ہر شہر گھوما ہوں مگر لاہور جیسا حسن مجھے کہیں نہیں ملا!۔اب آپ کہیں گے آپ لاہور کا ہر گھر گھومے ہیں لیکن آپ کو مجھ جیسا حسن کہیں نہیں ملا؟''

''یو آر اے ڈیول!'' وہ اس کی حاضر جوابی کا قائل ہو گیا۔

''اگر میں پرنس چارمنگ ہوتا تو سچ مچ شیشے کا سینڈل لیے رات سے مڈنائٹ سنڈریلا کی تلاش میں لاہور کا ہر گھر جھانک چکا ہوتا!''

سمکی خاموش ہو گئی۔اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

''پھر کب دکھائی دے گا ہمیں ہمارا آدھی رات کا چاند؟''

''انتظار کیجیے۔انتظار کی لذت سے ہم آپ کو آشنا کروائیں گے!''

''صرف انتظار کی لذت سے' وصال کی لذت سے نہیں؟''

''ہائے اللہ' بڑے بے صبرے ہیں آپ!ابھی رات ہی تو پہلی ملاقات ہوئی ہے!''

''ہمیں نئی ملاقاتیں پسند ہیں۔ پرانی چیزوں میں ماضی کے آثار قدیمہ ہی ہمیں پسند ہیں اور کچھ نہیں!''

''مجھے بھی ویسے آپ کے سبجیکٹ سے بہت دلچسپی ہے۔ میں نے آرکیالوجی پر کئی کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔موہنجوداڑو مجھے ہمیشہ فیسی نیٹ کرتا رہا ہے!''

''آپ نے لاہور ٹھیک سے دیکھ رکھا ہے؟'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''دیکھ رکھا کیا مطلب؟ ظاہر ہے یہاں رہتی ہوں دیکھا ہوا ہی ہے؟''

''جی نہیں۔ دیکھنا اور رہنا' دو الگ الگ چیزیں ہیں۔آپ یہاں رہتے ضرور ہیں لیکن لاہور کی تاریخ کو جاننا' سمجھنا اس ورثہ کی خوشبو کو محسوس کرنا کچھ اور ہی بات ہے۔شہر لاہور ہماری تاریخ میں ایک

جگمگاتے ہوئے نگینے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری تاریخی عمارات تو خیر مغلیہ دور کی شان وشوکت بیان کرتی ہی ہیں لیکن اس شہر کی فصیل' پرانے دروازے' مٹی کا ریزہ ریزہ' اپنے اندر ماضی کی ایک داستان چھپائے ہوئے ہے!''

''آج کل آپ اس فیلڈ میں کیا کر رہے ہیں؟'' سمکی نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''میں اندرون شہر کے پرانے گھروں سے نوادرات اکٹھے کر رہا ہوں۔ ویسے آپ نے پوچھا تو بتا دوں کہ ان دنوں میری ریسرچ کا رخ شاہی قلعے کے اس طرف والے بازار کے پرانے گھروں کی طرف ہے!''

''آپ کا مطلب ہے۔۔۔۔'' ؟ وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔

''ہاں ہاں بھئی بازار حسن! وہ بھی تو ہمارے شہر میں تاریخی حیثیت کی حامل جگہ ہے!''

''ہائے اللہ! مجھے تو یقین نہیں آ رہا!''

''کیوں اس میں اتنا حیران ہونے والی کونسی بات ہے؟''

فون پر ابھی یہ دلچسپ گفتگو جاری ہی تھی کہ باہر گاڑی کا ہارن بجا۔ سمکی نے پردہ ہٹا کر دیکھا' اس کی سہیلی ڈولی اور اس کے دونوں بچے گاڑی میں سے اتر کر اندر آ رہے تھے۔ سمکی کو بادل ناخواستہ فون بند کر دینا پڑا۔

ڈولی کے بچے سمکی کے بچوں کے ساتھ ٹی وی پر کارٹون دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور دونوں مائیں گذشتہ رات کی پارٹی پر تبصرہ کرنے لگیں۔

سمکی نے ڈولی کو وحید کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وحید سے ہونے والی ٹیلیفون گفتگو بھی من وعن سنا دی۔

''اور شیرازی؟'' ڈولی نے سوال کیا۔

''آیا تھا اس کا فون بھی۔ آج تو میرا موڈ ہی نہیں بنا اس سے لمبی بات کرنے کا۔ یار بڑا بور لگتا ہے وہ وحید کے سامنے۔ وحید کتنا ذہین' ہینڈسم' دلچسپ شخص ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی اور میری ذہنی سطح ایک سی ہے اور شیرازی۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''خیر تمہیں اتنے تحفے دیتا ہے۔ روز نیا جوڑا' نیا پرفیوم تمہارے لیے باہر سے لا رہا ہوتا ہے' عمدہ ڈنر کھلاتا ہے ہم سب کو تمہاری وجہ سے۔ بے چارے کو ایسے مسترد بھی نہ کرو خیر!'' وہ مصنوعی ہمدردی سے بولی۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے! اسے کون سا کچھ کہہ رہی ہوں میں۔ اسے جوڑے دے کر جو خوشی ملتی ہے میں اس سے وہ خوشی نہیں چھینوں گی' اب اتنی ظالم بھی نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے محبت کرتا ہے' کرتا رہے۔ اس کا دل میں کیسے توڑ سکتی ہوں لیکن ہائے جو وحید میں بات ہے' اس کا کوئی جواب نہیں۔!"

دونوں سہیلیاں ہنسنے لگیں۔

تھوڑی ہی دیر میں سمکی کا شوہر بھی جم خانہ سے لوٹ آیا۔ ڈولی کو کسی شادی میں جانا تھا۔ اس لیے اس نے جو انڈیا کی سلک کا جوڑا سمکی سے ادھار مانگنا تھا پہننے کے لیے وہ لیا اور رخصت ہو گئی۔

نعیم اور سمکی نے آج خلاف معمول کھانا بھی گھر پر بچوں کے ساتھ کھایا۔ ورنہ انہیں اس کا موقعہ ہی کہاں ملتا تھا۔ ہر رات تو کسی نہ کسی کے گھر کھانا ہوتا تھا یا گیٹ ٹو گیدر۔ اس لیے بچوں کو تو ملازمہ ہی کھانا دیا کرتی تھی۔

صبح بچوں کے سکول چلے جانے کے تقریباً دو گھنٹے بعد سمکی بیدار ہوئی۔ موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ اسے فوراً ہی وحید کا خیال آ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ لان میں چہل قدمی کرنے لگی۔ ہر پتہ' ہر پھول خوبصورت اور نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ ماحول بھی نکھرا ہوا تھا۔ "آئی تھنک آئی ایم ان لو!" سمکی نے گلابوں کی پتیاں نوچ کر ہوا میں اڑا دیں۔ کتنا مزا آ رہا تھا اسے وحید کے بارے میں سوچ کر۔ اس کے خیالات میں کھو جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر ساڑھے دس بجے اسے اپنی ایروبکس Aerobics کی کلاس میں بھی جانا تھا۔

وہ اور اس کی سبھی سہیلیاں جسمانی فٹنس میں بہت یقین رکھتی تھیں اور پابندی سے جم میں جا کر ورزش کرتی ہیں۔

ان سب کا تقریباً روزانہ کا یہی معمول تھا صبح ایروبکس کلاس کے بعد بیوٹی پارلر جا کر فیشیل' تھریڈنگ یا ویکسنگ کرواتیں۔ پھر لبرٹی مارکیٹ کے پیچھے والی مارکیٹ میں بیٹھے درزیوں کے چکر لگاتیں۔ نئے سوٹوں پر رنگوں اور ڈیزائنوں کی مناسبت سے لگوانے کیلیے ڈوریاں' فیتے' بٹن وغیرہ خریدنا بھی تو ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لیے صبح کا وقت انہی کاموں میں گزر جاتا۔ کبھی کبھار بیچ میں ایک آدھ سہیلی کے گھر مارننگ کافی پارٹی بھی آ جاتی۔ ورنہ ہر ماہ ایک کمیٹی پارٹی تو لازمی تھی۔ سب سہیلیوں نے مل جل کر "جسٹ فار فن" کمیٹی ڈال رکھی تھی۔ پھر جس کی کمیٹی نکلتی' وہ سب کو چائنیز میں ٹریٹ دیتی۔ خوب مزا رہتا۔

سمکی کو ٹیلر کی دکان پر سویٹی اور سائٹی مل گئیں۔

سویٹی چالیس کلیوں کا مرینہ کا کرتہ سلوا رہی تھی اور سائٹی کی درزی سے اس کی سرخ شیشوں والی قمیض پر کندھے کے پیڈ ٹھیک سے نہ لگانے پر جھڑپ ہو رہی تھی۔

شام کو خوشنودہ کے گھر پارٹی تھی اور وہیں پر پہننے کے لیے یہ کپڑے ارجنٹ ریٹ پر سلوانے کے لیے اتنی مصیبت پیدا ہو رہی تھی۔

''یہ آج کل کے درزی اپنے آپ کو صدر بش سے کم نہیں سمجھتے!''

سائشی منہ پھلا کر آہستہ سے بڑبڑانے لگی۔

خوشنودہ کی پارٹی پر سبھی دوستوں نے جانا تھا کیونکہ خوشنودہ نے اپنا نیا شوہر سب سے پہلی بار متعارف کروانا تھا۔ خوشنودہ پورے گروپ میں سب سے انوکھا شوق رکھتی تھی' نئی نئی شادیاں کرنے کے شوق۔ اس کے اسی شوق کی وجہ سے اس کی سہیلیوں نے اسے الزبتھ ٹیلر کا خطاب دے رکھا تھا۔

رات کو اس ڈنر پارٹی میں جانے کے لیے سب ہی بڑے مشتاق تھے کیونکہ اب کی بار خوشنودہ نے کوئی بہت ہی موٹا مرغا پھانسا تھا اور ہر وقت اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہتی تھی۔

''اچھا بائے سی یو! شام کو پولو گراؤنڈ میں ملیں گے! سویٹی سائشی ہاتھ ہلاتی جوتوں کی ایک دکان میں گھس گئیں۔''

شام کو پولو گراؤنڈ میں واک کرنا بھی سب سہیلیوں کا پسندیدہ شغل تھا۔ وہاں بچوں کو جھولے جھولنے کے لیے چھوڑ دیتیں اور خود جاگنگ شوز پہن کر گراؤنڈ کے چکر لگانا شروع کر دیتیں۔

وہاں لاہور کا بڑا ان گراؤڈ آ تا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں تو ایک دوسرے کو بے تکلفی سے ہیلو! کہہ کر ٹیلی فون نمبروں کا تبادلہ کر لیتے البتہ مڈل ایج گروپ ذرا چھپ چھپا کر یہ کام کرتا۔

پولو گراؤنڈ شام کو انسانوں کی منڈی کی طرح دکھتا۔ اس کے بارے میں یہ شہرت خاصی عام تھی کہ وہاں جا کر آپ کوئی ''دوست'' تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ باوقار' چھڑی ہاتھ میں تھامے بوڑھے' دوسروں کی بیویاں تاکنے والے مرد' دل پھینک نوجوان' ڈھلتی ہوئی عمر والی عورتیں جن کے چہرے امریکہ سے منگوائی ہوئی مہنگی اینٹی ایجنگ کریمیں ملنے کے باوجود جھریوں کی آمد کو نہیں روک سکتے' بلکہ ہر نئی جھری ایک نئے نروس بریک ڈاؤن کا پیش خیمہ بن جاتی ہے' سبھی پولو گراؤنڈ میں چہل قدمی کرنے آتے تھے۔ سمکی کا شام کو پولو گراؤنڈ جانے کا موڈ نہیں بنا۔ دراصل وہ خوشنودہ کی پارٹی میں ذرا آرام کر کے جانا چاہتی تھی۔ اگر وہاں چلی جاتی تو اس کی بیوٹی سلیپ پوری نہ ہونے ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ تھکا تھکا لگنے لگتا اور یہ اسے کسی صورت بھی گوارا نہیں تھا۔ وحید نے بھی اس پارٹی میں آنا تھا۔ یہ سوچ کر اس کا من گنگنانے لگا اور ذہن رات کو پہننے والے جوڑے کے انتخاب میں مصروف ہو گیا۔

نعیم کو دوپہر کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا اور سمکی تھوڑی زیادہ فری محسوس کر رہی تھی

کیونکہ خاوند کے پارٹی میں موجود ہونے سے تھوڑا سا ریزرو تو آخر رہنا ہی پڑتا ہے۔

پارٹی بہت شاندار تھی۔ خوشنود، اپنا نیا مرغا لیے سب کو ہیلو ہائے کہتے نہ تھک رہی تھی۔ ببلی، خاوند کے موجود نہ ہونے کے ڈپریشن میں مسلسل گرفتار سگریٹ پہ سگریٹ سلگائے ہلکا ہلکا ڈرنک کر رہی تھی۔ کبھی کبھار کسی بات پر بے اختیار ہو کر وہ بے ساختہ ایک آدھ قہقہہ بھی لگا دیتی۔

وحید، سمکی پر اپنی بھرپور توجہ نچھاور کر رہا تھا۔ ڈولی، حمیرا کے بھائی ٹونی کی محبت میں کسی صورت بھی گرفتار ہونے کے لیے تیار نہ تھی اس لیے ٹونی کے جھوٹے اظہار محبت کا جواب اسے اپنی بے نیازی سے دے رہی تھی۔ ابھی کچھ عرصے پہلے ہی تو وہ اچھی ہوئی تھی ورنہ زریں کے شاعر دیور شامی نے تو اسے اپنے شعر سنا سنا کر اچھی بھلی مریض عشق بنا دیا تھا۔

ٹونی! تمہیں معلوم ہے وحید صاحب آج کل اس بازار کے پرانے مکانوں کی وضع قطع اور تاریخ پر ریسرچ کر رہے ہیں!''

ڈولی نے ٹونی کا دھیان ہٹانے کے لیے موضوع بدل دیا۔

''کیا واقعی؟ وحید صاحب کیا یہ سچ کہہ رہی ہیں؟'' اس نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔ سمکی اور ببلی بھی ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

''جی بالکل! وہ علاقہ بھی ہماری تاریخ کا حصہ ہے آخر۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شاہی عمارتوں اور چکلوں میں اکثر و بیشتر مکانی قرب رہا ہے۔ اس لیے کہ بادشاہ مجروں کے شوقین اور طوائفوں کے دلدادہ ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلا چکلہ محمد تغلق نے اپنی راجدھانی دولت آباد کے نزدیک طرب آباد کے نام سے قائم کیا۔ شہنشاہ اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس ان کے لیے شیطان پورہ آباد کیا۔ دہلی میں چاندنی چوک اور قلعہ معلیٰ سے ملحق چاوڑی بازار تھا۔ لکھنؤ میں واجد علی شاہ نے طوائفوں کو اپنے محل سے نزدیک ترین رکھا ہوا تھا اور ہمارے شہر لاہور کو دیکھئے، شاہی قلعہ اور ہیرا منڈی میں چند ہی قدم کا فاصلہ ہے۔ ہیرا منڈی میں بہت سے مکانات تاریخی حیثیت کے حامل ہیں!''

ٹونی اور سب فرینڈز بڑے تجسس سے سن رہی تھیں۔

''یار دیکھنا چاہیے کبھی جا کر!'' ٹونی کے چہرے پر ایک عیاش طبع مرد کی سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''ہائے دل تو بڑا چاہتا ہے مگر کیسے جائیں؟'' حمیرا نے بھی اظہار خیال کیا۔

''کیا واقعی آپ لوگ وہاں کبھی نہیں گئے؟'' وحید نے یوں سادگی سے پوچھا جیسے وہاں جانا کوئی معمولی بات ہو۔

"کیا مطلب ہے؟ ہم کیوں جانے لگے بھلا اس گندی جگہ پر' توبہ توبہ!" بلی نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی۔

"بھئی ویسے ہی! مشاہدے کے لیے بھی تو بندہ کبھی جا سکتا ہے آخر! اتنا محدود مشاہدہ بھی نہیں ہونا چاہیے میرے خیال میں انسان کا! زندگی کے ہر پہلو پر نظر ڈال لینی چاہیے۔ اپنی دنیا سے باہر نکل کر بھی دیکھنا چاہیے کہ اس پار کے لوگ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں!"

سب لوگ قائل سے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"ویسے ایک بار ہم لوگوں نے خالی ڈرائیو کر کے ان گلیوں کو دیکھا تھا۔ یاد ہے سمکی' نعیم بھائی اور عرفان اللہ ساتھ لے گئے تھے ہمیں!"

ڈولی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

"ہاں! بس ڈرائیو ہی کی تھی! اور تو کچھ نہیں کیا تھا"۔

سمکی جھٹ سے بولی۔

"چلو یار' ہو جائے!" ٹونی نے تجویز پیش کی۔

"کیا؟" وحید نے پوچھا۔

"بھئی چلتے ہیں! ابھی رات جواں ہے۔ ذرا نظارہ کرتے ہیں۔ آخر مشاہدہ بھی تو کرنا ہے نا!"

سب ہنسنے لگے۔

"نہیں' نہیں مجھے تو بڑا ڈر لگتا ہے بھئی!" خوشنود اپنے نئے میاں سے لاڈ سے چپک گئی۔

"جس نے چلنا ہے چلے جس نے نہیں چلنا نہ چلے۔" ٹونی اٹھ کھڑا ہوا سمکی نے وحید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"چلنا ہے؟" وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"آپ کہیں اور ہم نہ آئیں ایسے کیسا ہو سکتا ہے؟" آپ ساتھ ہوں گے تو مجھے کوئی فکر غم نہیں!"

سمکی نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ اس کا میاں شہر سے باہر گیا ہوا تھا ورنہ شاید تھوڑا بہت ہنگامہ کرتا یا اسے جانے سے روک لیتا۔ کبھی کبھی وہ بہت اولڈ فیشنڈ لوگوں کی طرح قنوطی ہو جایا کرتا تھا۔

دو گاڑیوں میں جانے والے سوار ہوئے۔ باہر کی نرم معطر ہوا کے شفیق لمس نے انہیں مزید شوخ بنا دیا۔ ٹونی بہت مچا! جا رہا تھا۔

"بھئی ہم تو فارنرز ہیں ہمیں لاہور بائی نائٹ دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ سب ہمیں یہ

کروائیے! وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگا!''

ڈاکٹر وحید تو لاہور شہر کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا ثابت ہو رہا تھا۔ اسے شہر کے بارے میں مکمل معلومات تھیں۔ پہلے اس نے سب کو مولا بخش کے مشہور و معروف پان کھلوائے' پھر گوالمنڈی کے قلفے کی دکان پر ہلہ بول دیا۔

''یونو ٹونی! مزنگ میں چائے کی ایک ایسی دکان ہے جو آج تک کبھی بند نہیں ہوئی۔ یعنی جب ایک دکاندار تھک جاتا ہے تو دوسرا آ سنبھالتا ہے عام طور پر باپ بیٹا ملکر یہ کام کرتے ہیں!''

وحید نے ٹونی کو مزید حیرت زدہ کر دیا۔

''ایسے ایورلاسٹنگ انسٹی ٹیوشنز کا تو ''گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز'' میں ذکر ہونا چاہیے یار!''

ٹونی متاثر ہو کر بولا۔ وحید نے اس دکان کی چائے سب کو پلوائی تو سب اس چائے کی اعلیٰ کوالٹی کے بھی قائل ہو گئے۔

''اگلا سٹاپ راوی دریا ہے!'' وحید نے اناؤنس کیا اور گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ لوگ نیچے اتر آئے۔

''راوی کے بارے میں بھی ہمیں کچھ بتائیں پلیز!'' ایک فرمائش آئی۔

''اس دریا میں اب وہ شاہانہ پن کہاں جو ماضی میں اس کی لہروں میں چھپا جھلملاتا ہوا زیور ہوا کرتا تھا۔ اب تو یہ ایک اجڑی ہوئی بیوہ کی مانند ویران ہو کر رہ گیا ہے۔ سکڑ کے یوں سمٹ کر رہ گیا ہے جس طرح کوئی ان چھوئی دوشیزہ اپنی عزت لٹ جانے کے بعد اپنی بچی کھچی عزت نفس کے چیتھڑے اپنے جسم پر لپیٹنے کی کوشش میں خود کو ناکام سا محسوس کر کے بے بسی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ وقت بہت ظالم چیز ہے۔ ہر شے کو روند کر آگے بڑھ جاتا ہے۔''

''یار ڈپریس نہ کرو اور اگلی منزل پر لے چلو یعنی اصلی مقام پر!'' ٹونی اس اداسی سے بھری ہوئی کمنٹری سے بور ہو چلا تھا۔

سب خوش ہو گئے اور اب گاڑیاں شاہی محلے کی طرف چل دیں۔

تنگ تنگ گلیوں اور اونچے چوباروں والا یہ عورت بازار' مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ زریں' سمکی' ڈولی' سبھی نے شریف عورتوں کی طرح اپنے دوپٹے سروں پر لے لیے اور دھڑکتے ہوئے ... کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ گاڑی آہستہ آہستہ سڑک کے سینے پر رینگنے لگی۔

... اللہ جی! کیسی جگہ ہے!'' انہوں نے بے یقینی کے عالم میں اوپر ایک چوبارے کی طرف

نظریں دوڑائیں اور پھر دیکھا کہ مختلف مکانوں کی بالکونیاں ایک سا نظارہ پیش کر رہی تھیں۔

ہر بالکونی پر ایک ایک دو دو لڑکیاں کرسی ڈالے مجسمے بنی بیٹھی متجسس نگاہوں سے راہ گیروں کو دعوت نظارہ دیتی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے سروں پر دو دو سو پاور کے تیز بلب جگمگا رہے تھے' جس میں نہائی وہ بجی سجائی شوکیس میں بجی لذیذ مٹھائیاں لگتی تھیں۔ مٹھائیوں کی دکان میں بجی مٹھائیاں دیکھ کر کس کافر کا دل للچائے بغیر رہ سکتا ہے' اس لیے بالکونی کے نیچے کھڑے کتنے ہی درندے بھیڑیئے اپنی رال ٹپکاتی تھوتھنیاں اوپر اٹھائے' اپنی غلیظ نظروں سے محض ونڈو شاپنگ کر کے ہی' دل کو خوش کر رہے تھے۔

کچھ بالکونیاں ایسی بھی تھیں جو مٹھائیوں کے بجائے چرغے کی دکان دکھائی دیتی تھیں۔ ان پر رسیوں سے لٹکی ہوئی کھال نچی' چٹخارے دار مصالے میں ڈوبی ہوئی' ننگی' روسٹ ہونے کو تیار مرغیاں' خریدار کو اپنی طرف کھینچتی نظر آ رہی تھیں۔

''گندی عورتیں! کیوں ایسا غلیظ کام کرتی ہیں توبہ!'' بلی کو کراہت سی محسوس ہوئی۔

''عذاب الٰہی نازل ہو گا ان پر!'' سمکی بھی استغفار کرنے لگی۔

''کیا سین ہے یار! مزا آ گیا!'' ٹونی بہت انجوائے کر رہا تھا۔

''مجھے تو بھوک لگی ہے اور سنا ہے یہاں کے پائے بہت مشہور ہیں!''

ٹونی نے ایک دکان پر پنجھے کے پائے لکھے دیکھ کر نیا شوشہ چھوڑ دیا۔

''میری پارٹی سے کھا پی کر نہیں آئے کیا؟'' خوشنودہ نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''بھئی اتنی سیر کے بعد اگر یہاں کے المشہور پائے نہ چکھے تو اس ایڈونچر کا فائدہ؟ یا تو پھر آپ لوگ اور کچھ کھلا دیں تو میں کمپرومائز کر لوں گا!'' ٹونی کھی کھی کرنے لگا۔

سب نے اسے گھور کر اس طرح دیکھا کہ وہ ڈھیٹ بن کر نداقاان کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔

''نو پرابلم بھئی' پنجھے کے پائے یہاں کی خاص ڈش ہے۔ کوئی حرج نہیں کھا لیتے ہیں۔''

وحید کے کہنے پر سب لوگ گاڑی سے اتر کر دکان کے اندر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں کھانا آ گیا۔ تام چینی کی چھوٹی چھوٹی پلیٹوں میں پتلے سے شوربے میں ڈوبی ہوئی ایک ایک بوٹی اور نان ان کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ پینے کے لیے سٹیل کے جگ اور گلاس بھی بیرا بڑے اہتمام سے سیٹ کر کے رکھ گیا۔

برتن دیکھتے ہی خواتین نے عجیب و غریب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''سلاد؟'' حمیرا نے میز پر نظریں دوڑائیں۔

''سلی گرل! یہاں صرف گوشت سرو کرتے ہیں!'' وحید نے اطلاعاً کہا۔

''اچھا ذرا ٹشو ہی منگوا دیں!'' ہمکی نے شوربے میں ڈوبی انگلیاں دیکھ کر بے چینی سے فرمائش کی۔

''آپ کھانے کے بعد ادھر ہاتھ دھو سکتے ہیں جی!'' نوکر نے ایک طرف لگے ہوئے واش بیسن کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی ایک طرف ہاتھ پونچھنے کے لیے سفید' میلا سا تولیہ بھی لٹک رہا تھا۔

''!Have Fun Ladies ریلیکس اینڈ انجوائے دس پلیس'' ٹونی نے ہولے سے سرزنش کی اور سب سر جھکا کر کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔

کھانا کھانے کے بعد مجبوراً اسی طریقے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ شکر ہے وہاں ڈھنگ کا صابن کم از کم موجود تھا' مگر دھونے کے بعد جیسے ہی زریں نے تولیے کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ بلی نے پاگلوں کی طرح نروس ہو کر ہلکی سی چیخ مار کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔

''ڈونٹ ٹچ اٹ! ایڈز' ایڈز!''

''ہائے اللہ۔ یو آر رائٹ!''

ایک دبی دبی چیخ ان کے لبوں سے نکلی۔ وہ یوں چونک کر اس تولیے سے دو دو گز دور ہو گئیں جس طرح وہ تولیہ بجلی کا تولیہ ہو۔ سب ہنس دیئے۔

''اوہ کم آن لیڈیز! کیسے کیسے فوبیاز میں گرفتار ہیں آپ لوگ! اگر اتنا ہی خوف ہے تو چلیں واپس چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کافی سیر ہو گئی ہے' ٹھیک ہے؟''

ڈاکٹر وحید اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بولا۔

''اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب! کیا حال چال ہیں جناب کافی دنوں بعد نظر آئے۔ آپ کا کام ختم ہو گیا کیا؟''

نو وارد نے آتے ہی کئی سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر وحید اس سے بڑی گرمجوشی سے ملا اور اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کروانے لگا۔

''یہ یہاں کے علاقہ کونسلر جناب ضمیر الدین ککے زئی ہیں۔ بہت اچھے شخص ہیں۔ ریسرچ کے دوران انہوں نے میری بہت مدد کی اور ہر طرح سے تعاون کیا۔ انہی کی وجہ سے میں ہیرا منڈی کی اصل تاریخی حیثیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا ہوں!''

''اچھا! اچھا! سب متاثر ہو کر دیکھنے لگے۔''

''گھر والے آئے ہیں شاید! بیبیاں کچھ کھائیں پئیں گی؟''

اس نے مہمان نوازی کا حق ادا کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں نہیں ہم لوگ تو ابھی پائے کھا کر بیٹھے ہیں۔شکریہ یہ سب دوست ہیں۔انہیں بہت تجسس تھا یہاں آ کر دیکھنے کا شوق تھا۔اس لیے میں ان کی خواہش سے مجبور ہو کر انہیں یہاں لے آیا۔!''

وحید نے وضاحت کی۔

''اچھا تو پھر آپ کے دوست تو ہمارے دوست بھی ہوئے کیا خاطر کی جائے آپ لوگوں کی؟ جا یار بوتلیں لے کر آ۔!''

کونسلر نے اپنی ہیرے کی چمکتی انگوٹھی والا ہاتھ بڑھا کر ایک لڑکے کو پانچ سو کا نوٹ پکڑا دیا اور جلدی آنے کی تاکید کی۔

''نہیں،نہیں آپ تکلیف نہ کریں۔شکریہ بہت بہت،بلی جو بہت عقلمند تھی چپ نہ رہ سکی۔''

''تکلیف کیسے جی آپ ہمارے مہمان ہیں آپا جی۔یہ تو کوئی بات ہی نہیں ڈاکٹر صاحب فرمایئے اور کوئی خدمت ہو تو؟''

''ہمیں ان کا ڈانس دیکھنے کا بہت شوق ہے!کیا ہمیں آپ کوئی مجرا دکھا سکتے ہیں کیونکہ ہم نے تو بس فلموں میں ہی دیکھ رکھا ہے!''

سمکی صاف جھوٹ بول گئی حالانکہ ابھی پچھلے ہی دنوں اس نے کسی ویسے پر دونو جوان رقاصاؤں کا مجرا دیکھا تھا جن کے بارے میں سنا تھا کہ وہ آج کل مارکیٹ میں ٹاپ پر جا رہی ہیں۔

ہاں جی!ہم دیکھنا چاہتے ہیں'ان کے گھر' کیسے وہ سب کچھ کرتی ہیں؟وہاں کا ماحول وغیرہ۔

یو نو!اگر ممکن ہو سکے تو۔۔۔یعنی اگر آپ کو کوئی پرابلم نہ ہو تو۔۔۔۔۔۔!''

بلی نے بڑے اخلاق سے بات کی۔

''کمال کرتی ہیں آپا جی آپ!پرابلم یا تکلیف کی کونسی بات ہے اس میں۔یہ میری اپنی قوم ہے جی۔۔۔۔میری اپنی بچیاں ہیں۔ہم فنکار لوگ ہیں جی۔فن بیچ کر پیٹ پالتے ہیں فن کا مظاہرہ ہی ہماری زندگی ہے۔میں آپ کو لے چلتا ہوں۔آپ فکر ہی نہ کریں!''

کونسلر بڑے فخر سے انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنے لگا۔راستے میں کچھ لوگوں نے سروں پر چادریں لیے فیشن ایبل عورتوں اور مردوں کو دیکھا تو چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔

''ہائے اللہ کتنا Embarrassing لگ رہا ہے!کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے اور اخبار میں ہماری فوٹو نہ آ جائے کل صبح۔''

ہمیشہ کی وہمی ڈولی نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

''کیا بیوقوفیاں بک رہی ہیں آپ۔ تمہارا کیا مطلب ہے ہم جیسوں کو کوئی 'وہ' سمجھ سکتا ہے! دماغ تو نہیں چل گیا! توبہ ہے تم بھی کبھی کبھار بڑی عجب بات کر دیتی ہو کہاں ''ہم'' کہاں وہ۔ توبہ اللہ معاف کرے' ان کے تو چہروں پر ہی پھنکار پڑی ہوتی ہے۔ نحوست ماریاں!''

بلی نے ڈولی کو چپ کروادیا۔

گلیوں میں کھلتے دروازوں والی ہر مکان کی بیٹھک پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ جس میں سے باہر سے دیکھنے والے کو اندر کا کچھ ڈھکا' کچھ چھپا' نیم وا آنکھوں کا سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ پردے؟'' بلی نے پھر سوال کیا؟

''آپا جی پردہ نہ ڈالیں تو پولیس فحاشی کا الزام لگا دیتی ہے اور اگر مکمل طور پر پردہ ڈال کر رکھیں تو گاہک کو کیسے معلوم ہو کہ اندر والی کیسی ہے؟ جی بزنس کے لیے ان باتوں کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے ہم لوگوں کو!''

اس نے بڑے کاروباری انداز میں جواب دیا۔

کونسلر نے کچھ ہی دیر میں انہیں ایک دو منزلہ مکان کے آگے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ''یہ سندری اور مندری کا کوٹھا ہے۔ آج کل یہ بھی بہت پاپولر ہیں۔ دونوں بہنوں نے فن کی بلندیوں کو چھولیا ہے۔ آپ دیکھیں گے تو بہت پسند کریں گے!''

وہ انہیں مکان کے اندر لے گیا۔ مگر ایک منٹ پر باہر رکنے کا اشارہ کیا۔ بیٹھک میں ان کے داخل ہونے سے پہلے وہ خود شاید ان کے بارے میں اندر والیوں کو کچھ بتانا چاہتا تھا اندر سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک دو بار یہ فقرہ بھی کان میں پڑا۔

''شریف آئے ہیں! بوتلیں منگواؤ!''

''ہائے اللہ ناٹ اگین! بوتلیں پی پی کر تو میرا حشر ہو گیا ہے!''

ڈولی نے برا سا منہ بنایا۔

''بھئی ہم v i p ہیں آخر'' زریں نے فخریہ انداز میں کہا۔

اس ہی لمبے گلی کے ایک کونے والے ویڈیو سنٹر سے اونچی آواز میں انگلش گانوں کی کیسٹ بجنے لگی۔

She works hard for the money

So you better treat her right.

امریکی پاپ سنگر ڈونا سمرا پنے مخصوص انداز میں پر جوش طریقے سے گا رہی تھی۔

''اوئی اوئی ویڈیو سنٹر!'' ببلی نے بلند آواز میں ویڈیو سنٹر کا نام پڑھا اور سب زیر لب مسکرا دیئے۔

''آیئے جی اندر!'' کونسلر انہیں بڑی عزت سے اندر لے گیا۔ اندر ایک بڑی عمر کی عورت اور دو نوجوان لڑکیاں کمرے میں موجود تھیں۔

''سلام علیکم جی!'' سب نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔

ٹونی اور وحید بڑے خوش نظر آنے لگے اور کیوں نہ آتے' لڑکیاں دونوں بہنیں نوجوان' تروتازہ اور انداز سے مہذب دکھائی دیتی تھیں۔ سندری اپنے نام کی طرح سندر تھی۔ سرخ وسفید رنگت' تیکھے نقوش' لانبے سیاہ بال اور پتلی کمر اسے بہت پر کشش بنائے دے رہی تھی۔

مندری ذرا مختلف تھی۔ اس کا رنگ گندمی مائل اور نقوش کچھ ایسے غیر معمولی تو نہیں تھے مگر اس میں جسمانی کشش بدرجہ اتم موجود تھی۔ جب وہ اپنے شانے تک کٹے ہوئے سیاہ بالوں کو سٹائل سے جھٹکا دیتی تو اس پر ماضی کی اداکارہ نیلو کا گمان ہونے لگتا۔

ان کی ماں' بروکیڈ کے چمکدار گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے' پان چباتے' سازندوں کو اپنے سُر ٹھیک کرتے دیکھ رہی تھی۔ ہارمونیم اور طبلے سیٹ کیے جارہے تھے۔ مگر موسیقی کے بجائے ہارمونیم سے دردملی چیخیں اور ٹھونکے جانے والے طبلوں سے دل کی دھڑکنیں' ایک دھمک کے ساتھ ابل ابل کر باہر کو ایسے نکلتیں کہ در و دیوار لرزنے لگتے اور سوالیہ نشان پرانی سفیدی کی طرح اکھڑ اکھڑ کر نیچے گرنے لگتے۔ ایک عجیب سی افسردگی اور بے حسی کا وجود اس کمرے میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ موجود تھا۔ چند ہی لمحوں میں بوتلیں آ گئیں۔ چاروناچار سب کو پینا پڑیں ورنہ میزبانوں کی دل شکنی ہوتی۔

ابھی ساز سیٹ ہی ہو رہے تھے کہ مندری' جو شاید بڑی بہن تھی' اٹھ کر ایک کھڑکی نما دروازے سے گھر کے اندر چلی گئی۔

سمکی کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا مگر کھڑکی سے کچھ نظر نہ آتا تھا کیونکہ اس کے آگے ایک موٹا سا پردہ لگا ہوا تھا۔

''یہ اب شروع کیوں نہیں کر دیتیں؟''

مہمان خواتین نے کسمسانا شروع کر دیا۔

''کیا یہ لڑکی نین تارا تھی؟'' سمکی نے نین تارا نامی رقاصہ کے بارے میں بہت سن رکھا تھا۔ اسے شاید سب تک ان دونوں لڑکیوں کے نام معلوم نہیں ہوئے تھے۔

''نہیں جی! نین تارا تو فلموں میں چلی گئی ہے۔ یہ بھی بہت فریش پیس ہیں جی!'' کونسلر کھی کھی کرنے لگا۔

''لاحول ولاقوۃ!'' ببلی کو کوفت ہونے لگی تھی اس قسم کے انداز گفتگو سے۔

''دراصل جناب ابھی آفس کے ٹائم میں کچھ وقت رہتا ہے اور باجی ٹائم سے پہلے کام نہیں شروع کرتیں۔''

سندری نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آفس!'' خواتین کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

''جی ہاں آپا جی' یہاں کے کام کے اوقات گیارہ بجے سے ایک بجے ہیں۔ انہی اوقات کے دروان ہی کام کیا جاتا ہے اور ابھی گیارہ بجنے میں پانچ منٹ ہیں' بس وہ اندر سے آتی ہی ہوں گی۔''

گلی میں کھلی کھڑکی میں سے انہوں نے کئی گاڑیاں آتی دیکھیں جن میں بھڑکیلے کپڑے پہنے فل میک اپ کئے خواتین بیٹھی تھیں۔ گاڑی کسی مکان کے آگے رکتی عورت اترتی اور بیٹھک کے اندر چلی جاتی۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے اپنی رہائش شہر کے معزز علاقوں مثلاً گلبرگ' علامہ اقبال ٹاؤن' ماڈل ٹاؤن میں رکھی ہوئی تھی مگر صرف کام کی غرض سے آفس ٹائم میں ہی ہیرامنڈی میں آتی تھیں۔

گیارہ بجتے ہی موسیقی شروع ہوگئی۔ پردے گرا دیے گئے' سندری نے گھنگھرو پہن لیے اور نغمہ شروع کر دیا۔

'' دھیرے دھیرے میری زندگی میں آنا ---- دھیرے دھیرے میرے دل کو چرانا ----''

رقص شروع ہو گیا مگر مندری کچھ دیر بعد آئی اور بہن کے ساتھ مل کر گانا اور رقص کرنا شروع کر دیا۔

''دیر سے کیوں آئی ہے؟ غالباً اندر بھی کسی کو اٹینڈ کر رہی ہوگی!''

زریں اور ببلی سرگوشیوں میں طنز کرنے لگیں۔ سمکی نے دزدیدہ نگاہوں سے وحید کو تاکا۔ شکر ہے وہ رقاصہ کو نہیں بلکہ اسی کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر گیت کو انجوائے کر رہا تھا۔ سمکی کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ دھیرے دھیرے میری زندگی میں آنا -----

مندری کے چہرے پر ایک سچی لگن سے کام کرنے والے ذمہ دار ورکر کا سا تاثر تھا۔ سندری البتہ الہڑ اور شوخ دکھتی تھی۔ اس کے انداز اور ادائیں اس کی کم عمری اور ذہنی ناپختگی کی چغلی کھاتی تھیں۔

ایک گانے کے بعد انہوں نے دوسرا فلمی گانا شروع کر دیا۔

''میں تیری دشمن' دشمن تو میرا۔ میں ناگن تو سپیرا!''

''توبہ کتنا گھٹیا گانا ہے!''

''اور کتنا غلیظ ماحول ہے ۔۔۔۔۔ان عورتوں کو تو شرم وحیا پاس سے بھی نہیں چھو کر گزری ۔۔۔کس طرح نوٹ سمیٹتی ہیں اپنے جسم کی نمائش کر کر کے!''

عورتوں میں حسب عادت بدخوئیاں شروع ہو چکی تھیں ۔ٹونی نے ان کے تیور محسوس کر کے انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی کیونکہ وہ تو اس ناچ گانے سے بھرپور لطف اٹھا رہا تھا۔کہاں نیو یارک اور لندن کی ریڈ لائٹ ایریا کی طوائفیں اور کہاں یہ رقص وموسیقی۔

''یار ہمارے مشرق میں ہر چیز ہوتی ہے مگر ہوتی ذرا اسٹائل سے ہے! ہے نا؟''

اس نے وحید کے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی۔

نغموں کی لے اور بول بدلتے جارہے تھے مگر جسم وہی تھے۔وہ ہر تان پر تھرکنا 'لچکنا بخوبی جانتے تھے۔

''ارے کسی کو بھیج کر اچھے سے پان منگواؤ۔شریف آئے ہیں!''

لڑکیوں کی ماں نے ایک سازندے کو ایک گانا ختم ہوتے ہی آرڈر دیا۔

بلی کو یہ سن کر غرور سے نشہ سا آ گیا۔

اس سے پہلے کہ نیا گانا شروع ہوتا ایک ملازم نے مندری کے کان میں آ کر کچھ کہا۔مندری نے فوراً اپنے پاؤں کے گھنگھرو اتارے اور کمر کے گرد بندھا دوپٹہ ڈھیلا کرنا شروع کر دیا۔

مہمانوں نے استفہامیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اپنی نظروں میں ایک دوسرے کو جواب بھی دے دیا۔یقیناً اندر کوئی موجود تھا۔جو یہ پھر چل پڑی تھی۔

''بھئی یہ عورتیں پکی پروفیشنل ہیں۔کمائی کا کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔اب دیکھو یہاں سے ناچ کر بھی کما رہی ہیں اور پردے کے پیچھے دیوار کے اس پار بھی اپنے دام کھرے کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دے رہیں۔ویسے آئی ریسپکٹ دیئر پروفیشنل ازم!'' ڈولی نے بلی کے کان میں کہا۔

سندری نے ایک دو گانوں پر اکیلے ہی ڈانس کیا پھر کچھ دیر بعد تھک کر ستانے کے لیے بیٹھ گئی۔

نہ جانے مندری آنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی تھی۔

''میں تو بور ہو رہی ہوں۔''

''اور میرا دم گھٹنے لگا ہے اس ماحول میں' لگتا ہے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا مجھے تو!''

توبہ ہمارا مذہب کس طرح پامال ہو رہا ہے یہاں پر! اللہ میری توبہ!''

''مجھے تو ابکائی آ رہی ہے!''

"بھئی مجھ میں تو اور فحاشی دیکھنے کی تاب نہیں Lets Go"۔

مہمان خواتین آپس میں اظہار خیال کر کے اٹھنے لگیں۔

"باجی! وہ لوگ جا رہے ہیں!" سندری نے پردے کے قریب منہ لے جا کر کہا ایک لمحے کو خاموشی رہی پھر سندری بھی اندر کو چل دی۔

"بہت مصروف ہو گی۔ رہنے دو بھئی!" بلی طنزیہ لہجے میں مسکرائی۔

"بڑی بدتمیز اور گھٹیا ہے یہ سستی عورت۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ہم لوگوں کو جانے سے پہلے شکریہ اور سلام کر کے رخصت کرے۔ آخر پیسے دیئے ہیں! مفت تو ناچ نہیں دیکھا ان کا!"

خوشنودہ نے توہین محسوس کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھائی اور سب سیڑھیاں اترنے لگے۔

سندری دوبارہ باہر نکل آئی اور انہیں جاتا ہوا دیکھنے لگی۔

خوشنودہ کے اندر تجسس اور حقارت نے یکا یک ڈھٹائی آمیز جرات پیدا کر دی۔

سیڑھیاں اترنے سے پہلے کھڑکی نما دروازے کے پاس گزرتے ہوئے وہ سب کی نظریں بچا کر پردے کا کونہ سرکائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آخر وہ کونسا ایسا عاشق تھا جس کی خاطر وہ بار بار اندر جا رہی تھی اور آخر میں تو اندر جا کر بیٹھ ہی گئی تھی۔

مگر اندر کا نظارہ اس کی توقع کے بالکل خلاف نکلا۔ اس کی نظریں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ کمزور پاور کی زرد بیمار سی روشنی میں نہائے' گدلے پانی جیسے مٹیالے کمرے میں بچھی چارپائیوں پر آڑے ترچھے لیٹے کچھ افراد سو رہے تھے۔ کسی کسی چارپائی پر بچوں کے گچھے بھی بے خبر پڑے تھے۔ لیکن ایک بچہ گچھے سے علیحدہ بلب کے عین نیچے کتابیں لیے بیٹھا تھا۔

اس کے ساتھ اس کی ماں بھی اس کی کتابوں پر جھکی ہوئی اسے کچھ پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ ماں نے فوراً پردہ اٹھا کر جھانکنے والی کو دیکھ لیا اور معذرتانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوری جی! آپ لوگ جا رہے ہیں! پھر کبھی آیئے نا۔ دراصل صبح اس کا ٹیسٹ ہے اور میرے بغیر اسے کوئی ٹیسٹ یاد نہیں کرواسکتا! انگلش کا بڑا مشکل ٹیسٹ ہے اسی لیے میں اسے یاد کروا رہی تھی آپ کو تو پتہ ہے جب تک بچوں کے ساتھ خود نہ لگو کہاں پڑھتے ہیں آپ کچھ اور بیٹھتے بس میں آ ہی رہی تھی!" خوشنودہ جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی اب اس کا واقعی دم گھٹنے لگا تھا۔

نیلوفر اقبال

آنٹی

رؤفہ کی پشت میری جانب تھی۔ اس کا سرخ لیس والا گاؤن جس کے نیچے کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے کرسی کی دونوں جانب پروں کی مانند پھیلا ہوا تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی ہلکی ہلکی دھوپ میں اس کے بلونڈ سر کے گرد سنہری ہالہ سا نظر آ رہا تھا اور پیچھے کی طرف سے وہ کسی فرشتے کا پاکیزہ اور پرنور سر نظر آ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ فرشتہ یکلخت غائب ہو گیا۔

''اگر اس نے مجھے ریپ کرنے کی کوشش کی تو؟۔۔۔۔۔۔''

''تو تم ریپ ہو جانا۔''

''ہاہاہا۔۔۔۔آئی لائیک اٹ۔۔۔۔بٹ مائی ڈیر گرل! یو ڈونٹ نو می۔۔۔۔۔ میں اتنی ایزی نہیں ہوں۔۔۔۔پہلی دو ڈیٹس پر تو سوال ہی نہیں۔ مجھے بھی اپنی سیلف ریسپیکٹ پیاری ہے۔۔۔۔پہلی ڈیٹ پر ڈھے جانے والیوں کی تو مرد بالکل عزت نہیں کرتے۔۔۔۔۔''

''جبکہ تیسری ڈیٹ پر ڈھے جانے والیوں کی تو ماں، بہن کی طرح عزت کرتے ہیں۔''

''جہنم میں جائیں۔ تم ادھر آ کر ذرا شیشہ پکڑو۔ اس منحوس ڈریسنگ ٹیبل کی طرف تو بالکل اندھیرا ہے۔۔۔۔اف کیسا ذلیل بال ہے۔۔۔۔''اس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سنہری ہینڈل والا شیشہ تھا اور دوسرا ہاتھ جس میں موچنا تھا بار بار جھٹکے سے اوپر اٹھتا نظر آ رہا تھا۔

عین اسی وقت کمرے میں سیاہ فام اور تنومند ''لسبھ'' نے جھانکا جو ہوسٹل میں صفائی کرتی تھی۔

میری جان چھوٹ گئی۔۔۔۔۔۔''لسبھ میڈم کا شیشہ پکڑو آ کر'' میں نے کہا۔

وہ فوراً لپک کر آئی۔ ویسے بھی اس کا دل اسی کمرے میں زیادہ اٹکا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ رؤفہ کا کھلا ہوا سیاہ زمین پر بڑے بڑے اورنج پھولوں والا لباس کسی نہ کسی طرح چڑھائے ہوئے تھی۔ وہ بڑے غور سے اور دلچسپی سے رؤفہ کو بنتے سنورتے دیکھا کرتی تھی۔ جہاں رؤفہ کی نگاہ چوک جاتی وہاں لسبھ کی باریک بیں نظر فوراً تاڑ لیتی۔ ''باجی اے وال رہ گیا جے'' وہ رؤفہ کو موچنے کی زد سے بچ جانے والے بال کی

طرف فوراً توجہ دلا دیتی۔

رؤفہ بھی اسے دل کھول کر ٹپ دیتی تھی۔ اس کے پرانے کپڑے جو قریب قریب نئے ہوتے تھے' رنگ برنگے سینڈل' بچی کچھی لپ سٹکیں۔ تقریباً سوکھی ہوئی نیل پالش اور اختتام کو پہنچی ہوئی آئی برو پنسلیں۔۔۔ سب کی حقدار وہی ٹھہرتی۔ اس لیے وہ رؤفہ کے کمرے کے کچھ زیادہ ہی پھیرے لگاتی۔

چھٹی والے دن رؤفہ اس سے مالش کرواتی تھی۔ مالش کے دوران اس کے بدن پر دو انگل جانگئے کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ جونہی لسبجھ باتھ روم سے اولوآئیل کا سبز ٹن لیے نکلتی' میں کوئی کتاب اٹھا کر باہر لان کی طرف نکل جاتی۔ تقریباً پون گھنٹے بعد لسبجھ کسی ٹاکی سے ہاتھ پونچھتی باہر نکلتی دکھائی دیتی تو میں واپس کمرے میں جاتی۔

ورکنگ ویمن ہوسٹل میں کچھ عرصے سے میں اور رؤفہ ایک ہی کمرے میں تھیں۔ میری تقرری اسلام آباد کے ایک لڑکیوں کے کالج میں بطور انگلش کی لیکچرر کے ہوئی تھی۔ لاہور سے آنے کے بعد کچھ دن مجبوراً مجھے اپنی ایک رشتے کی خالہ کے گھر رہنا پڑا۔ جو اس کنبے پر بوجھ ہونے کے ساتھ میری عزت نفس پر بھی بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ ایسے میں ایک دن کتابوں کی ایک دوکان سے نکلتے ہوئے ایک لڑکی کی چال اور ہئیت نے میری توجہ کھینچ لی۔ وہ میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ اس کے سنہری بال سیاہ لباس کے ساتھ بڑا دلکش کنٹراسٹ پیدا کر رہے تھے۔ چال میں بڑی جارحانہ قسم کی بے باکی تھی۔ میں نے سوچا پیچھے سے تو بڑی شے ہیں دیکھوں سامنے سے کیا ہے۔ میں نے قدم ذرا تیز کیے اور برابر پہنچنے کے بعد کنکھیوں سے دیکھا۔۔ رؤفہ۔

ہم دونوں یونیورسٹی میں ساتھ تھیں۔

''میں دیکھ رہی تھی کہ یہ کون ٹین ایجر لومب شیل جا رہی ہے۔''

اس نے خوش ہو کر زور سے قہقہہ لگایا۔ ہم دونوں اپنی عمر کی تیسری دہائی کے آخری حصے میں تھیں۔ وہ تین سال ہوئے طلاق لے چکی تھی اور میری کچھ جذباتی حادثات کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکی تھی۔ ہم دونوں نے فاسٹ فوڈ کی ایک دوکان میں کوفی پیتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنے اپنے حالات سنا دیے تھے۔ میری مشکل سن کر رؤفہ نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں رہنے کی پیش کش کر دی جو میں نے اس شرط پر قبول کر لی کہ جونہی کوئی کمرہ مل گیا میں شفٹ کر لوں گی۔ لیکن اس کی اس فراخ دلی نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ میرے ادبی رجحان اور سنجیدہ طبیعت کی وجہ سے وہ مجھ پر جذباتی اور نفسیاتی انحصار کرنے لگی اور ایک طرح سے مجھے مشیر کا سا درجہ دے دیا تھا۔ اپنی ہر بات وہ مجھے بتانے لگی اور میں اس کی بہت سی باتوں کو خلاف طبع سمجھنے کے باوجود اختلاف نہ کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ اس نے مجھے اپنے کمرے میں جگہ

دے رکھی تھی۔

میرے سامنے روٗفہ کھلی کتاب تھی۔محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً! وہ کمرے میں عموماً نیم برہنہ گھومتی رہتی۔اپنے جسم اور چہرے پر وہ اس قدر محنت کرتی تھی کہ بعض اوقات کوفت کے ساتھ ساتھ مجھے ترس آنے لگتا۔جب وہ گھنٹوں تیاری کے بعد مجھ سے پوچھتی ''کیسی لگ رہی ہوں'' تو میں شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر 'اے ون' کا اشارہ دکھاتی لیکن دل ہی دل میں سوچتی کہ پتہ نہیں کیوں بجائے کم سن اور حسین نظر آنے کے یہ محض ایک کرخت صورت فلم ایکٹرس نظر آ رہی ہے۔لیکن میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور تھی اور وہ اس تعریف پر ذرا بھی شبہ نہ کرتی اور آئینے میں ہر رخ اور ہر زاویے سے خود کو خوش ہو کر دیکھتی اور اکثر اپنے پسندیدہ جملے دہراتی۔

''ہم جو ہیں نا ہم۔۔۔ ہماری عمر کی عورتیں۔۔۔۔ کیا بات ہے ہماری۔۔۔۔ کیا مقابلہ کر سکتی ہیں ہمارا یہ کل کی ٹین ایجر پھلتریاں۔ یہ کالجوں سے نکلی ہوئی چھنکیاں۔۔۔۔ ہماری میچوریٹی۔۔۔ ہمارا کمپوژر (Composure)۔۔۔ وی آر دی کوئینز مائی ڈیر۔۔۔۔ وی آر دی کوئنز۔۔۔ اور تمہیں بتا دوں۔ یہ مرد اور ینگ لڑکے ہماری عمر کی عورتوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ دے آر جسٹ فیسی نیٹڈ!۔۔۔ ہماری عمر کی جو عورتیں ہوتی ہیں نا۔۔۔۔ کیا چیز ہیں ہمارے سامنے یہ چوزیاں یہ بچونگڑیاں۔۔۔۔ ہاہ!''

''بچونگڑیاں' واقعی روٗفہ کے سامنے کیا چیز ہوں گی۔ کیونکہ اس سلسلے میں جو ہوم ورک' روٗفہ کا تھا وہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

اس کے کمرے میں منتقل ہونے کے اگلے روز ہی مجھ پر یہ بات عیاں ہوگئی۔ پہلی صبح ہی میری آنکھ عجیب عجیب آوازوں کے ساتھ کھل گئی۔۔۔ سرسراہٹ اور تیز تیز سانسوں کی آواز۔۔۔ ابھی پوری طرح روشنی نہیں پھیلی تھی۔ تقریباً اندھیرا تھا۔ اس دھند لکے میں مجھے کمرے میں کوئی چیز تیزی سے اوپر نیچے ہلتی دکھائی دی۔۔۔۔ غور سے دیکھا تو روٗفہ ڈمبل اٹھائے اٹھک بیٹھک کر رہی تھی۔ اس نے سیاہ لیوٹارڈ پہن رکھا تھا۔ کھڑکی سے آتی ہوئی ہلکی روشنی میں اس کا سفید جسم دمک رہا تھا۔ مجھے سر اٹھائے دیکھ کر اس نے بدستور حرکت کرتے پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان پوچھا۔

''کیسا ہے میرا فگر'' کھڑکی کی بیک گراؤنڈ میں اس کے جسم کے خطوط ترشے ہوئے نظر آ رہے تھے۔'' بالکل مری کی سڑک'' میں نے اپنی دانست میں خاصا بھونڈا اور عامیانہ سا فقرہ کہا۔ لیکن وہ بہت خوش ہوئی۔ اس نے ڈمبل زمین پر رکھ دیے اور اپنے کولہوں پر ہاتھ پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔''دیکھ لینا۔ تم ایک دن بہت کامیاب ادیبہ بنو گی۔۔۔۔۔۔ دیکھ لینا۔ دس از مائی پریڈکشن۔''

رؤفہ کی زندگی میں کئی مرد آئے اور اس نے ہر دفعہ بڑے خلوص سے محبت کی۔ وہ ''افیئر برائے افیئر'' کی قائل نہ تھی۔ عشق و محبت اس کے نزدیک نہایت اعلیٰ وارفع چیز تھی جس میں افلاطونی اور جسمانی محبت کا ایک خوبصورت توازن اور آہنگ ضروری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر محبت صرف جسمانی ہو تو یہ محبت نہیں بلکہ نری حیوانیت ہوتی ہے۔ بقول اسکے کتے اور انسان میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے اور اگر صرف افلاطونی ہو تو ---پھر مرد بہت جلد گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔

لہٰذا وہ دونوں برابر گھول کر پلا دیتی تھی۔ اگر کوئی تب بھی بھاگ جاتا تو وہ دل میں کوئی کینہ نہ رکھتی۔ بلکہ جانے والے کو ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد رکھتی تھی۔

آج وہ کسی سے ملنے جا رہی تھی۔ لڑکا تازہ تازہ یونیورسٹی سے نکلا تھا اور عمر میں اس سے کافی چھوٹا تھا۔ لیکن رؤفہ کا خیال تھا کہ وہ اسے اپنی ہم عمر سمجھتا ہے۔ رؤفہ نے ہنستے ہوئے بتایا کہ بڑا چالاک ہے۔ کسی انٹرنیشنل ایجنسی میں نوکری دلانے کے بہانے آئڈنٹٹی کارڈ مانگ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ٹالا۔ رؤفہ کا خیال تھا کہ سالے نے سارا چکر صحیح عمر جاننے کے لیے چلایا۔

صبح سے بلکہ منہ اندھیرے سے وہ تیاریوں میں لگی تھی۔ بلکہ میرے حسابوں وہ تیاریوں کے اذیت ناک مراحل سے گزر رہی تھی۔ آخر وہ خود بھی بول اٹھی۔

''اف کس قدر مصیبتیں سہی ہیں ہم نے ان کے لیے۔۔ کتنی تکلیف اٹھاتی ہیں ---اب بتاؤ یہ تھریڈنگ ٹورچر نہیں تو کیا ہے'' وہ اپنی پیشانی پر تھریڈنگ کرتے ہوئے بولی ''پھر ویکسنگ ---- فیشل اور بلیک ہیڈ ریموونگ ---- ہیئر ڈریسنگ مینی کیور پیڈی کیور---- واٹ ٹورچرز------ بٹ واٹ پلیورز! ---- یہ تھینک لیس مرد تو سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ ------ خود تو بس شیو کرلیا۔ نہا لیا' زیادہ سے زیادہ آفٹر شیو یا ڈیوڈرنٹ لگالیا --- ہاؤ ان فیئر ------ لیکن خیر کیا ہو سکتا ہے --- ادھر آؤ نا--- ذرا ڈریس چننے میں تو مدد کر دو--- ڈارک بلیو بہت پیارا ہے' لیکن فرنٹ اوپننگ ہے۔ تو یہ پہلی ڈیٹ میں میں کبھی رسک نہ لوں۔ -- یہ ریڈ ٹھیک ہو گا--- تمہارا کیا خیال ہے' وہ کوئی گڑبڑ تو نہیں کرے گا میرے ساتھ؟ ----'' اس کے اس کبھی کبھار کے بھول پن کے پوز سے مجھے سخت کوفت ہوتی تھی۔ اسی لیے میں نے جل کر کہا۔

''میرے خیال میں تو تم خود اس کے ساتھ گڑبڑ کر دو گی۔''

''ہاہا--- تھوڑی بہت گڑبڑ تو جائز بھی ہے' ورنہ پھر کیا مزا--- لیکن تھوڑی بہت--- تیسری ڈیٹ سے پہلے نو ہینکی پینکی ---'' اس نے ہنس کر شانوں سے گاؤن گراتے ہوئے کہا۔ میں نے منہ

کے سامنے اخبار کرلیا۔اس کے باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔اسی وقت الزبتھ عرف "لسبتھ" دروازے میں نمودار ہوئی۔اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پلاسٹک کی تھیلی تھی۔وہ سیدھی باتھ روم کی طرف چلی۔

"یہ کیا ہے؟"

"برف اے باجی لئی"

"برف باتھ روم میں؟"

"باجی ہوری سیکا کردے نیں۔"

"سیکا!برف کا؟کہاں۔۔۔کتھے؟"

"خورے"اس نے اپنے پلے پلائے شانے اچکائے اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

"لئو باجی اپنی چیج"اس نے کہا۔دروازہ تھوڑا سا کھلا اور رؤفہ نے تھیلی وصول کر لی اور لسبتھ رؤفہ کے دیے ہوئے بسنتی امبریلا کٹ لباس میں اپنا وافر بدن جھلاتی کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا اور رؤفہ سیاہ لیس کے انڈر گارمنٹس میں نمودار ہوئی۔میں نے حسب دستور کتاب پر نظریں گاڑ لیں۔تھوڑی دیر تک کمرے میں کپڑوں کی سرسراہٹ کی آوازیں آتی رہیں۔پھر سپرے کی آواز آئی اور کمرہ تیز خوشبو سے بھر گیا۔۔۔۔۔۔"کنسیلر کدھر مر گیا"اس کی تیز آواز آئی۔

اس پمپل ذلیل کو بھی آج ہی نکلنا تھا"وہ ڈریسنگ ٹیبل پر لگی ہوئی بوتلوں'شیشیوں'ڈبیوں' برشوں'رولرز'پفوں کی ڈھیری میں کنسیلر ڈھونڈ رہی تھی۔کمرے کی ہوا طرح طرح کی بوؤں اور خوشبوؤں کی وجہ سے کثیف ہو رہی تھی۔پہلے ویکس کی بو حاوی تھی'پھر کوسمیٹکس اور آخر میں پرفیوم کی تیز بو۔۔۔۔سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔جوں جوں دن چڑھ رہا تھا گرمی بڑھ رہی تھی۔مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔میں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے رؤفہ کو دیکھا۔رنگوں کا جھماکا سا ہوا۔۔۔۔۔چیختے ہوئے سرخ رنگ کا لباس۔۔۔۔ بلونڈ بال۔۔۔۔لہو رنگ ہونٹ۔۔۔۔آتشی گلابی رخسار۔۔۔۔۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟"اس نے آئینے میں چہرہ گھماتے ہوئے پوچھا۔

"غضب!"میں نے منہ پر کتاب رکھے رکھے کہا۔

شام کو میں اپنی ایک کولیگ کے گھر پارٹی پر مدعو تھی۔آٹھ بجے وہاں سے فارغ ہو کر میں مارکیٹ چلی گئی۔ضرورت کی کچھ چیزیں لیں۔نو بجے کے قریب واپس پہنچی تو کمرہ خالی تھا۔"عیش کر رہی ہے"میں نے سوچا۔کوئی سوا دس بجے کے قریب دھڑاک سے دروازہ کھلا اور رؤفہ جھومتی گنگناتی داخل ہوئی۔

آتے ہی اس نے اپنا سرخ لیدر کا پرس بستر پر پھینکا اور "اف" اور "ہائے ہائے" کہتی ہوئی پلنگ پر بیٹھ کر سینڈل کھولنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے اور انگلیاں اوپر نیچے نچاتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ سٹاکنگز اتارنے لگی۔

"بڑا حرامزادہ نکلا" اس نے سٹاکنگز کا گولا سا بنا کر سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر پھینکا۔ اس کے ہونٹوں پر بھنچی بھنچی سی مسکراہٹ تھی۔۔۔۔۔

"بڑا کمینہ نکلا۔۔۔ مجھے کہا تھا چائنیز چلیں گے۔۔۔۔ پھر کہنے لگا ابھی تو بہت دیر ہے۔ کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اس کے دوستوں نے کہیں کمرہ لے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو سارے دوست کہیں گئے ہوئے تھے۔ خالی کمرہ تھا۔ میں پہلی ڈیٹ پر ہمیشہ خالی کمرہ اووئڈ کرتی ہوں پر۔۔۔۔ بدتمیز کہیں کا۔۔۔۔۔ ینگ لڑکوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے۔۔۔ دے آر ٹو امپشنٹ۔۔۔۔ اف اتنی بھوک لگ رہی ہے۔۔۔ تم نے تو کھالیا ہوگا۔۔۔۔ ہیں؟"

"کیا مطلب ہے! کھلا کر بھی نہیں بھیجا؟"

"دن کو جو کھایا تھا۔۔۔ بہت شاندار لنچ تھا۔ ہم لوگ "چنگ ہوا" گئے تھے۔۔۔۔ بڑا مزا آیا۔ بائی چانس اس کے تین چار دوست بھی وہیں آ گئے۔ اس نے مجھے سب سے انٹروڈیوس کرایا۔ مجھے بہت اچھا لگا۔۔۔ دے ور یچ سویٹ بوائز۔۔۔ ہم نے دوسزلرز Sizzlers منگائے۔ پورنز اور تھائی سوپ بہت اچھا تھا وہاں کا۔ ڈٹ کر کھایا ساروں نے۔۔۔ آدھی تنخواہ تو نکل گئی میری۔ بٹ اٹ واز ورتھ اٹ۔"

"کیا مطلب؟ تم نے بل دیا!"

"اور کس نے دینا تھا؟ وہ بے چارہ اب اتنوں کو کہاں سے کھلا سکتا تھا۔ مجھے تو اس نے کھلانا تھا ہنڈرڈ پرسنٹ۔ لیکن اتنے سارے دوست جو آ گئے اچانک۔۔۔ وہ کیا کرتا بے چارہ۔ تقریباً سٹوڈنٹ سا ہی تو ہے۔۔۔ اور اس کے دوست سارے۔ کوئی یونیورسٹی میں ہے کوئی اسی سال نکلا ہے۔ ٹھیک ہے جاب کر رہا ہے وہ لیکن پھر بھی اتنا تو نہیں ہے اس کے پاس۔۔۔۔"

"بے چارہ۔۔۔۔ جبکہ تمہاری جاگیروں سے تو ہزاروں پاؤنڈز آ رہے ہیں۔"

"میں نے نہیں کبھی پرواہ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی۔۔۔ کیا فرق پڑتا ہے کہ اس نے کھلایا کہ اس نے کھلایا۔۔۔ دیز آر آل پیٹی میٹرز۔ میں ان باتوں میں اپنا وقت نہیں ضائع کرتی۔۔۔ جہاں پیار ہو وہاں کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے جھٹکے سے کرسی کی پشت سے گاؤن اٹھایا۔

"تمہیں میری بات بری لگی؟"

''اونو۔۔۔۔'' وہ گاؤن کرسی پر پھینک کر دوڑی آئی اور میرے گلے سے لگ گئی۔ ''تم ہی تو میری ایک دوست ہو۔۔۔۔۔'' میرے گلے کے گرد اس کی نرم نرم بانہوں کا لمس اتنا بے ضرر اور معصوم سا لگ رہا تھا کہ کچھ دیر کے لیے مجھے وہ ایسی ننھی سی بچی لگی جو ہجوم میں کہیں بھٹک گئی ہو۔۔۔۔ لیکن اگلے ہی لمحے مجھے خود کو جھنجھوڑ کر یاد دلانا پڑا کہ یہ کوئی ننھی سی معصوم بچی نہیں بلکہ تقریباً سینتیس سال کی جہاندیدہ عورت ہے جو صرف چند گھنٹے پہلے مذہب اور سوسائٹی کی طرف سے عائد کردہ تمام حدود بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ توڑ کر آئی ہے۔۔۔ میں نے غیر محسوس طور سے خود کو چھڑا لیا اور وہ گاؤن سنبھالتی باتھ روم میں چلی گئی۔

ان دنوں پاکستان میں ایک اصطلاح ''نظام مصطفیٰ'' کا بہت چرچا تھا اور اس کے ہاتھوں روفہ بہت نالاں تھی۔ اس کے نزدیک نظام مصطفیٰ کا مطلب کوڑے تھا۔ وہ کمرے میں ٹہل ٹہل کر اس ''وحشی'' نظام کے خلاف بولتی؛ جس کی وجہ سے پاکستان اب کسی صورت کسی مہذب اور تعلیم یافتہ انسان کے رہنے کے قابل نہ رہا تھا۔ لگتا تھا کسی لمحے بھی کوڑے کسی کونے کھدرے سے کڑکتے ہوئے نکلیں گے اور اس کی پشت کی نرم و نازک کھال کو ادھیڑتے ہوئے نکل جائیں گے۔ بلکہ اس نے ایک آدھ بار مجھ سے پوچھا بھی کہ کوڑا کتنی زور سے لگتا ہے میں اسے صحیح طور پر نہیں بتا سکی۔ البتہ میں نے اسے یہ بتا دیا کہ ایک وریئشن سنگسار بھی ہے۔ جس میں پتھر وغیرہ کھانے پڑتے ہیں۔ وہ کافی دیر تک غور کرتی رہی کہ دونوں میں کون سا طریقہ زیادہ ''کمفرٹیبل'' ہے۔ آخر جھنجھلا کر اس گندی سوسائٹی اور اس ملک پر برس پڑی جہاں انسان کو ہر وقت اپنی کھال کی ہی فکر پڑی رہے اور وہ بھی ''انوسنٹ پلیورز'' (Innocent Pleasures) کی خاطر ''نیویارک' ماسکو کہیں بھی پیدا ہو جاتی۔'' وہ حسرت سے کہتی۔ دو ایک ملکوں کی یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے اس نے اپلائی بھی کر دیا تھا۔۔ ''بس ایک دفعہ۔۔۔۔ ایک دفعہ بس نکل جاؤں اس ملک سے پھر خدا کی قسم کبھی رخ نہ کروں ادھر کا۔'' اب وہ بوائے فرینڈ سے ملنے کے بعد ہوسٹل کے گیٹ کے بجائے کمرشل مارکیٹ میں اتر جاتی تھی۔ اس نے بتایا کہ پچھلی دفعہ جب وہ گیٹ پر اتری تو پٹھان چوکیدار نے اتنی عجیب نظروں سے اسے گھورا کہ اسے جھرجھری سی آ گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ کہیں سے جا کر نظام مصطفیٰ والوں کو پکڑ لائے گا۔ مارے ڈر کے اسے آدھی رات تک نیند نہ آئی۔

وہ اس لڑکے ہیجی سے ہفتے میں ایک بار ملتی تھی جو کہ بقول اس کے ''ڈیسنٹ گیپ'' تھا۔ ہر ملاقات کے بعد وہ اس انداز سے اس کے حسن کا تذکرہ کرتی جیسے لولی پوپ چوس رہی ہو۔ اس کی رنگت' اس کے بھورے بال' اس کی [illegible] آنکھیں' اس کا پھرتیلا جسم۔۔۔ میں نے اس سے کہا یہ آدمی کا ذکر ہے کہ بلی کا۔۔۔۔۔ لیکن وہ مصر تھی کہ ہیجی بہت ہی ''مینلی'' (Manly) ہے۔

ایک دن وہ اس سے مل کر آئی تو کچھ چپ چپ سی تھی۔۔۔۔ سوچوں میں گم۔ حالانکہ اپنے ہر رانڈے دو (Rendezvous) کے بعد بڑے جوش کے ساتھ ایک ایک تفصیل بتانا اس کا معمول تھا اور مبالغے کی حد تک بھرپور دلچسپی کے ساتھ سننا اب میری عادت بن چکی تھی۔

''کیا ہوا۔۔۔۔ لڑائی وڑائی ہوگئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اونو۔۔۔ ہم تو اتنے کلوز ہو گئے ہیں۔ اتنے کہ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ اس کا تو یہ حال ہے کہ کہہ رہا تھا کہ میری تو زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ کسی دن رات بھر تمہیں پاس رکھوں۔ پر کمرے میں اس کے دوست سوتے ہیں اور ہوٹلوں میں جاتے ویسے ہی آج کل ڈر لگتا ہے۔ کہہ رہا تھا تمہیں میں اپنی بہن سے ملواؤں گا۔ میرے خیال میں تو وہ پروپوز کرنے کا سوچ رہا ہے۔'' پھر وہ چپ ہوگئی۔

''چپ چپ کیوں ہو'' میں نے پوچھا۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''۔۔۔ آج جب ہم واپس آ رہے تھے تو وہ گاڑی کو پٹرول پمپ میں لے گیا۔ کہنے لگا یہ اچھی بات نہیں کہ کسی کی گاڑی بھی مانگو اور پٹرول بھی اس کا خرچ کرو۔ اف یو ڈونٹ مائنڈ۔۔۔۔ میں نے دو سو کا پٹرول ڈلوا دیا۔ میں بھی ایسی گدھی پہلے پوری ٹینکی بھروانے لگی تھی۔ پھر عقل آ گئی۔۔۔۔''

''شاباش! بہت اچھا کیا۔ اچھی محبوبائیں ایسا ہی کرتی ہیں۔۔۔ میں طنز نہیں کر رہی۔ ایمان سے'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہارے خیال میں۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہوا؟۔۔۔۔''

''تم نے خود کہا تھا جہاں پیار ہو وہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت نہیں ہوتی۔''

''لیکن ابھی بات ختم نہیں ہوئی نا۔۔۔ جب میں مارکیٹ میں گاڑی سے اتر رہی تھی تو اس نے کہا کہ کل اس کے ابا ہوسپٹل سے ڈسچارج ہو رہے ہیں۔ پانچ سو روپوں کی سخت ضرورت ہے۔۔۔ اب تم بتاؤ۔۔۔ میرے پاس کل ہزار روپے تھے۔ آج بائیس تاریخ ہے۔ دو سو کا پٹرول ڈلوا دیا۔ پانچ سو کل اس کو دے دوں۔ خود کیا کروں گی باقی دن۔''

''نہ دو۔''

''اچھا نہیں لگتا۔''

''دے دو۔''

''دے دوں؟۔۔۔ اور خود۔۔۔''

''کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر اس کے پیار کے دوہے گاؤ۔''

''مذاق سے ہٹ کر۔۔۔ دراصل۔۔۔ اب ہوسپٹل کا معاملہ ہے نا۔۔۔ اون ہیومن گراؤنڈز۔

۔۔۔ ویسے میرے اکاؤنٹ میں تو ہیں کچھ پیسے ۔۔۔ اینڈ آئی لو ہم۔۔۔۔''

میں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔

میرا خیال تھا رؤفہ کا یہ ''افیئر'' بھی پہلے قصوں کی طرح چند دن کا کھیل ہے۔ لیکن بقول رؤفہ کے وہ اور بیجی دن بدن اور قریب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اسے روپے اور تحفے دے کر خوش ہوتی تھی' جبکہ وہ رؤفہ سے ہر طرح سے خوش تھا۔ وہ جب بھی اپنے شہر جہلم سے ہو کر آتا رؤفہ کو بتاتا کہ اس کے لیے کتنے رشتے آ رہے ہیں اور اس کی امی اس پر ہاں کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہی ہیں۔ لیکن وہ رؤفہ کی وجہ سے انہیں رد کر رہا ہے۔ اس نے تقریباً رؤفہ کو پروپوز کر دیا تھا۔ بس بہن سے ملوانے کی دیر تھی۔

میں نے ایک آدھ دفعہ اس کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ جب وہ ابھی مشکل سے پینتیس کا ہو گا تو تم پچاس سے بھی اوپر ہو گی' پھر کیا ہو گا۔۔۔ لیکن رؤفہ نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں نے کوئی تیسرے درجے کی احمقانہ بات کہہ دی ہے اور جیسے اسے میری ناتجربہ کاری پر ترس آ رہا ہے۔ اس نے میری بات کے جواب میں ہنس کر صرف اتنا کہنا کافی سمجھا کہ ''تب کا تب دیکھا جائے گا!''

چند دنوں کے بعد پرویز عرف بیجی کی سالگرہ آ رہی تھی اور رؤفہ تحفے کے سلسلے میں مجھ سے مشورے کر رہی تھی۔۔۔ جو کہ بعد میں جھوٹ موٹ کے مشورے ثابت ہوئے۔ میرے مشورے جو کہ کف لنکس' پرفیوم' ٹائی یا شرٹ وغیرہ تھے' سن لینے کے بعد اس نے ذرا سا ہچکچاتے ہوئے بتایا کہ دراصل اس نے تو خود ہی اپنی چیز بتا دی ہے۔ وہ کہتا کہ اس کے سارے دوستوں کے پاس سونے کی چین ہے۔ کاش اسے بھی کوئی دیتا۔ بقول رؤفہ کے صاف طور پر تو اس نے نہیں کہا لیکن اس بات کا کیا مطلب ہو سکتا ہے' وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔

''مطلب یہ ہے کہ پرسوں اس کی سالگرہ پر آپ اس کے گلے میں سونے کی چین پہنائیں۔۔ ۔۔اور ذرا بھاری والی۔ ہلکی سے شاید وہ خوش نہ ہو۔۔ ویسے بھی اس کا دل توڑنا تم افورڈ نہیں کر سکتی' جب کہ چین تم افورڈ کر سکتی ہو۔''

''افورڈ؟ میرے اکاؤنٹ میں تو بالکل تھوڑے سے پیسے ہیں۔۔۔۔ افورڈ! انسٹالمنٹ بھی تو دینا ہے پلاٹ کا۔''

''ایسا کرو پلاٹ کینسل کرا دو۔''

''اف!۔۔۔۔ طنز۔۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں آئی ایم یوزڈ ٹو اٹ۔۔۔۔۔ ویسے میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ ہمارے افیئر کے بعد پہلی برتھ ڈے آ رہی ہے اس کی۔''

''پہلی برتھ ڈے!۔۔۔تمہاری بھی تو آئی تھی پچھلے مہینے۔''

''میں نے نہیں بتایا اس کو۔۔۔خوامخواہ انسان چیپ سا لگتا ہے۔۔۔میں نے ہمیشہ اپنی سیلف ریسپیکٹ کا خیال رکھا ہے۔۔۔اس لیے تو وہ کہتا ہے کہ یو آر دی اونلی گرل جس کی میں عزت کرتا ہوں۔

ویسے ایک بات تو بتاؤ۔۔۔تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔سچ سچ بتانا۔۔۔اب جبکہ وہ پروپوز کرنے والا ہے اور ہمارا شادی کا بھی خیال ہے تو۔۔۔ٹھیک سے رائے دینا۔دیکھو جھوٹ نہیں بولنا۔''

''میرا تو خیال ہے کہ تمہارا یہ پرویز عرف پیجی پکا پاجی ہے اور بھیجا بھی نہیں اس کے سر میں۔''

''بھیجا؟ بھیجے کو چاٹنا ہے؟۔۔۔۔کیا کرنا ہے بھیجے کا۔میرے ایکس ہزبینڈ کا تھا بہت بھیجا۔۔۔۔دیٹ پگ اوف این انٹیلکچوئل (That Pig of an intellectual)۔۔میرے کس کام آیا۔۔۔کم اون کوئی دوسری بات کرو۔''

''اور میرے خیال میں تو وہ۔۔۔وہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہی''

''کیا وہی''

''ژگولو ٹائپ؟''

''ژگولو کیا؟''

''مرد طوائف۔''

''مرد طوائف۔''

''چلو میل پروسٹی چیوٹ کہہ لو۔''

وہ اچھل کر سیدھی بیٹھ گئی۔یوں لگا جیسے وہ بہت کچھ کہے گی۔۔۔۔میں بھی تن کر بیٹھ گئی اور بہت کچھ سننے کو تیار ہو گئی۔لیکن وہ ''یو آر نوٹ فیئر'' کہہ کر باتھ روم چلی گئی۔

جمعہ کو برتھ ڈے تھی۔وہ جمعرات کی صبح سے سخت مصروف تھی۔اسے بنک جانا تھا اور سونے کی چین کے لیے رقم نکلوانی تھی۔شام کو وہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ہم مختلف جیولرز کی دکانوں میں گھومتے رہے۔میں اس کام میں ملوث نہیں ہونا چاہتی تھی لیکن۔۔۔۔آخر ایک مناسب چین نظر آ گئی۔اس کی قیمت اتنی نہ تھی جتنی بھاری وہ نظر آ رہی تھی۔روفہ کو اس کے ساتھ ملنے والی ذرا سی ڈبیہ پسند نہیں آ رہی تھی۔آخر جیولر نے سرخ مخمل کا ایک نفیس اور نسبتاً بڑا سا ڈبہ اندر سے نکال کر دکھایا اور روفہ مطمئن ہو گئی۔وہاں

سے وہ سیدھی سٹیشنری کی دکان پر گفٹ پیپر لینے کے لیے گئی۔ اسے کوئی کاغذ ہی پسند نہیں آ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ گفٹ پیپر میں بھی کوئی بات ہو' کوئی اشارہ ہو۔ آخر چمکیلے سرخ رنگ پر سنہرے دلوں والا ایک کاغذ اس نے چنا اور اوپر سے لگانے کے لیے سنہری سجاوٹی پھول خریدا۔ کمرے میں آ کر اس نے بڑی محنت سے چین کا ڈبہ پیک کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے وسط میں رکھ دیا اور آتے جاتے وہ بار بار اس پیکٹ کو نظروں سے چومتی اور سہلاتی رہی۔ ''کیسی خوبصورت پیکنگ ہوئی ہے۔'' اس نے کئی بار کہا۔

رؤنہ جمعہ کی صبح سے تیاریوں کے مختلف مراحل سے گزر رہی تھی۔ شام کو برتھ ڈے تھی۔ اس نے بیوٹی پارلر جا کر تیار ہونے پر بھی غور کیا لیکن پھر یہ سوچ کر خیال رد کر دیا کہ وہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ کر دیں اور ایسا نہ ہو کہ جو وہ نظر آنا چاہتی تھی ویسی نظر نہ آ سکے۔ لہٰذا صبح سے وہ اپنے حلیے پر خود ہی تجربے کر رہی تھی۔ اس نے اس موقع کے لیے خاص لباس خریدا تھا۔ سیاہ سلک کے لباس کے گلے اور آستینوں پر سیاہ فرانسیسی لیس لگی ہوئی تھی جس پر ننھے ننھے سلور ستارے دمک رہے تھے۔ ہیرے کے سیٹ کے مطابق ڈیزائن کردہ نقلی سیٹ اس کے کانوں اور گلے کے گرد جگمگا رہا تھا۔ سلور میٹلیک پرس کندھے سے لٹکانے کے بعد اس نے پوچھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

''شاندار! گلیمرس'' اس نے خوش ہو کر اپنی سلور پینسل ہیل پر گھوم کر ایک چکر کاٹا۔ ویسے میرے حسابوں پرویز عرف پجی جس کے لیے کپڑے رستے کی رکاوٹ کے علاوہ کیا مفہوم رکھتے ہوں گے' کوئی ایسی شے نہیں تھا جس کے لیے پہلے درجے کی فرانسیسی موڈل نظر آنے کی سعی کی جاتی۔ اس لحاظ سے وہ اوور نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔ قابل رحم حد تک اوور۔

چھٹی والے دنوں میں ہوسٹل میں واپسی کے قواعد میں اتنی سختی نہیں تھی لیکن مجھے جلدی لوٹ آنے کی عادت تھی۔ آج مجھے لاشعوری طور پر رؤنہ کی واپسی کا انتظار تھا۔ شاید کھد بدی لگی تھی کہ سونے کی چین سالگرہ' ستاروں والا لباس۔۔۔۔۔ سب کا کیا بنا۔ سونے کی تیاری کرتے ہوئے میرے کان کوریڈور میں اس کی باریک ہیل کی مخصوص ٹک ٹک پر لگے ہوئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ساڑھے دس سے پہلے نہیں آئے گی۔ لیکن پونے نو بجے کے قریب کوریڈور میں اس کے آنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ ''عیش کرو بھئی عیش کرو'' میں نے سوچا۔ اسی وقت دروازہ چرچرا کر کھلا اور وہ اپنے ستاروں والے لباس' جگمگاتی جیولری اور سلور میٹلک پرس سمیت دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس ایک لمحے میں وہ مجھے ایسی عمارت کی طرح دکھائی دی جسے بلڈوزروں نے تہس نہس کر دیا ہو۔ دروازہ بند کر کے پلٹی تو۔۔۔۔۔ شاید کو سمیٹکس کی تہہ دن بھر میں کہیں ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ یا شاید چہرے کے مساموں نے جذب کر لی تھی۔ گہرے سلیٹی حلقوں کے اوپر اس کی

آنکھیں بے جان تھیں۔ رخسار یوں سوجے ہوئے اور تمتمائے ہوئے تھے جیسے یہ بلش اون کا کرشمہ نہیں بلکہ کسی نے کس کس کر چانٹے مارے ہوں۔

''کیا ہوا؟'' میں بستر پر سیدھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ خاموش رہی اور میری طرف دیکھ کر'' کچھ نہیں'' کے انداز میں یوں سر ہلایا جیسے اس کی زبان بولنے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔ پھر اس نے آہستگی سے اپنا سلور میٹیلک پرس' جس پر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی تقریباً آدھے ماہ کی تنخواہ خرچ آئی تھی' یوں ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دیا جیسے ہر بات کا ذمہ دار وہی تھا۔ کرسی پر سے اپنا گاؤن اٹھا کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ باتھ روم سے چہرے پر پانی کے چھپاکے مارنے کی آوازیں آنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں وہ باہر نکلی تو اس نے گاؤن پہن رکھا تھا اور اپنا سیاہ سلک کا فرانسیسی لیس والا لباس یوں چٹکیوں میں تھام رکھا تھا جیسے بہت سے مرے ہوئے چوہوں کو دموں سے لٹکا رکھا ہے۔ پھر کھلی ہوئی الماری میں اسے یوں پھینک دیا جیسے کوڑے کے ڈرم کے حوالے کر رہی ہو۔ پھر وہ کمرے کے وسط میں آ کر کرسی کے سہارے بت کی طرح کھڑی ہو گئی اور میکانکی انداز سے چھوٹے سے گلابی تولیے سے چہرے کو تھپتھپانے لگی۔

''خدا کے لیے کچھ بولو روؤ ف! لاش کی طرح تو نہ کھڑی رہو۔''

اس نے تولیہ کرسی پر پھینکا اور آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کھوئے کھوئے انداز میں اس نے اپنے سلور سینڈل اتارے اور اپنی پنڈلیوں پر سے پھولدار سیاہ لیس کے سٹوکنگز آہستہ آہستہ رول کرتے ہوئے بولی۔

''اتنی انسلٹ ہوئی میری۔۔۔ اتنی بے عزتی۔۔۔'' اس کا گلا رندھ گیا اور سسکیاں دبانے کے لیے اس نے اپنا چہرہ کہنی کے خم میں چھپا لیا۔

''گینگ ریپ'' بم کی طرح یہ لفظ پھٹا اور دھماکے سے ہر چیز اڑ گئی۔۔۔ کم بخت لڑکی۔۔۔۔۔ بد بخت لڑکی۔۔۔ آخر تو یہ ہونا ہی تھا ایک دن۔۔۔۔۔ اس نے ٹشو پیپر سے ناک صاف کی۔ آنکھوں کو تھپتھپایا۔ کھانس کر گلا صاف کیا۔ پھر جب وہ بولی تو وہ اس کی نورمل آواز تھی۔

''آج جب ہم۔۔۔ شام تک تو ہم دونوں کمرے میں اکیلے تھے۔۔۔ پھر کوئی پانچ بجے اس کے دوست آ گئے۔ چاروں۔۔۔ ایک نے کیک کا ڈبہ اٹھایا ہوا تھا۔۔۔ ایک پاؤنڈ کا تھا بھرا ہوا کریم سے۔۔۔ پلیٹ تک تو تھی نہیں۔ نیچے دری بچھا کر ڈبہ بیچ میں رکھ دیا۔ پھر چھری نہیں مل رہی تھی۔ پھر ایک چمچ مل گئی' اس کی ڈنڈی سے کیک کاٹا جانا تھا۔ پھر موم بتی نہ ملے' آخر مل گئی ایک گندی سی۔ ٹین کے ڈھکنے پر چپکی ہوئی۔۔۔ خیر کیک کاٹا اس نے۔۔۔ سب نے خوب شور مچایا' ہیپی برتھ ڈے کا۔ اس نے کیک کا ٹکڑا توڑ کر زبردستی میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ وچ آئی ڈڈنٹ لائک (Which I Didn't like) ٹشو پیپر سے منہ

پونچھا پڑا۔ پھر میں نے چین کا ڈبہ نکالا۔ وچ سیمڈ ٹو کوز کوئیٹ اے سینسیشن ۔۔۔۔۔انھوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ کہنے لگے خود پہنائیں۔ میں نے اس کے گلے میں چین پہنادی۔ جب میں پہنارہی تھی تو اس نے میری رسٹ پر کس کردیا۔ پھر سب کیک کھانے لگے۔ میں نے چمچے کی ڈنڈی سے سب کو پیس کرکر کے دیے۔۔۔۔ میری انگلیاں کریم سے لتھڑ گئیں۔ میں دھونے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی ۔۔۔ نلکا چلایا۔۔۔شاید ان کا خیال ہوگا کہ نلکے کے شور میں آواز نہیں آئے گی۔ اس کا ایک دوست بولا'' بڑی زور دار چین ماری ہے یار'' پھر پتہ نہیں کسی نے کیا کہا' وہ مجھے سمجھ نہیں آیا۔ ہاتھوں پر ہاتھ مار کے ہنسنے کی آواز آئی۔ پھر اس ذلیل پیجی کی آواز آئی۔ اس کا خیال تھا باتھ روم تک آواز نہیں پہنچے گی۔ لیکن پہنچ گئی۔ وہ بولا '' آنٹیوں کا یہی تو ایک فائدہ ہے۔'' پھر سب کمینوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ پھر ایک اور سئور کی آواز آئی'' ویسے یار! آنٹی ہے بڑی ٹیٹ'' ۔۔۔ٹائٹ کوئیٹ کہہ رہا تھا ذلیل ۔۔۔۔۔پھر سارے ہنسنے لگے۔۔۔ میرے تو جیسے کسی نے منہ پر چپیڑیں ماردیں۔۔۔۔۔خواہ مخواہ ہاتھ دھوتی رہی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا باہر کیسے نکلوں۔ ایسے ہی دو دفعہ فلش بھی چلا دیا۔ حالانکہ تمہیں پتہ ہے میں کبھی مردوں کی موجودگی میں ٹوئلٹ یوز نہیں کرتی۔ لیکن اس وقت کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں زندگی میں کبھی اتنی امبیر اسڈ (Embarrassed) نہیں ہوئی۔۔۔۔ کیا اس دن کے لیے میں نے کافکا ژید اور کامیو پڑھے تھے کہ ڈھائی پیسے کے یہ چھوکرے جو فائدہ کو فیدہ اور ٹائٹ کو ٹیٹ کہتے ہیں' دو ذلیل لفظوں میں مجھے سم اپ کردیں۔۔۔۔۔''

لیکن میری پیاری رؤفہ! میں نے بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے سوچا تم نے اس ہٹ کی لسبجھ سے مالشیں اور ڈمبل تو اسی دن کے لیے اٹھائے تھے۔۔اور ہاں۔۔برف کے سیکے۔۔۔۔

'' ذلیل' کمینہ' سئور۔۔۔۔۔نفرت ہوگئی ہے مجھے اس کی کتے جیسی شکل سے ۔۔۔لالچی ۔۔۔۔فیدہ کا بچہ۔''

'' اچھا ہوا جلدی کھل گیا۔۔۔۔ورنہ پتہ نہیں کب تک بیوقوف بناتا رہتا۔''

'' لیکن۔۔۔۔۔لیکن میرا دل چاہتا ہے اسے بھی پتہ چلے کہ وہ ایکسپوز ہوگیا ہے۔۔۔ جانتا نہیں وہ مجھے۔۔۔اب میری باری ہے۔۔۔ میرا بھی نام رؤفہ ہے۔''

'' کیا کروگی؟ میں تو کہتی ہوں شکر کرو۔۔۔۔ ورنہ قسم خدا کی میں نے تو سمجھا تھا خدانخواستہ گینگ ریپ وغیرہ۔۔۔۔۔''

'' گینگ ریپ شیپ کی تو خیر ہے۔۔۔وہ تو انسان ہینڈل کرلیتا ہے۔۔۔ میں تو اب اس ذلیل کا منہ توڑنا چاہتی ہوں۔۔۔۔ میں نے سوچا ہے اب کل جب اس کا فون آئے آفس میں تو میں کہوں گی

تمہاری آنٹی بول رہی ہوں۔۔۔کیا خیال ہے؟ چپیڑ پڑ جائے گی سئور کے منہ پر۔۔۔''

بلب کی مدھم زردی روشنی میں اس کا چہرہ پھیکی پھیکی بے نام سی رنگت اختیار کر گیا تھا اور آنکھوں کے نیچے گہرے سلیٹی حلقے اس کے چہرے کو قبر کی طرح بھیانک بنا رہے تھے۔ روکھے روکھے نیلے ہونٹوں کے گوشوں میں سفید کف کا شائبہ سا تھا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا اور ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

''۔۔۔یا پھر ایسے کرتی ہوں۔۔۔۔خدا کے لیے اس مصیبت کو تو بند کرو۔۔۔میری جان نکل رہی ہے۔۔۔۔۔اور ایک طریقہ ہے اس سئور کو ذلیل کرنے کا۔۔۔مجھ سے شرٹ مانگ رہا ہے ۔۔۔۔۔وائٹ گراؤنڈ پر پنک دھاریوں والی۔۔۔اب تو میں پہنا کر چھوڑوں گی وائٹ گراؤنڈ پر پنک دھاریاں ذلیل کو۔۔۔۔کل ہی چل کر شرٹ خریدتی ہوں۔ گفٹ پیکنگ کروں گی اور اندر کارڈ رکھ دوں گی'' آنٹی کی طرف سے۔۔۔۔'' اور پھر کبھی حرامزادے کی شکل نہیں دیکھوں گی۔''

وہ اضطراب میں کبھی مٹھیاں بند کر رہی تھی کبھی کھول رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی درمیان والی انگلی کا ناخن ٹوٹا ہوا تھا۔ ایسا شاذ ہوتا تھا۔ وہ تو ناخن ٹوٹنے کے ساتھ ہی کسی گم یا سکوچ ٹیپ سے جوڑ لیا کرتی تھی۔

''تمہارا ناخن؟۔۔۔۔

''ہاں۔۔۔۔گر گیا کہیں شاید۔۔۔۔پان تو پھینکوں ذلیل کا۔''

وہ جھٹکے سے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا سلور میٹیلک پرس کھول کر سنہری پتے میں لپٹا ہوا پان نکالا۔۔۔۔''تھوکتی ہوں اس کے ذلیل پان پر۔۔۔پان ہی رہ گئے ہیں میرے لیے'' کہتی ہوئی کونے میں رکھی ہوئی پلاسٹک کی ٹوکری کے پاس گئی اور پوری طاقت کے ساتھ پان کو ٹوکری میں پھینک دیا۔

''اب سو جاؤ'' میں نے سوئچ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سو جاؤں گی۔۔۔۔سونا ہی ہے اب'' وہ بستر پر چت گر گئی اور چھت کو گھورنے لگی۔ کمرے میں اندھیرا تھا لیکن کھڑکی میں سے سڑک کے کھمبے کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ کسی لمحے سڑک سے گزرنے والی کسی کار کی بتیاں چھت اور دیواروں پر روشنی کا جادوئی سا کھیل رچا کر گزر جاتیں اور دیوار پر لگے ہوئے کلاک کا کوئی کونہ یا ڈریسنگ ٹیبل کا شیشہ کچھ دیر کو چمک اٹھتا۔

رؤفہ کے بستر سے بار بار ناک صاف کرنے اور لمبے لمبے سانسوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اندھیرے میں اس کی بیٹھی ہوئی پھٹی پھٹی سی آواز ابھری۔

''وہ ذلیل آدمی۔۔۔۔ذلیل سارے ہی ہیں۔۔۔۔۔سارے مرد پکے سئور ہیں۔۔ ۔۔۔لیکن وہ ایگزسٹینشلسٹ کی اولاد۔۔۔۔لبرل کا جنا۔۔۔۔بڑا لبرل بنا پھرتا تھا۔۔۔ڈیٹ بوزنگ

سوڈو مائزنگ سوائین۔۔۔۔۔مڈل کلاس مورلیٹی ۔۔۔۔سکروبلو۔۔۔۔۔کتنی حقارت تھی اس کے دل میں۔۔۔۔سب کے لیے ایک ہی لفظ تھا اس کے پاس "" میڈیو کریٹی" ۔۔۔۔ہی کڈ نوٹ سٹینڈ میڈیو کریٹی(He could not stand mediocrity)اور جب۔۔۔۔جب میری ذرا سی بات پتہ چل گئی۔۔۔تو۔۔۔۔تو ہی ری ایکٹڈ لائک آ لوئر مڈل کلاس پرچون والا۔۔۔۔دیٹ باسٹرڈ اوف دی تھرڈ ڈگری۔۔۔۔میں نے پوری کوشش کی تھی۔۔۔۔پوری کوشش۔۔۔۔۔۔اچھی ہاؤس وائف بننے کی۔۔۔۔اور کیسی ہوتی ہے اچھی ہاؤس وائف۔۔۔۔آئی ککڈ۔۔۔۔آئی واشڈ ڈشز۔۔۔۔شٹ۔۔۔۔۔"

صبح ڈائننگ ہال میں ناشتہ کرنے کے بعد ہم اپنے اپنے کاغذات اور بیگ وغیرہ لینے واپس کمرے میں آئیں۔ میں بیگ کندھے پر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تو وہ بولی۔

"پانچ منٹ ہوں گے تمہارے پاس۔۔۔۔میں نے کوئی بات کرنی ہے۔"

ہم دونوں اپنے اپنے بستر پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

" میں رات بہت دیر تک سوچتی رہی۔۔ رات بھی کیا چیز بنائی ہے اللہ نے۔۔۔اف دیئر از ریئلی ون۔۔۔میں نے بہت سارے فیکٹس جمع کیے ہیں۔۔۔فیکٹس۔۔۔یس۔۔۔فیکٹس۔۔۔یہ فیکٹ ہے کہ آئی ایم اولموسٹ تھرٹی ایٹ(Almost Thirty eight) یہ فیکٹ ہے کہ وہ مجھ سے چھوٹا ہے۔۔کافی چھوٹا۔۔۔۔یہ فیکٹ ہے کہ اگر کل والے اپی سوڈ(Episode) کو نکال دیا جائے تو اوروائز ہماری ریلیشن شپ پرفیکٹ ہے۔۔۔اینڈ موسٹ سیٹس فائنگ ٹو۔۔۔۔یہ فیکٹ ہے کہ اگر آج ہمارا افیئر ختم ہو جاتا ہے تو اسے دس لڑکیاں مل جائیں گی۔۔۔لیکن میں۔۔۔میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔۔۔"

"وہ تمہارا ناخن؟۔۔۔۔۔" مجھے اس کے پلنگ کی پٹی کے عین نیچے سلور پینٹ کیا ہوا نیم چاند کی شکل کا اس کا ناخن چمکتا ہوا نظر آ گیا۔

"اووف! شکر ہے ۔۔۔۔۔ مجھے تو رات سے اس کا غم لگا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔تھینک گاڈ۔۔۔ذرا اٹھانا۔۔۔۔شکر ہے! آئی ایم سو ہیپی۔۔۔۔۔۔"

واجدہ تبسم

روزی کا سوال

''اری او خصم کی رنڈی۔ وہ میرے پاس آ رہا تھا۔'' بھرے بھرے بدن والی بولی۔
''اری چل ری چل بھاڑ کھاؤنی' وہ میرے پاس آ رہا تھا۔''
''ہاں ہاں وہ تیرا باپ تھا نا اسی واسطے تیرے کو گود میں سلانے آ رہا تھا۔''
''اور نئیں تو وہ تیرا بچہ تھا نا تیری مانڈی پر لپٹ کر تیرا دودھ پینے آ رہا تھا۔''
ذرا ٹھہر تو چھنال گھوڑی تیرا منہ پیٹ نوچ ڈالی تو میرے کو بولنا پھر۔''
اور ان شاندار ڈائیلاگ کے ساتھ وہ چھینا جھپٹی ہوئی کہ اشرف کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ایک کے بال دوسری کے ہاتھ میں تھے تو دوسری کے بلاؤز کے چیتھڑے پہلی والی کے ہاتھ میں جھول رہے تھے۔
پہلی والی ہانپ کر بولی۔ ''ٹھہر ذرا اسی سے پوچھ لے کہ وہ کس کے کنے آ رہا تھا''
دوسری لپک کر اشرف کے پاس آئی اور اس کا کالر پکڑ کر بولی۔
''بولو صائب! تم کس کے پاس جانے والے تھے؟ میرے نا؟ یا اس کٹنی دو ٹکے کی چھنال کے؟''

اس کے انداز اس قدر جارحانہ تھے کہ اشرف جو آگے ہی باؤلا سا ہو رہا تھا۔ بالکل ہی ٹپٹا گیا۔
جی۔ جی۔ وہ۔ میں۔''
''ارے جی جی میں میں کیا لگا رہے جی۔ بکری کے بچے جیسی' میرا نام شالو ہے۔ وہ حرام کی جنی کتیا کی اولاد چنی ہے۔ بولو شالو کے واسطے آئے تھے یا چنی کے؟''
اشرف نے واقعی بکری کے میمنے کی طرح معصوم نگاہوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ زبان ساتھ چھوڑ گئی۔
''ابے بولتا ہے کہ دیوں ایک رپاٹا''
شالو نے اشرف کو ایک طرف اتنی آسانی سے جھلا دیا کہ لمبا چوڑا مرد ہوتے بھی وہ ڈر کے دبک

سا گیا۔ یقیناً اس کے اندازے کے مطابق شالو ہی زیادہ طاقت ور اور قابض قسم کی تھی۔ اس لیے اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ دھیرے سے شالو کا نام لے دے۔

''جی میں دراصل آیا تو آپ ہی سے ملنے کے لیے تھا۔''

''ملنے کے لیے؟'' شالو ایک حقارت آمیز قہقہہ لگا کر بولی۔ ملنے کے لیے؟ ارے صائب! ملنے کے لیے تو ماں بہنوں سے جاتے ہیں' ہم کیا تم کو اپنی ماں بہن لگتے ہیں؟''

''جی جی دراصل میں ایک تجرباتی فلم لکھنا چاہتا تھا۔''

''مطلب۔؟'' شالو نے بہت کچھ سمجھ لینے کے انداز میں سر ہلایا۔'' مطلب تم ایکسٹرا بھرتی کروانے کو آئے ہوں گے نا۔''

ایکسٹرا؟ اشرف گڑبڑا کر بولا۔ پھر ایک دم اس کے دماغ میں ایک بلب سا جلا۔ ایکسٹرا۔ وہ پہلی بار ذرا سا مسکرایا۔

''جی نہیں! آپ غلط سمجھیں۔ میں ایکسٹرا بھرتی کروانے نہیں آیا۔ میں تو دراصل کہانی لکھنے والا ہوں اور کہانی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔''

شالو ذرا مایوسی سے بڑے ذلیل کرنے والے انداز سے بولی۔'' تو یوں کہو نا صائب کہ تمہاری گاڑی میں پٹرول نہیں ہے۔''

اشرف نے سر موڑ کر باہر گلی کی طرف دیکھا جہاں یقیناً اس کی گاڑی کھڑی نہیں تھی اس لیے کہ اب تک وہ اتنا خوش نصیب نہیں تھا کہ گاڑی خرید پاتا وہ بولا۔

''دیکھیے شالو بی بی! میرے پاس گاڑی تو ہے ہی نہیں اس لیے پٹرول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

شالو چلا کر بولی۔

''اے او صائب' گاڑی میں پٹرول کا مطلب تُمیں معلوم ارے جو مرد ڈھیلا رہتا ہے نا اس کے واسطے ہماری بول چال میں ایسا ہی بولتے کہ گاڑی میں پٹرول نہیں تو آیا کیا کرنے۔ سمجھے کہ تُمیں او کہانیاں لکھنے والے صائب!''

اشرف کا پورا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔

اگر کوئی برابری کا مرد یہ طعنہ دیتا تو ایسا کرارا ہاتھ دیتا کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے مگر اس چھوکری کے وہ کیا منہ لگتا۔

چنی موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھا کر دور جا کھڑی ہوئی اور شالو کو انگوٹھا دکھا کر بولی۔

"لے ٹھینگا۔ اب اتراتی رہ کہ وہ میرے واسطے آیا تھا۔ ایسے پھوٹے ڈھول تو ہی سنبھال میں تو چلی۔"

"چلی کہاں ہے کتے کی جنی۔ میرے گراہک کو پھوٹا ڈھول بولتی۔"

"پھر کیا؟" چنی کا حوصلہ اس وقت بڑھا ہوا تھا وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

"سو بار بولوں گی پھوٹا ڈھول پھوٹا ڈھول پھوٹا ڈھول۔ اب بول کیا کرتی ہے میرا۔"

"پھوٹا ڈھول دکھ رہا تھا تو تو نے اس کو دیکھ کر اشارہ کیوں کری تھی؟"

"اشارہ میں نے کری تھی؟ اری چھنال تو نے ہی ساڑھی کا پلو سینے پر سے گرائی تھی۔"

"سینے پر سے پلو میں نے گرائی تھی؟ اری جل ککڑی! میرا سینہ ہی نو دا تا تنا ہوا ہے کہ پلو گر گر جاتا' تیرے جیسا سپاٹ مرغی کا کھڑا نہ میرا سینہ نہیں ہے سمجھی۔"

"ہاں ہاں سب معلوم ہے یہ تیرے جیسا ربر کے کپ اوپر سے کر کر کے میں نئی رکھتی۔"

"کیا بولی ڈکر کی بچی۔ میں ربر رکھتی چولی میں گھسیڑ کے لے دیکھ ادھر دیکھ۔" اور اس نے جھر رکر کے اپنا بلاؤز پھاڑ کے رکھ دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اشرف کی نگاہیں اٹھ گئیں اور اسے ایسا لگا جیسے اس کی ٹنکی پٹرول سے فل ہو اور فی گھنٹہ ڈیڑھ سو میل کی رفتار سے اس کی گاڑی اڑی چلی جا رہی ہو۔

کانوں میں شائیں شائیں کرتے انجن کو اس نے بڑی مشکل سے روکا اور منہ پھیر کر بولا۔

"شالو بی بی! آپ خواہ مخواہ جھگڑے کھڑے کرتی ہیں۔"

باریک ساڑھی کا پلو ایک تناکے سے اپنے کھلے سینے پر ڈال کر وہ اشرف کے عین چہرے کے پاس آ کر چلائی۔

"بی بی۔ بی بی' بی بی' ہوئی تیری ماں' تیری بہن! تیری ہوتی سوتی میرے کو ایسی گالیاں مت دے بڑا آیا کہانیاں لکھنے والا۔ چل نکل یہاں سے' کہانیاں قلم سے کاغذ پر لکھے جاتے۔ یہاں ہمارے جسموں پر مردوں کی انگلیاں چلتے' ایسی کوئی کہانی لکھنے کا ہے تو لکھ' نئیں تو اپنا راستہ ناپ وہ ادھر ہیں سیڑھیاں جدھر سے چڑھا تھا۔"

"میں بھی سالا کدھر آ کر پھنس گیا۔" اشراف نے خود کو سنایا۔ "ریڈ لائٹ ایریا۔" پر کہانی لکھنے کا آئیڈیا پتہ نہیں کس منحوس گھڑی سے آیا تھا کہ لاکھ کی عزت خاک ہوئی جا رہی تھی نہ اب تک کوئی پلاٹ ہاتھ لگا تھا نہ کوئی خاص معلومات ہی مل سکی تھی۔ لے دے کے چند گالیاں ضرور نئی نئی معلوم ہو گئی تھیں لیکن اب اس

کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس جنجال سے نکلے تو کیسے؟ دونوں شیرنیوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے تنی کھڑی تھیں۔

پرلے کمرے سے آواز آئی۔ بے حد کراری۔

''ارے چنی! وہ تیرا گاہک پیچھے بازو سے کب سے آ کر بیٹھا ہے' دودھ والا بھیا! کیا کر رہی ہے وہاں۔''

شالو حقارت سے چنی کی طرف دیکھ کر بولی۔

اری او بھینس! جا اپنا دودھ دوہا لے! آ گیا تیرا بھیا''

چنی کچھ فخر سے بولی۔ ''اب بول نا کہ وہ بھی تیرا ہی گراہک ہے۔''

اب کی بار شالو خلاف توقع بے حد جھلاہٹ سے بولی۔

''وہ تو تیرا بندھا ہوا گراہک ہے میرے کو معلوم نہیں کیا؟ مگر جب کوئی نوا گراہکی کے واسطے آتا اور جھپٹ لیتی تو پھر کیوں تیری بوٹیاں نہیں نوچوں؟''

اتنے میں وہ کراری آواز والی محترمہ کمرے میں تشریف لا چکی تھیں۔ منہ بھر کے پان' دانت سیتا پھل کے بیجوں کی طرح سیاہ' سر میں بے حد چپڑ چپڑ تیل' کان میں ادھ جلی سگریٹ اٹکا ہوا۔ بے حد گہرے رنگ کی لال لپ سٹک جوان کے سیاہ چہرے پر سخت کنٹراسٹ پیدا کر رہی تھی بڑے بڑے چھاپے والی ساڑھی میل بھرے زیوروں سے لدی۔

''صائب بائی جی سلام کرو۔'' چنی نے اشرف کو تہذیب سکھائی۔

ابھی اشرف سلام کر بھی نہ پایا تھا کہ شالو ایک نظر اشرف اور ایک نظر چنی کو ذرا حقارت سے دیکھ کر بولی۔

''ان لوگوں کو کہاں اتنی انگریجی آئے' کتی بار سمجھائی کہ ممی بولا کر۔''

اشرف نے بوکھلا کر شالو کو دیکھا جو بے حد لاپروائی سے کہہ رہی تھی۔

''ادھر پوری چال میں بس میرے کو انگریجی آتی ہے صائب! معلوم ہے کیوں؟ ایک بار میں پھلم میں کام کرنے کے واسطے گئی تھی اس واسطے۔''

اچھا؟ اشرف کو دل ہی دل میں ہنسی آئی۔ لیکن وہ یہ ہنسی ہونٹوں پر لا کر اس جھگڑالو عورت سے الجھنا نہیں چاہتا تھا وہ بولا۔

''پھر کیا ہوا؟ وہ فلم ریلیز ہوئی یا نہیں' آپ کی۔'' ''نہیں صائب وہ پھلم میری غلطی سے ریلیج

نہیں ہوسکی۔"

"وجہ کوئی؟"

"وہ وجہ یہ ہوگئی تھی۔" وہ ہاتھ ہلا کر بتانے لگی" کہ پہلے ہی دن ہم چار پانچ چھوکری لوگ کو ایک ایکسٹرا سپلائی کرنے والا ادھر اسٹوڈیو میں لے گیا' وہ پھلم جو بناتا ہے اس آدمی کو کیا بولتے صائب؟" وہ شاید بھول گئی تھی' اشرف نے یاد دلایا!"

"ڈائریکٹر۔"

لفظ کچھ مشکل تھا' شالو کے پلے نہیں پڑا' ہاتھ کو جھٹک کر بولی۔

"ہوئیگا کوئی بھی ڈکلر کا سگا' میرے کو کیا؟ ہاں تو معاملہ کائے سے پلٹ ہوگیا۔ معلوم؟ وہ پھلم بنانے والا میرے کو سکھایا کہ اب تم نے ایک ڈیالوگ بولنا۔۔۔۔۔"

"ڈیالوگ؟" اشرف ہڑبڑایا' دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا اچھا اچھا ڈائیلاگ۔"

"دیکھو صائب! میں پہلے ہی بول دی کہ ادھر بس اتکلی کو میرے کو انگریجی آتی ہے۔ تم بات پوری سنو بیچ بیچ میں ٹوکومت۔ ایسے سے قصہ سناتے میں بہت ڈسٹرب ہوتا۔"

"ٹھیک ہے معاف کر دیجیے' میں آگے سے چپ چاپ سنوں گا۔"

"تو تم گلے کی اولاد ہے کیا' منہ میں زبان نئیں کیا جو چپ چاپ سنوں گا۔ مکا معلوم کس کو بولتے' جس کو بات کرنا نئیں آتا۔ میرے کو ایسے لوگ بھڑبھس لگتے کہ میں تو چپڑ چپڑ باتیں سناؤں اور خود خالی بیٹھ کر سن رئے۔ تم بات کرو ضرور' مگر کب؟ جب تمہارے کو کوئی انگریجی بات سمجھ میں نہ آئے۔"

"جی درست فرمایا" اشرف بظاہر سنجیدہ بن کر بولا۔

"تو پھلم بنانے والا میرے کو بولا کہ اب تم یہ ڈیالوگ بولنا' اگر تم نے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی۔" اب جو ولن تھا نا۔ ولن سمجھتے ہو کہ نئیں تم؟"

"جی ہاں' جی ہاں' سمجھتا ہوں وہ ولن جو ہوتا ہے۔"

"خاک پڑے تمہاری عقل پر' لے کے بول دیا۔ وہی جو ولن ہوتا ہے۔ ارے ولن وہ جو ہمیشہ پھلم کی چھوکری کی عزت خراب کرتا۔"

"جی ہاں' میں بالکل سمجھ گیا۔ آپ بات پوری کیجیے گا۔"

"تو ولن جو تھا نا' اس نے میرے کو لال لال آنکھوں سے گھورا۔ تو میں خوب تیزی سے دوڑی' ایسا بولتے ہوئے کہ" اگر تو نے میری طرف دیکھا تو میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گی۔" مگر شاید میرے آنکھ پھوڑنے

میں کچھ کسر رہ گئی ہوئیں گی۔ کیونکہ اس کا دیدہ برابر سے میرے ہاتھ میں نہیں آیا' بس ذرا سی کمی رہ گئی۔ سب لوگ بجائے واہ واہ کرنے کے ولن کی طرف دوڑے کیونکہ وہ ہائے ہائے کر کے وہیں لمبا لمبا لیٹ گیا تھا اور آنکھ کے آزو بازو سے اور گال پر سے اور گال پر سے کچھ خون بھی نکل رہا تھا۔"

اشرف نے اپنا گال سہلایا اور دھیرے دھیرے سر ہلا کر بولا۔

جی ہاں' دراصل وہ فلم ڈائریکٹر آپ کے فن کو پرکھ نہ پایا ورنہ فلم ہٹ ہو جاتی۔"

"ارے نہیں جی صائب! پھر میں اس چکر میں پڑی ہی نہیں' معلوم کیوں؟"

"جی نہیں اشرف مسمی سی صورت بنا کر بولا۔ وہ اس واسطے کہ میرے کو جلدی ہی معلوم پڑ گیا کہ جو دھندہ یہاں شرافت سے کوٹھری میں بیٹھ کر ہوتا وہی سب ایکٹر الڑکیوں کے ساتھ بے شرمی سے باہر ہوتا تو تم ہی بتاؤ صائب! یہ شرافت کا دھندہ یہاں اچھا کہ کھلے میں سب کے سامنے؟ اصل سوال تو روپے کا ہے وہ یہاں بھی ملتا صائب ہے کیا مت؟"

پتہ نہیں بائی جی کب چنی کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھری کے پچھواڑے چلی گئی تھیں کہ اب شالو کی باتوں سے ذرا مہلت پائی تو اشرف نے دیکھا کہ چنی ساڑھی برابر کرتی' بلاوز کے ہک لگاتی پھر سے کوٹھری میں وارد ہو چکی تھی۔ کچھ فاتحانہ انداز سے وہ شالو سے بولی۔

"تو تو یونہی ٹہل کٹوری میں لگی رہی' میں نے تو ایک گراہک بھی نمٹا دی۔"

کتا دے کر گیا؟ شالو بڑی خوشی سے بولی"

"وہ تو روز کا بندھا ہوا ہے تین روپے۔"

شالو کے چہرے پر دکھ کا ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جسے اشرف نے بڑی حیرت سے دیکھا۔

ایک بار۔۔۔؟ وہ اپنے مخصوص چھپے ڈھکے لہجے میں پوچھنے لگی جو اشرف کے پلے نہ پڑا۔

"پھر اور کتی بار۔۔۔ اصل میں دیوالی' عید دونوں قریب ہے نا؟ دیکھ بھیڑ کتی ہے۔ جلدی جلدی گاہک آتے ہیں تو نپٹانا بھی جلدی ہی پڑتا ہے نا۔"

دونوں ہنسنے لگیں۔ اشرف کی سمجھ میں ان کی لڑائی آئی تھی نہ ہنسی۔

اس نے بیچ میں کئی بار اٹھنا چاہا لیکن پتہ نہیں کیوں' اس کی فنکارانہ حس کہہ رہی تھی کہ کچھ دیر اور بیٹھا تو کچھ نہ کچھ مال مسالہ تو لے کر ہی اٹھے گا اسی لیے وہ کراہت سی محسوس کرنے کے باوجود ایسے کثیف ماحول میں اپنے آپ کو بٹھائے جا رہا تھا۔

قید خانے کی سی سلاخوں والی کوٹھری کے اندر سے اچانک شالو اور چنی کی نظریں باہر جا پڑیں۔

جہاں ایک شرمائی شرمائی صورت والا نوجوان کچھ کر گزرنے کی ہمت نہ پا سکنے کی جھجک کے مابین کھڑا اندر جھانکے جا رہا تھا۔

ایک دم شالو چلائی

''اے دیکھ تو نے حرامی پن کری تو' دیکھ وہ میرے کو ہی دیکھ رہا ہے اس نے اپنے پھٹے ہوئے بلاو زر سے دانستہ ساڑھی ہٹا دی۔

''بھئی یہ حرکت آپ بار بار نہ کریں۔'' اشرف گڑبڑا کر بولا۔

اس کی بات سنی ان سنی کر کے شالو چنی سے بولی۔

''دیکھ بول دی میں نے یہ گراہک میرا ہے۔ وہ سید ھا میرے کو ہی دیکھ رہا ہے۔''

''اری چل ری۔ تیرے میں کیا دم ہے بس زبان ہی چلتی ہے تیری تو' اور گراہک کو پھنسانے کے واسطے کچھ اور بھی چلانا پڑتا ہے۔''

''حرام کی جنی' ایک ایک رات میں بارہ بارہ کو بھگتا کے بیٹھی ہوں' میرے کو سمجھتی کیا ہے؟''

اور کچھ نہیں تو اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے ٹیرے کو تو پچھی کے دیسی کمر دکھتی تیری۔''

اری چھنال۔ پچھی کے دیسی کمر پر تو مرد کی جان جاتی' تیرے جیسی زہر کی پٹاری نہیں ہوں میں کہ مرد بازو سے اٹھے تو آتنگ دھونے کو سیدھا موری میں بھاگے۔''

ابھی چنی کچھ جواب نہ دے پائی تھی کہ پھر بائی جی وارد ہو گئیں ان کے ایک ہاتھ میں بھیل پوڑی کی ایک میلی سی رکابی تھی جس میں سے وہ پھنکے لگاتی جا رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ اپنی کتھے چونے سے لتھڑی انگلی سے ہری مرچوں کی چٹنی بھی چاٹتی جا رہی تھیں۔

''دیکھ شالو' انہوں نے اسے غیرت دلائی۔ ''چنی نے میرے کو آٹھ آنے بھیل پوڑی کے واسطے کمیشن سے ہٹ کر دی تو تو کمینی ہے کنجوسڑی' کچھ نہیں دیتی۔''

شالو نے صرف غصے سے دیکھا' کہا کچھ نہیں۔

''اور ہولی پر ساڑھی بھی دی تھی اور عید پر کان کے بھی۔۔۔۔''

شالو پھر سے باہر جھانکتے اس شرمیلے مرد کو گھیرنے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔ بائی جی نے اشرف کو ذرا غور سے اور زیادہ غصہ سے دیکھا اور غصہ کے اظہار کے طور پر زیادہ چٹنی کھا کر بولیں۔

اب کیا ہے؟''

''اب؟ جی۔ جی۔'' وہ بوکھلا کر بولا' جی جب بھی کچھ نہیں تھا۔''

''وہ تو میرے کومعلوم ہے جی کہ جب بھی کچھ نہیں تھا اسی لیے تو پوچھ رہی ہوں کہ اب کیا ہے؟''

اچانک اشرف کو احساس ہوا کہ اس نے واقعی اب تک سخت حماقت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ڈھلتی شام کے اس بزنس کے سمے میں وہ ان لڑکیوں کا سخت مالی نقصان کر رہا تھا۔ اگر وہ کسی غلط ارادے سے نہیں بھی آیا تھا تو کم از کم اسے اتنا تو کہہ دینا ہی چاہیے تھے کہ وہ کچھ نہ کرے۔ بہر حال پیسے ضرور دے گا تا کہ ان لڑکیوں اور بائی جی کو کوئی اعتراض اور مالی تکلیف نہ ہو۔

وہ سخت کش مکش کا شکار تھا کہ اس قسم کی گندے سودے بازی کے لیے کون سے الفاظ استعمال کرے۔ بہر حال ہمت کر کے بولا۔

''جی آپ کو روپیہ بھی توقع سے زیادہ ہی دے جاؤں گا۔''

بائی جی زہر خند ہنسی کے ساتھ بولیں۔

''کیا خالی باتوں کے پچاس روپے دے جائیں گے؟ یہاں تو بیٹھنے والے بھی پچیس نہیں دیتے۔''

وہ تو بڑی تکلیف سے بولا۔ ''جی میں ایک دو گھنٹہ اور بیٹھوں گا اور سو روپے دے کر جاؤں گا۔''

ایک دم ایک طرف سے شالو اور دوسری طرف سے چنی اس سے آ کر لپٹ گئیں۔

صائب! تم یہ روپے کس کو دیں گے؟''

صائب! یہ روپے تم میرے کو دیں گے نا؟''

''صائب پہلے بچی بولو' تم نے میرے کو دیکھ کر مسکرائے تھے نا؟''

''صائب! تم شرما کے بات مت ٹالو تم نے پہلے بچی بولنا میرے کو آنکھ مارے تھے نا؟''

سو روپے کی نوید سن کر بائی جی کے الگ دیدے پھٹ گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا بھیل پوری پہلے ہی چٹ کر چکی تھیں البتہ میلی تام چینی کی رکابی ایک چھناکے سے گری اور یہاں وہاں باریک تام چینی کے ریزے پھیل گئے' ٹین کی رکابی دیر تک کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ گول گول گھومتی اور بجتی رہی۔

اشرف کا اپنا دماغ بھی گول گول گھوم رہا تھا۔

''کس الو کے پٹھے نے تمہیں یہ مشورہ دیا تھا بیٹے کہ طوائفوں پر فلمی کہانی لکھو اور نام کماؤ۔؟''

دونوں کی کھینچا تانی اختتام پر یوں آئی کہ چالاک شالو نے چنی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ باہر کھڑا جو وہ شرمیلا نوجوان تھے ہی اشارہ کر رہا تھا۔ شالو یقیناً زیادہ چتر ی تھی کیونکہ پردے کے پیچھے اپنا سنگھار تازہ کرنے چلی گئی تو وہ اشرف کے کندھے پر جھک کر بولی۔

''وہ چھنال رنڈی اب دفعان ہو گئی اب تم صائب جو چاہو کر لو مگر وہ سو روپے میرے کو دے دیو۔''

اشرف نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

''چنی کہاں چلی گئی؟''

''ارے وہ جب سے جو جھانک رہا تھا نا جس پر ہم دونوں لڑ رہے تھے وہ اس کو لے کر پچھواڑے چلی گئی۔''

تو آپ نے اسے کیوں جانے دیا؟''

''ارے صائب!'' وہ اس سے ذرا دور ہٹ کے اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی ''تمہارے اس کھوپڑے میں کچھ عقل ہے کہ نئیں' وہ بھاڑ کھاؤ اسے کیا دیں گے۔ زیادہ میں زیادہ پانچ روپے۔ بہوت ہوئے دس روپے۔ اسی واسطے تو میں نے چنی کو بول دی کہ وہ آدمی بچی تیرے کو ہی تا نک رہا تھا۔ اب دیکھو وہ ادھر چلی گئی تو تم میرے کو مل گئے' مطلب پورے پچاس روپے میرے''

''پچاس۔'' اشرف حیرت سے بولا'' لیکن میں تو آپ کا وقت خراب کرنے کا پورا سو روپیہ دوں گا۔''

''ہاں صائب! تم تو سو ہی دیں گے مگر وہ کھوسٹ چھنال ممی چالیس روپے لے لیں گی وہ موا بھڑوا دس روپے' پچاس میرے کو بچ جائیں گے۔''

''یہ ممی اور۔۔۔۔'' وہ کچھ رک کر بولا'' بھڑوے کا کیا قصہ ہے مگر۔۔''

''اونہہ وہ بے حد حقارت سے بولی'' صائب تم بھی لبرون کے جاہل ہو۔ ارے یہ بائی جی ہے نا۔ یہ ہم جیسی دس بارہ چھوکریاں رکھتی۔ اس کا اپنا ایک آدمی رہتا' وہ بڈھی بائی جی کہلاتی' وہ ساتھ والا جو گھیر گھار کے تم جیسے شریف کمین مردوں کو لاتا بھڑوا کہلاتا آدھی ہماری کمائی تو یہی دو کھا جاتے۔''

اشرف رک رک کر کچھ حیرت سے بولا۔

''تو آپ لوگ ان صاحب کو بھڑوا ہی کہہ کر پکارتی ہیں؟''

وہ بڑی لاپرواہی سے بولی'' جس کا جو جی چاہے کہہ لے' ہم نے اپنی آسانی اور سہولت کے واسطے نام رکھ لیے ہیں۔ اب جیسے سامنے منہ پر منہ پڑتا تو اس کھوسٹ رانڈ کو ممی بولنا پڑتا۔ پیٹھ پیچھے ہم چھوکریاں اس کو چنڈالنی بولتے۔ وہ بھڑوا جو ہے اس کو کھوتیا بولتے۔ گراہک جب ہم خود پھانستے تو کبوتر پکڑنا بولتے۔ بھڑوا گھیر گھار کر لاتا تو اس کو مرغا پھنسا بولتے۔ رات گزارنے کو ''بیٹھنا'' بھی بولتے۔ اور اپنے

بالکل ہی آپس کی بات ہوتو بولتے ۔ کتنوں کو رات بھر میں مہندی لگا کے چھوڑی ۔۔۔۔''

اشرف گھڑوں پسینے میں نہار ہا تھا مگر شالو بے تکان سنائے جارہی تھی ۔

'' یہ سب ہمارے راز کی باتاں ہیں ۔ سب کو تھوڑی بولتے صائب تم بولے نا صائب کہ تم کہانیاں لکھتے تو اسی لیے بتادی صائب کہ شاید اپنے نصیبوں کی کہانی تم کبھی لکھ دیو صائب یہ انڈیا میں بہت پورٹی ہے تو غریبی بس ۔ پورے آزو باز و میں ایک میرے کو ہی انگریجی آتی صائب! باقی تو سب جاہل ہیں رانڈاں' بس گراہک آیا کہ بستر کے ویسا بچھ گیاں ۔ مگر میں اخبار بھی پڑھتی ہوں صائب مگر اخبار اپنے پیسے سے نہیں پڑھتی' جوؤں کے پیسے سے پڑھتی ہوں ۔۔۔''

'' جوؤں کے؟''

اشرف ہڑبڑا کر بولا ۔

'' ہاں صائب جوؤں کے ۔ صائب! یہ ہماری بھاڑ کھاؤنی ممی ہے نا' یہ نشے میں دھت رہتی ۔ کسی سے پاؤں دبواتی ۔ کسی سے جوؤاں دکھواتی ۔ پاؤں دبوانے والی کو ایک گھنٹہ کا پچاس پیسہ دیتی اور جوؤں نکالنے کا ایک جوں کا پانچ پیسہ ۔ تو صائب! میں ساڑھی کے پلو میں کالا زیرہ باندھ کر رکھ لیتی ۔ صائب کالا زیرہ تم سمجھتے نا ۔ دال سالن میں پڑتا نا وہ ۔ بس اس چھنال کے سر میں بیس پچیس کالے زیرہ کے دانے چھوڑ دیتی میں اور ڈھونڈ کر نکال نکال کر اس کی ہتھیلی میں رکھتی جاتی ۔ اس کو آنکھا سے ذرا کم دکھتا صائب! بس وہ ہتھیلی پر کالی چیز دیکھ کر سمجھتی کہ جوں ہے اور ہر جوں کے پانچ پانچ پیسے دیتی جاتی ۔۔۔۔۔۔''

اب کے اشرف نے ذرا غصے سے اسے دیکھ کر پوچھا ۔

'' مگر آپ ایک بات بتانے کی کوشش کریں گی کہ آخر آپ لوگوں کو پیسے کی اتنی لالچ کیوں ہے؟ جب سے آیا ہوں دیکھ رہا ہوں پہلے تو تم نے مجھ غریب ہی کی وجہ سے چنی سے وہ مارا ماری کی کہ اسے لہولہان کرنا باقی رہ گیا ۔ پھر اپنی داستانیں بھی خود ہی سنا رہی ہیں ۔ اب میرے سو روپے کی بات سن کر چنی کو بھگا دیا' یہ سب کیا ہے؟''

'' روزی کا سوال ہے صائب!'' شالو نے بے حد بے نیازی سے جواب دیا ۔

'' روزی کا سوال تو چنی کے لیے بھی ہے اور آٹھ دس غریب لڑکیوں کے لیے بھی' جنہیں میں نے نہیں دیکھا لیکن جو انہی پنجروں میں کہیں بند ہوں گی ۔''

اس کے اندر کا فنکار جاگ اٹھا تھا اور وہ سچ مچ شالو پر غصہ ہونے لگا تھا ۔

'' صائب حجّو مت بھئی سب اپنی اپنی کھینچ پر رہتیاں ہیں ۔'' وہ ہاتھ ہلا کر بولی ۔

اشرف نے جل کر پوچھا ''اور یہ تو بتایئے کہ آپ نے اب تک کتنی جمع جتھا جوڑ لی ہے؟''

شالو نے ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔ پھر اشرف کے پاس منہ لا کر بولی'

''ڈیڑھ ہزار۔''

اس کا انداز یوں تھا کہ گویا اشرف کا اتنی بڑی رقم کے بارے میں سن کر ہارٹ فیل ہو جائے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بہر حال وہ سب سے بڑا کہانی نویس نہیں تو اتنا حقیر بھی نہ تھا۔ سال کے پندرہ بیس ہزار تو بنا ہی لیتا تھا۔

''اتنا روپیہ یعنی کہ اتنا بہت سارو پیہ جمع کر کے آپ کیا کریں گی؟'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیڑھ ہزار کو اتنے حقیر انداز میں بتائے کہ وہ شرمندہ یا غصہ ہو جائے۔

''اس میں کچھ اور روپیہ جمع کروں گی' اس کے بعد گھر بناؤں گی۔''

''گھر۔۔۔؟'' اشرف حیرت سے بولا۔

''ہاں ہاں گھر۔۔۔ کبھی گھر نہیں دیکھے صائب تم نے؟ چار دیواری کا گھر۔ جو بس اپنا ہو' شادی وادی تو ہم جیسوں سے کون کرنے چلا صائب' اس کی آرزو کرتے بھی نئیں مگر گھر ضرور ہونا چاہیے صائب! کیوں؟ کیوں بولے تو کیا معلوم؟'' اس انداز سوال پر وہ اشرف کو سخت معصوم لگی' وہ کچھ نہیں بولا وہی سنانے لگی۔

''کیوں بولے تو کیا معلوم صائب اس واسطے کہ طوائف کا بڑھاپا بڑی سخت ہوتا کوئی نئیں پوچھتا صائب میں کتے رنڈاں دیکھی سڑک کے کنارے مرتے دے۔ دیکھی صائب۔ بس اس واسطے دل بولتا کہ ایک اپنا چھوٹا سا گھر ہونا۔ اس گھر میں کچھ نئیں کچھ نئیں تو بھی پھولوں کے پودے ضرور لگاؤں گی۔ صائب کیوں بولے تو کیا معلوم صائب۔ اس واسطے کہ اس پنجرے میں رہتے رہتے میں ٹھنڈی ہوا کے واسطے ترس گئی صائب۔''

اشرف کچھ نہیں بولا' کچھ بول ہی نہ سکا۔ اس کی جیبوں میں سب کل ملا کر دو سو روپے نکلے۔ وہ اس نے سب کے سب ملا کر شالو کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اور بھیگی ہوئی آنکھیں لیے اس پنجرے سے باہر نکل آیا۔

تین برس بعد جب اشرف کی پہلی فلم ہٹ ہوئی جو اس نے طوائفوں کے ٹاپک پر لکھی تھی تو اس پر شہرت اور دولت کے دروازے کھل گئے' اسے سب سے پہلے شالو یاد آئی۔

اس کی لمبی سی گاڑی جب اس بدبودار تنگ گلی کے سامنے جا کر رکی تو پنجرے نما کوٹھریوں سے سستے کریم پوڈر اور گہری گہری لپ اسٹک سے سجے کتنے ہی باسی چہرے جھانکنے لگے۔

سب کو نظر انداز کرتا ہوا وہ شالو کی کوٹھری میں چڑھ گیا۔ بائی جی کان میں ٹوٹی بیڑی دبائے، میلی رکابی میں بھیل پوری کے پھنکے لگا رہی تھیں۔ گاڑی کو اپنے گھر کے سامنے رکتا دیکھ کر وہ ذرا ناقابل یقین انداز میں لڑکھڑائی تو تھیں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ وہ کہاں اور ایسی گاڑی کہاں۔ پھر بھیل پوری میں جت گئی تھیں لیکن اب اتنے پورے اور اونچے مرد کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ پوری کی پوری بوکھلا ئیں اور جو اٹھی ہیں تو رکابی مع بھیل پوری کے ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گئی اور کھڑ کھڑ کی آواز کے ساتھ گول گول گھومنے لگی۔

اس شان اور رعب داب کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہ پائیں سب نئے چہرے تھے۔ وہ رک رک کر بولا۔

''وہ۔۔شالو بی بی کہاں ہیں؟''

دو چار لڑکیاں کھسر پھسر کر کے ہنسنے لگیں۔

بائی جی کراری آواز سے بولیں (کراری آواز لجاجت سے اور خوشامد سے بوجھل تھی)

''اُتی پرانی باسی چھوکری کو کیا پوچھنا سرکار۔۔ادھر دیکھو۔۔۔''

وہ سٹ پٹا کر بولا ''جی مجھے ان سے کچھ بات کرنی تھی۔ وہ شالو بی بی اور ان کی ایک ساتھی چنی۔۔۔''

''ارے وہ چنی۔'' بڑھیا نفرت سے بولی ''سڑ گئی رانڈ وہ تو۔''

''جی'' اشرف کا دل دکھ گیا۔ بڑھیا لاپرواہی سے بولی۔ ''ہاں کوئی روگ لگ گیا تھا پورا انگ دانوں پھنسیوں سے بھر گیا تھا۔ کوئی منہ میں پانی ڈالنے کو بھی خالی نہ تھا۔ وہی پاگل رانڈ شالو اس کو لے کر گئی ہسپتال میں داخل کروائی، پوری جمع جتھا اس پر لٹا دی اپنی اس گدھے کی اولاد نے۔''

''جی۔۔۔!'' اشرف کو یقین نہ آیا۔ ''مگر مجھے تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان کی اور چنی کی سخت لڑائی رہتی تھی۔'' وہ بڑی مشکل سے بولا۔

''لڑائی تو ایسی رہتی تھی کہ مرغیوں کی بطخوں کی چڑیلوں کی لڑائی کیا ہوئینگی، جیسی وہ شالو حرام کی جنی اس سے لڑتی تھی مگر وہ چنی بیمار پڑی تو بولی میں اس کا علاج نہیں کراؤں گی تو کون کروائیں گی۔ یہ تو اس کی روزی کا سوال ہے۔ صحت مند رہیں گی تو ہی کوئی اس کے پاس پھٹکے گا نئی تو وہ اپنا پیٹ کیسے پالیں گی۔ ایسا بول کے ہی تو وہ اس کو لے گئی تھی۔''

''آپ کو پتہ ہے وہ اس وقت کون سے ہاسپٹل میں ملیں گی؟''

بڑھیا نے کچھ اچنبھے سے اشرف کو دیکھا جیسے اس کے صحیح الدماغ ہونے میں شک کر رہی ہو، پھر ہاتھ جھٹک کر بولی،

"ارے صاحب جنی کی بیماری اس کو بھی لگ گئی تھی اور اسی بیماری میں وہ چٹ پٹ بھی ہو گئی۔ میں خود ہسپتال گئی نہ اپنی چھوکریوں کو جانے دی۔ ایک آدھ کو اور بھی یہ روگ لگ جاتا تو میری روزی کا کیا ہوتا؟ کیا ہوتا؟؟ بولو؟"

اشرف اس سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

BADAN BAZAR

(Short Selected Stories On Red Light Area In Urdu)

by

QAISARA QURESHI

ہماری (مختصر) دیگر مطبوعات
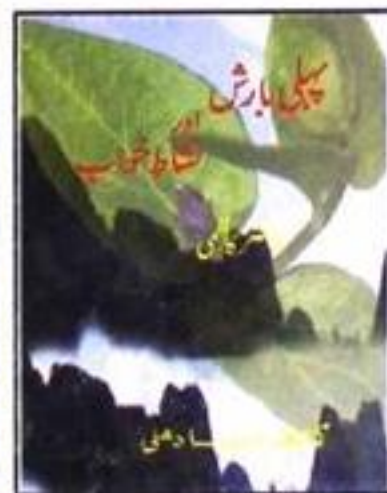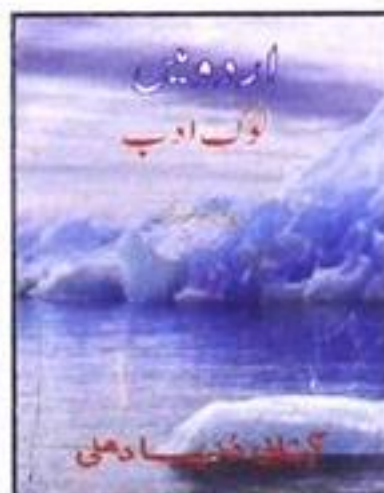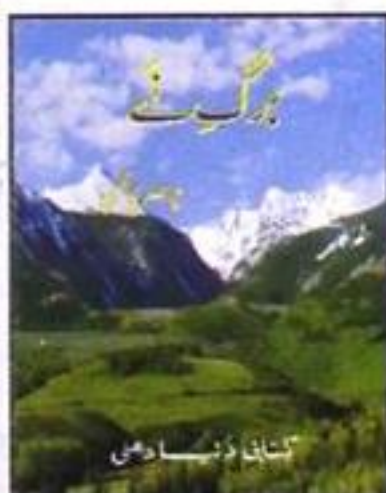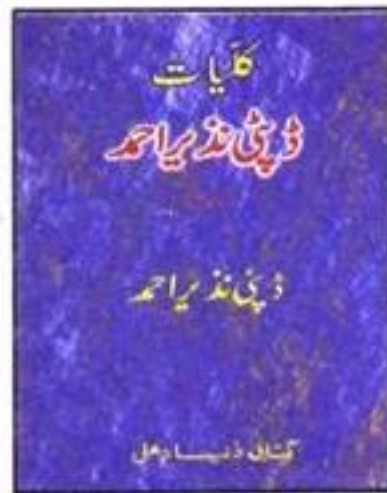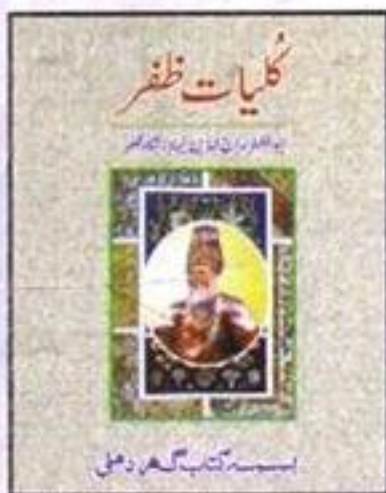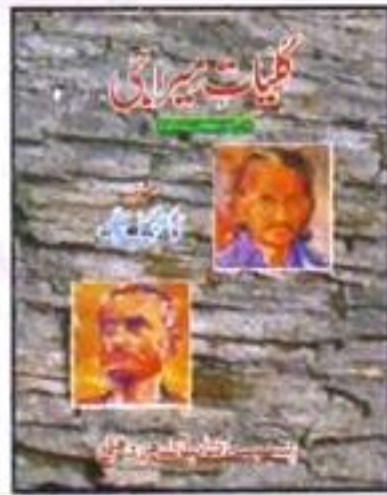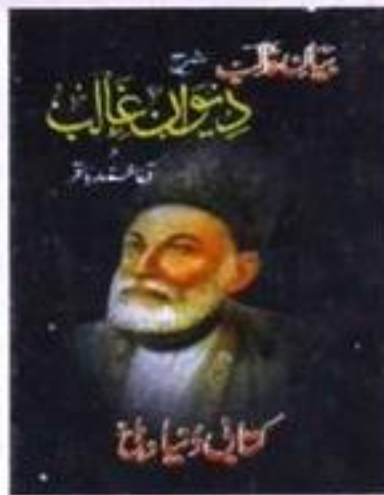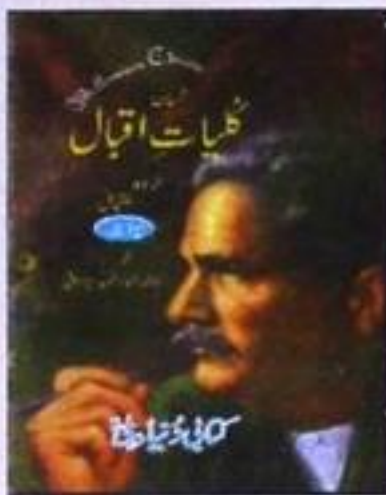
Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi - 6 (INDIA)

E-mail kitabiduniya@rediffmail.com

Ph : 23288452 Mobile : 011-35972589

ISBN- 81-87666-78-1